جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال

اپنا گریباں چاک

(خودنوشت سوانح حیات)

(خودنوشت سوانح حیات)

جسٹس (ریٹائرڈ)
ڈاکٹر جاوید اقبال

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ اُنہوں نے اس کتاب کے مسودے کو بغور پڑھا اور اپنی تجاویز سے مجھے استفادہ کرنے کا موقع دیا۔ اسی طرح خواجہ غفور احمد، جناب تنویر قیصر شاہد، بیگم ناصرہ اور بیٹوں منیب اور ولید کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی آراء سے مجھے نوازا۔ خواجہ غفور احمد نے بڑی محنت کے ساتھ قابل تصحیح غلطیوں کی نشاندہی کی۔

جاوید اقبال

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
جو ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری
تو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

ترتیب

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

پیش لفظ

اردو ادب میں اپنے سوانح حیات خود تحریر کرنے کا رواج نہیں۔ اس لیے ادب کی اس صنف کی طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی۔ ممکن ہے اُس کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہو کہ ہماری تہذیب میں اپنی انا کو دبا کر رکھنا یا مارنا ہمارے نزدیک ایک اہم اخلاقی فریضہ ہے۔ کسی سے ملتے وقت ادب سے جھکنا' سینہ پر ہاتھ رکھنا' ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا' گھٹنا چھونا' پاؤں پکڑنا' غیر ضروری عجز وانکساری کا اظہار کرنا یا خطوں میں اپنے آپ کو فدوی' خاکسار' یا کمترین تحریر کرنا اسی اخلاقی تصور کے مختلف پہلو ہیں۔ اس پس منظر میں خودنوشت سوانح نگاری سے اپنی انا کو اچھالنا یا خودسری کا مظاہرہ کرنا ہی سمجھا جائے گا' جو ایک معیوب بات ہے۔

علامہ اقبال نے خودی کی اہمیت کا ذکر کر کے ایسی غلامانہ ذہنیت کو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اقبالی فلسفہ ہی نہیں بلکہ قدرتی حقیقت ہے کہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے ہر انسان "یکتا" ہے لہٰذا اس ارضی زندگی میں ہر شخص کے تجربات دوسروں سے مختلف ہوں گے۔ اور اگر انہیں خودنوشت سوانح حیات کی صورت میں تحریر کیا جائے تو پڑھنے والوں کے لیے بہر صورت سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ علامہ اقبال اپنے ایک خط میں کسی کو لکھتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو دوسروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ البتہ خیالات کے تدریجی انقلاب کے بارے میں وہ اپنے دل و دماغ کی سرگزشت خود قلمبند کرنا چاہتے تھے جس کی انہیں فرصت نہ ملی۔

ہر شخص اگر اپنے حالات لکھنے بیٹھے تو یہ اس کے دل و دماغ کی سرگزشت ہی ہوگی۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس دل و دماغ ہی تو ہے جسے شعور کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ہر سرگزشت دوسری سے مختلف ہوگی۔ کیونکہ ہر انسان دوسرے سے مختلف ہے۔

اس بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وقت کے قدیم ہونے کے مقابلے میں انسان کی زندگی کی مدت نہایت قلیل ہے۔ اس کی ابتدا تاریکی سے روشنی میں آنے اور اختتام پھر تاریکی میں واپس چلے جانے کا عمل ہے۔ تاریکیوں کے درمیان روشن وقفے کا نام زندگی ہے۔ گویا اس دنیا میں انسان کے وجود کا انحصار آنے اور جانے کے درمیانی وقفہ میں مسلسل عمل اور تگ و دو پر ہے۔ پس وجودِ انسانی کو نہ روح قرار دیا جاسکتا ہے نہ جسم۔ بلکہ یہ تو خدا کے بے شمار افعال میں سے ایک ایسا فعل ہے جس نے انفرادی طور پر شعور حاصل کرلیا۔ اقبال درست فرماتے ہیں ۔

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے' قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبحِ ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اُس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں' نہ روح ہے' نہ بدن!

انسان سے بحیثیت ایک ''باشعور فعل خدا'' یہی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اپنی مختصر زندگی میں ''قطرے سے گہر ہونے تک'' یا ''قطرے سے سمندر میں فنا ہونے تک'' جو بھی اس پر گزرے' بیان کردے تاکہ اُس کی سرگزشت سے جو بھی سبق حاصل کرنا چاہے' کرلے۔

میں عمر میں پاکستان سے بڑا ہوں۔ میرے والد علامہ محمد اقبال' ایک عظیم شاعر' فلسفی اور تصورِ پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا کیونکہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ جوان ہوا تو تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔ یہ میرے لیے پدرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔ زندگی میں اچھا برا اپنا مقام پیدا کیا' تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا' تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں' تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے' میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا۔ یعنی تن آور درخت کے سائے تلے ایک ننھا سا پودہ پروان چڑھتا ہے۔ وہ دراز قد ہو جائے' اپنی صورت نکال لے' تب بھی پودہ ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

دوسری طرف ایسے لوگ بھی موجود ہیں (بلکہ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے) جو مجھے

پہچانتے ہی نہیں۔ یعنی انہیں معلوم ہی نہیں کہ میں کون ہوں۔ مجھے ان پر بہت غصہ آتا ہے اور اس غصے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ خواہ انگلش میڈیم سکولوں کے تعلیم یافتہ ہوں' خواہ علاقائی یا نسلی تعصب کا شکار ہوں' خواہ حالات کو بدستور قائم رکھنے والے پیشہ ور سیاستدان ہوں' خواہ سطحی تعلیم سے آراستہ فوجی افسران ہوں' سب کے سب بانیانِ پاکستان کو فراموش کر چکے ہیں۔

بہرحال میں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ و دو کے اس عالم میں کیا میں اس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا؟ میں کس حد تک کامیاب ہوا اور کس حد تک ناکام؟ فقط یہی میری داستانِ حیات ہے۔

جاوید اقبال
لاہور ۵/ اکتوبر ۲۰۰۲ء

نوٹ: اس ایڈیشن میں خواجہ غفور احمد کی تیز نگاہ کی مدد سے متن کو جس حد تک ممکن ہو سکا اغلاط سے پاک صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز باب ۱۳ (دوسرا خط) کے سوالوں میں چند اہم اضافے کیے ہیں۔ ایک تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ اِدراک نہیں ہے
کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی
اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

جنم پتری

اپنی پیدائش کے عمل کو کوئی دیکھ تو نہیں سکتا۔ اس بارے میں خبر پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ میں کب اور کہاں پیدا ہوا؟ میری معلومات میرے والد کی ایک تحریر پر مبنی ہیں جس سے ظاہر ہے کہ میں ۵-اکتوبر ۱۹۲۴ء کی شب ۹ بجکر ۳۰ منٹ پر سیالکوٹ شہر میں پیدا ہوا۔ اتنی تفصیل کے ساتھ میری تاریخ ولادت تحریر کرنے کی ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میرے والد کے ایک ہندو دوست راجہ سر نریندر ناتھ نے انہیں میری جنم پتری بنوانے کی صلاح دی اور اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں کیونکہ وہ خود بھی جوتش یا ستارہ شناسی کے علم میں دلچسپی رکھتے تھے شاید اسی پس منظر میں میرے والد نے میری ولادت کی تاریخ کے ساتھ صحیح وقت کی تفصیل بھی اُنہیں مہیا کر دی۔ راجہ صاحب نے نہ صرف اپنا تخمینہ لگایا بلکہ اُن کی وساطت سے میری جنم پتری میسور کے ایک معروف منجم (جوتشی) بی۔ آر سرینواسیہ نے ترتیب دی۔ یہ زائچہ ۲۵ مارچ ۱۹۲۸ء کو مکمل ہوا جبکہ میری عمر ساڑھے تین برس تھی۔ میں نے کبھی راجہ صاحب کو دیکھا نہیں۔ شاید وہ میرے ہوش سنبھالنے سے پیشتر وفات پا گئے۔ اُن کا شمار لاہور کے اُن روساء میں ہوتا تھا جو حکومت انگلسیہ کے فرمابردار تھے۔

ستارہ شناسوں کے مطابق جنم پتری دراصل اندازوں اور قیاسوں کا ایسا پلندہ ہوتی ہے جو ستاروں کی حرکات سامنے رکھ کر حساب یا اربعہ لگانے سے تیار کی جاتی ہے۔ بعض اوقات اربعہ درست نکلتا ہے اور بعض اوقات درست نہیں تو درست ہونے کے قریب قریب نکل آتا ہے۔ مگر وہ اپنی پیش گوئیوں کو قطعی طور پر غلط تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً سرینواسیہ کے تحریر کردہ میرے زائچے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے راجہ نریندر ناتھ میرے والد کو لکھتے ہیں: ''مجھے قطعاً تعجب نہ ہوگا کہ اٹھائیس برس گزرنے کے بعد یہ لڑکا انڈیا یا انڈیا سے باہر کسی نہایت اہم محمڈن ریاست کا چیف منسٹر بن جائے۔ نریندر ناتھ ۲- اپریل ۱۹۲۸ء۔'' (تحریر انگریزی میں ہے) اب ملاحظہ کیجئے اخبار دی نیشن بتاریخ ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کی خبر: ''صدر اسحاق نے جسٹس جاوید کو کیئر ٹیکر پرائم منسٹر بنانے کی تجویز رد کر دی۔'' واقعہ یہ تھا کہ ۱۹۹۳ء میں میاں نواز شریف وزیر اعظم

کے استعفے کے موقع پر انہوں نے تجویز دی کہ مجھے نگران وزیراعظم بنا دیا جائے لیکن صدر غلام اسحاق خان نے اس بنا پر یہ تجویز منظور نہ کی کہ میں اُن کے خلاف بیان دیتا رہا ہوں۔ سو میں ہندوستان سے باہر ایک اہم محمڈن ریاست کا وزیراعظم یا چیف منسٹر نہ بن سکا۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ راجہ نریندر ناتھ کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی' کیونکہ انہوں نے تو ایک منجم کی حیثیت سے اس میں صرف ایسا ہو سکنے کا امکان ظاہر کیا تھا۔

بہر حال میں ستارہ شناسی کو ایک فرسودہ علم سمجھتا ہوں۔ منجموں کے حساب کتاب پر مبنی پیش گوئیاں عموماً درست ثابت نہیں ہوتیں۔ البتہ ایک اہم سوال ضرور اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرے والد' انسانی خودی کے استحکام کے داعی اور جبریت کے شدید مخالف ہونے کی حیثیت سے' میری جنم پتری بنوانے پر رضامند کیسے ہو گئے؟ انہوں نے تو فرما رکھا ہے

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

جیسے میں نے عرض کیا' اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے راجہ نریندر ناتھ کو خوش کرنے کی خاطر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ دوسری وجہ شاید یہ ہو کہ اپنے بڑے بیٹے اور میرے سوتیلے بھائی آفتاب سے ان کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ اس لیے ممکن ہے وہ جاننا چاہتے ہوں کہ مستقبل میں کہیں میرا چھوٹا بیٹا بھی بڑے کی طرح نافرمان نہ نکلے اور میری دل آزاری کا باعث بنے۔ بعض اوقات ذاتی محرومیاں ایک خود اعتماد انسان کو ضعیف الاعتقاد بنا دیتی ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا بزرگ زندہ نہیں جو وثوق سے کہہ سکے کہ علامہ اقبال اور اُن کی پہلی بیوی میں علیحدگی کیوں ہوئی۔ اس بارے میں جو کچھ بھی تحریر کیا گیا زیادہ تر قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ اس زوجہ سے اُن کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ معراج بیگم اور بھائی آفتاب۔ معراج بیگم جوانی ہی میں رحلت فرما گئیں اور اپنے دادا دادی کے پہلو میں دفن ہیں۔ بھائی آفتاب کی ولادت ۱۸۹۸ء میں ہوئی اور عمر میں وہ مجھ سے چھبیس برس بڑے تھے۔ باپ بیٹے میں اختلاف کا سبب زوجین کی علیحدگی ہو سکتی ہے' کیونکہ ایسے حالات میں بچے عموماً ماں کا ساتھ دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں انہیں سیالکوٹ میں اپنے تایا کے ساتھ رہنا پڑا اور ان کی سختی برداشت کرنا پڑی۔ بہر حال انہوں نے اپنے ننھیال کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بیرسٹری کرنے کے بعد پہلے پروفیسری اور بعد ازاں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر والد کی زندگی میں ان کے ساتھ تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ ۱۹۵۶ء میں انگلستان سے میری واپسی کے بعد میرے اور میری بہن منیرہ کے ساتھ ان کے مراسم قائم ہوئے۔ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ مگر انہوں نے کراچی میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ اس لیے جب بھی لاہور آتے تو اُن سے ملاقات ہو جایا کرتی۔ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں وفات پائی اور کراچی میں

دفنائے گئے۔ اُن کے تین بیٹوں میں سے ایک فوت ہو چکے ہیں۔ بڑے بیٹے آزاد جدہ میں کسی بڑی فرم کے قانونی مشیر ہیں۔ لاہور آئیں تو مجھے مل کر جاتے ہیں۔

تیسری وجہ جو میرے ذہن میں آتی ہے یہ ہے کہ میرے والد صوفیاء کے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ شیخ احمد سرہندیؒ کو برصغیر میں مسلم نیشنل ازم کا بانیٔ اول سمجھتے تھے۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی بھی کہلاتے ہیں۔ آپ سولہویں صدی عیسوی میں صوفیاء کے سلسلہ نقشبندیہ سے متعلق ایک معروف صوفی بزرگ تھے جنھوں نے مغل شہنشاہ اکبر کے اسلام کش اقدام کی مخالفت کی تھی۔ شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں انہوں نے گوالیار کے قلعہ میں قید کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا مزار مشرقی پنجاب کے شہر سرہند میں واقع ہے۔ میری ولادت سے کچھ ماہ پیشتر میرے والد سرہند تشریف لے گئے۔ شیخ احمدؒ کے مزار پر حاضری دی اور دعا کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اولادِ نرینہ سے نوازا تو اُسے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ جب میں تقریباً دس برس کا ہوا (۲۹ جون ۱۹۳۴ء) تو مجھے ہمراہ لے کر سرہند شیخ احمدؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ وتار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ میرے والد تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اُس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔ گنبد کی تاریک فضا میں اُن کی رندھی ہوئی مدہم آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔ شاید جنم پتری یہ معلوم کرنے کے لیے بنوائی گئی کہ مستقبل میں اُن کا یہ بیٹا اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں کوئی نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے یا نہیں۔

مجھے کبھی کوئی روحانی تجربہ نہیں ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے میری زیادہ وابستگی ادب اور فلسفہ سے رہی ہے۔ ویسے آنسو ہمیشہ میرے خاندان میں ہر کسی کی ناک پر دھرے ہوتے ہیں۔ کوئی ذرا سا جذباتی ماحول پیدا کر دے تو امنڈ آتے ہیں۔ بنیادی طور پر میں مذہبی سے زیادہ ثقافتی مسلمان ہوں۔ مجھے خواب بھی بہت کم آتے ہیں۔ چند بار اپنے والد کو خواب میں دیکھا ہے۔ مدت ہوئی ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں سرہند میں شیخ احمدؒ کے مزار کی دیوار کو ہاتھوں سے تھامے زار وقطار رو رہا ہوں۔ میرے ایک عزیز دوست شیخ بشیر احمد مرحوم تھے جن کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ سے تھا۔ بشیر احمد میرے ولی منشی طاہر الدین کے صاحبزادے تھے جو اپنے والد کی وفات کے بعد دیگر ولیوں کی ایما پر میرے اور منیرہ کے گارڈین مقرر ہوئے۔ آپ نے اپنی بیگم کے ساتھ ہماری نگہداشت کی خاطر کچھ مدت تک ہمارے گھر میں بھی قیام کیا۔ آپ مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر شہریار احمد کے والد تھے۔ انہوں نے اس خواب کی تعبیر کرتے ہوئے بتایا کہ حضرت

صاحب کے مزار کی دیوار کو ہاتھوں سے تھامے آہ وزاری کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ تم پر ان کا روحانی فیض جاری وساری ہے۔ شاید اسی سبب اپنی تمام بشری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود تم عصبیت کے مسلمان ہو۔ مجھے اپنی اسی عصبیت پر یقیناً فخر ہے۔ بلکہ میں تو اپنے سال ولادت یعنی ۱۹۲۴ء کو بھی عالم اسلام کے لیے نہایت اہم سال سمجھتا ہوں۔ اسی سال ترکی میں خلافت یعنی مسلم سیاسی نظام میں مطلق العنانیت کے فرسودہ تصور کا خاتمہ ہوا اور عالم اسلام کے مختلف ملکوں میں قومی ریاست یا ''نیشن سٹیٹ'' کے قیام کے لیے کوششیں شروع ہوئیں۔ برصغیر کے مسلمان بھی دارالحرب' دارالاسلام' جہاد یا ہجرت کے پرانے نظریوں کو خیر باد کہہ کر دنیائے اسلام کے دیگر ملکوں کی طرح مسلم قومی شناخت کی بنیاد پر حقِ خودارادیت کے حصول کے لیے تگ ودو کرنے لگے۔ اسی سال سے ہندی مسلمانوں نے مطالبہ شروع کیا کہ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں ان کی اکثریت کو بروئے کار لایا جائے۔ نیز مسلم اکثریتی صوبوں سرحد اور بلوچستان میں دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں اور مسلم اکثریتی سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ اس تحریک کی ابتدا ۱۹۲۴ء ہی سے ہوئی جس نے بالآخر ۱۹۴۷ء میں مسلم اکثریتی صوبوں کے الحاق کی صورت میں پاکستان قائم کیا۔ پس میں اپنے سالِ ولادت کو احیائے اسلام کی ابتدا کا سال سمجھتا ہوں' جب اندھی تقلید اور تنگ نظری کے بندھنوں سے آزاد ہو کر مذہبی' معاشرتی' سیاسی' اقتصادی اور قانونی سطح پر اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اسلام کی ایک روشن خیال' وسیع النظر' کشادہ دل اور روادار تعبیر نے جنم لیا۔

میرا نام جاوید کیسے رکھا گیا؟ میری ولادت کے وقت میرے دادا شیخ نور محمد زندہ تھے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے جنہیں خواب میں بشارت ہوئی کہ ان کے فرزند محمد اقبال کی اولاد میں سے دو بیٹے اور ایک بیٹی زندہ رہیں گے۔ بعد ازاں خواب ہی کے عالم میں ان کے روبرو کسی نے وہ قرآنی آیت پڑھی جس میں شمس' قمر اور منیرہ کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ اس خواب کی نسبت سے انہوں نے میرے بڑے بھائی کا نام آفتاب رکھا تھا۔ جب میں پیدا ہوا تو میرا نام قمر الاسلام تجویز کیا مگر یہ نام میرے والد کو پسند نہ آیا۔ انہوں نے قمر الاسلام کی بجائے میرا نام جاوید رکھ دیا۔ اس زمانہ میں برصغیر میں جاوید نام مقبول نہ تھا۔ اس لیے ہندو پاکستان میں شاید کوئی بھی جاوید اقبال نامی شخص مجھ سے عمر میں بڑا نہ ہوگا۔ ایک ایرانی خاتون' جنہیں میں مونٹریال (کینیڈا) میں ملا' کا نام جاوید بہ وزن ناہید تھا۔

باب ۲

چند ابتدائی سال

میری والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ انہوں نے ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو بیالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ تب میری عمر گیارہ برس تھی۔ میری چھوٹی بہن منیرہ کی تاریخ ولادت ۳۰ اگست ۱۹۳۰ء ہے۔ ماں کی رحلت کے وقت وہ تقریباً پانچ برس کی تھیں اور انہیں ماں یاد بھی نہیں۔ میری گیارہ سال کی عمر میں سے اگر پانچ برس بچپن کے نکال دیئے جائیں تو میں نے اپنی والدہ کے ساتھ ہوش وحواس کی عمر کے صرف چھ سال ہی گزارے ہیں۔ اسی طرح میرے والد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اکسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے جب میں تقریباً چودہ برس کا اور منیرہ آٹھ برس کی تھیں۔ اس حساب سے میں نے ہوش وحواس کی عمر کے صرف نو برس اور منیرہ نے تین برس باپ کی معیت میں گزارے۔ جب ماں باپ کم عمری میں چل بسیں تو بعد کی زندگی میں کسی بھی عزیز کی موت کا اتنا رنج نہیں ہوتا۔

میری ولادت تو ہمارے سیالکوٹ کے آبائی گھر میں ہوئی۔ لیکن اگر میں اپنی یادداشت کو پیچھے لے جاؤں تو میری نگاہوں میں لاہور کی وہ کوٹھی ابھرتی ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کا بیشتر ابتدائی حصہ گزارا۔ (۱۱۶- میکلوڈ روڈ' جواب محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے) اس زمانہ میں یہ کوٹھی چند ہندو یتیم بچوں کی ملکیت تھی اور میرے والد نے اُن کے ولی سے کرایہ پر لے رکھی تھی۔ کوٹھی کا حدود اربعہ کچھ اس طرح تھا۔ گھر میکلوڈ روڈ سے قدرے پیچھے ہٹ کر بنا تھا۔ اس کی مشرق کی سمت چھوٹا سا قبرستان تھا جس کے ساتھ پارسی سیٹھ سدھوا کے ایکسلسیر ہوٹل کی سہ منزلہ عمارت تھی۔ مغرب کی طرف ڈاکٹر نہال چند کی کوٹھی تھی۔ شمال میں ایک چھوٹے سے گھر میں کوئی ہندو خاندان مقیم تھا۔ دوسرے حصہ میں ایک مسلم بیوہ رہتی تھیں اور تیسرے حصہ میں غریب نومسلموں (جنہیں مصلّی کہتے تھے) کا محلّہ تھا۔ شمال مغرب میں اِس گھر کی حد بندی کے پار دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ تھی۔

کوٹھی کا داخلہ لکڑی کے چھپر کھٹ والے بڑے برآمدے کے ذریعہ تھا جس کی ایک طرف پکے فرش کا دالان تھا جہاں میرے والد سردیوں میں دن کے وقت آرام کرسی پر بیٹھ کر دھوپ سینکا کرتے تھے اور

احباب کے ساتھ ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ برآمدے سے ایک بڑا دروازہ مردانہ گول کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کے پہلو میں غسلخانہ سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو میرے والد کا ذاتی کمرہ تھا۔ آپ سردیوں میں رات کو یہیں سوتے تھے۔ گول کمرے سے ایک دروازہ پچھلے کمرے میں جاتا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کے درمیان میں ہونے کے سبب خاصا تاریک اور ٹھنڈا تھا۔ میرے والد گرمیوں میں دوپہر کو یہیں آرام کیا کرتے۔ پچھلے کمرے کا ایک دروازہ زنان خانے میں کھلتا تھا۔ اِسی طرح بڑے برآمدے اور زنان خانے کے درمیان ایک ڈیوھڑی تھی جس کے ذریعے اندر جایا جاسکتا تھا۔ ایک چھوٹا برآمدہ اندر بھی تھا جس کے بعد ایک وسیع دالان تھا جس میں میری والدہ' بچے اور گھر کی خواتین گرمیوں میں رات کو سوتے تھے۔ دالان کی اونچی دیوار کے پرے دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ تھی۔ دیال سنگھ کالج اس زمانے میں ایک معروف کالج تھا جو تعلیمی معیار کے اعتبار سے گورنمنٹ کالج کا مقابلہ کرتا تھا۔ دالان کی جنوبی سمت باورچی خانہ اور برتن یا کپڑے دھونے کے لیے نلکا نصب تھا۔ باورچی خانہ میں میری والدہ کھانا پکایا کرتی تھیں۔

اندر کے برآمدہ سے رستہ دو بڑی کوٹھریوں میں جاتا تھا جن میں بستر لگے ہوئے تھے اور سردیوں میں انہیں استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اندر کی کوٹھریوں کے ساتھ ایک غسلخانہ تھا اور غسلخانے سے باہر زنانہ بیت الخلا تھا۔ دالان کا پچھلا دروازہ مصلّیوں کے محلے کی جانب کھلتا تھا۔ ان کی بہو بیٹیاں میری والدہ سے قرآن شریف پڑھنے' سینا پرونا سیکھنے یا گھر کا کام کاج کرنے کی خاطر آیا کرتی تھیں۔

کوٹھی کے باہر بڑے برآمدے سے ہٹ کر مشرق کی جانب منشی خانہ' مہمان خانہ' موٹر گیراج اور ملازموں کے کوارٹر تھے۔ منشی خانہ میں میرے والد کے کلارک منشی طاہر الدین بیٹھتے تھے اور سائلوں سے وہی نبٹتے تھے۔ گیراج میں میرے والد کو ہائیکورٹ لے جانے والی ۱۹۲۲ء ماڈل کی ایک فرانسیسی موٹر کار ڈیلاآئے کھڑی ہوتی جسے فیروز نامی ڈرائیور چلاتا تھا۔

زنان خانے میں میری والدہ کی مدد کرنے کے لیے ایک کشمیری خاتون رحمت بھی تھیں جو ان کی شادی کے موقع پر ساتھ آئی تھیں۔ ہم انہیں ''ماں وڈّی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کے علاوہ میری تایازاد بہنیں آپا عنایت اور آپا وسیمہ اور ان کے ایک بھائی مختار ہمارے یہاں اپنی اپنی شادیاں ہونے تک رہے۔ کبھی کبھار میری کوئی نہ کوئی پھوپھی بھی سیالکوٹ' وزیرآباد یا گوجرانوالہ سے لاہور آجاتیں یا میرے تایا شیخ عطا محمد آجاتے اور ہمارے ساتھ چند ہفتے گزارتے۔ میرے والد اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ انگلستان میں انہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کی خاطر اخراجات کا بیشتر حصہ شیخ عطا محمد ہی نے ادا کیا تھا۔ آپ ایک دراز قد' خوش شکل' باریش بزرگ تھے۔ انجینئری کی تعلیم فوج میں سروس کے دوران حاصل کی۔ جوانی میں سوٹ پہنتے اور سر پر لنگی باندھتے تھے۔ ہاتھ میں ہمیشہ چابک ہوتا تھا۔ نہایت غصیلے مزاج کے تھے۔

سیٹھ سدھوا کے ہوٹل میں گورے آ کر ٹھہرتے تھے اور شام کو بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ سیٹھ صاحب کی بیوی بائی جی پیانو بجایا کرتی تھیں اور میری شنید کے مطابق علی بخش کے ذریعہ مجھے بلوا بھیجتیں اور اپنی گود میں بٹھا کر میری انگلیوں سے پیانو بجاتیں۔ دو سال کے بعد انہیں خدا نے اپنا بیٹا عطا کر دیا جس کا نام رستم رکھا گیا (بعدازاں رستم سدھوا ہائیکورٹ لاہور کے جج بنے اور پھر سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اب فوت ہو چکے ہیں)۔

میرے بچپن کے زمانہ میں میرے ہمجولیوں میں جو چند بچے شامل تھے وہ رستم (جنہیں ہم روسی کہا کرتے تھے)' ہندو خاندان کے دو بھائی اوناش اور رپن' مسلم بیوہ کے چھوٹے بیٹے معین (جنہیں ہم مونی کہتے تھے۔ اب فوت ہو چکے ہیں)' ان کے بھتیجے نعیم (نیمو' فوت ہو چکے ہیں) اور مصلّیوں کا بچہ چاگو (چراغ دین) وغیرہ تھے۔ سیٹھ صاحب کے ہوٹل میں ایک خوبصورت انگریز خاتون بھی آ کر ٹھہریں جو گوروں کی میزبانی کرتی تھیں۔ ان کی بیٹی بھی ہم سب کے ساتھ کھیلا کرتیں۔ ہم یا تو سامنے کے احاطے میں کرکٹ کھیلتے یا چھت پر چڑھ کر پتنگیں اڑاتے۔ اُنہی ایام میں ایک دن کرکٹ کا گیند میرے والد کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر اندر جا گرا۔ اس روز سے ہمارے کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ البتہ کبھی کبھار میرے والد چھت پر آ جایا کرتے اور ہمارے ساتھ پتنگ بازی میں شریک ہوتے۔ لیکن عام طور پر جب بھی وہ کوئی پیچ لڑاتے تو ہماری پتنگ ہی کٹتی۔

میرا جنم دن نہیں منایا جاتا تھا لیکن میری ماں اُس روز قربانی کا بکرا ضرور دیتی تھیں اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ بچوں کے پالتو جانور عموماً کتے یا بلیاں ہوتی ہیں۔ لیکن میں جس پالتو جانور سے بے حد مانوس تھا وہ ایک سفید رنگ کی بکری تھی جو ایک لیلے کے طور پر مجھے میری ماں نے تحفہ میں دی تھی۔ میرے والد خود تو کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے لیکن مجھے حکم تھا کہ قربانی کی عید کے روز بکرا ذبح ہوتے وقت موقع پر موجود رہوں۔ "ٹیہو" بیچاری بیمار ہو کر مر گئی اور میں اس کے سوگ میں بہت رویا۔ میری ماں نے بہتیرا کہا کہ اُسی رنگ کا ایک اور لیلا منگوا دیتی ہوں۔ لیکن میں نہ مانا اور اس کے بعد میں نے کبھی کوئی پالتو جانور نہ رکھا۔

باہر کے مہمان خانے میں میرے تایازاد بھائی مختار رہا کرتے یا کبھی کبھار شیخ عطا محمد آ کر وہاں ٹھہرتے۔ ان کے علاوہ' جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اس کمرے میں میرے والد کے جاننے والے بدھ مت کے ایک بھکشو نے کچھ مدت تک قیام کیا۔ ہم انہیں سوامی جی کہتے تھے۔ اسی طرح غالباً ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء میں ایک جرمن جغرافیہ دان' جو میرے والد کے ہائیڈلبرگ کے زمانہ کے دوست تھے' یہاں رہے۔ ان سے میرے والد نے شمال مغربی ہندوستان کے نقشے بنوائے جن میں سبز اور کیسری رنگ کے نقطوں سے مسلم اور

ہندو آبادی کے تناسب کا اظہار کیا گیا تھا۔ یہ نقشے میں نے پانچ یا چھ سال کی عمر میں اپنے گھر میں بکھرے ہوئے دیکھے ہیں۔

یہ طے تو میری والدہ کرتیں کہ گھر میں کیا پکنا ہے۔ لیکن کھانا پکانے کے لیے سودا سلف علی بخش قلعہ گوجر سنگھ کے بازار سے لاتا تھا۔ میری والدہ پردہ کرتی تھیں۔ اس لیے علی بخش کو ماں وڈی کے ذریعہ ہی بتایا جاتا کہ اس نے کیا لانا ہے اور وہ حساب بھی انہیں ہی دیتا۔ بعض اوقات جب علی بخش ماں وڈی کو طنزاً مائی جی کہہ کر بلاتا تو ماں وڈی بہت ناراض ہوتیں اور اس کی خوب گوشمالی کرتیں کہ تم کون ہوتے ہو مجھے مائی جی کہنے والے' اپنی صورت تو دیکھو۔ کیا میں تمہیں ''مائی'' لگتی ہوں۔ کبھی کبھار علی بخش مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا کر بازار سے سودا سلف لینے جاتا۔ ایک آدھ بار سڑک پر بھائی آفتاب سے ملاقات ہوئی اور علی بخش نے مجھے بتایا کہ یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں' ان سے ہاتھ ملاؤ۔ میں نے اس کے کندھوں پر بیٹھے بھائی آفتاب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا' مگر دل میں سوچا کہ یہ میرے بھائی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو مجھ سے بہت بڑے ہیں گھر واپس آنے تک میں بھول جایا کرتا کہ کس سے ملا ہوں۔

منیرہ کی ولادت زنان خانے کی درمیانی کوٹھری میں ہوئی تھی۔ انگریز ڈاکٹرانی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جب میری ماں کو بتایا گیا کہ بیٹی ہوئی ہے تو فوراً بول اٹھیں ''ہائے اُس کی شادی کس سے ہوگی؟ انہیں تو کوئی بر اس کے لیے پسند ہی نہ آئے گا۔'' میری والدہ نے گھر پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ خط لکھ سکتی تھیں۔ قرآن شریف پڑھ سکتی تھیں یا کبھی کبھار کوئی نسوانی رسالہ ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ انگریزی سیکھنے کی کوشش بھی کیا کرتی تھیں۔ لیکن بڑی ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست تھیں۔ جن بھوت' جادو ٹونا سے بہت خوفزدہ ہوا کرتیں۔ اِس نوع کے خطرات سے نبٹنے کے لیے ان کی مشیر خاص ماں وڈی ہوتی تھیں۔

دو واقعات کا تو میں چشم دید گواہ ہوں۔ منیرہ کی پیدائش سے چند روز قبل چاند گرہن لگا۔ اس خدشہ کے پیش نظر کہ گرہن کا اثر کہیں پیٹ میں بچہ پر نہ پڑے' ماں وڈی نے ایک موٹی سی روٹی پکا کر میری ماں کے پیٹ پر رکھی اور پھر کوئی دم پڑھ کر اسے چھری سے چار حصوں میں کاٹ دیا۔ گرہن کے اختتام پر روٹی کے ان چار ٹکڑوں کو گھر کی چار سمتوں میں شاید گاڑھ دیا گیا۔

اسی طرح بچپن میں مجھے ٹائی فائیڈ (مہلتی بخار) چڑھا۔ اسی کوٹھری میں تقریباً اکیس دن میں بستر پر پڑا رہا۔ ڈاکٹر یار محمد خان میرا علاج کرتے تھے۔ میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ میرے لیے چل پھر سکنا مشکل تھا۔ آپا وسیمہ کا سہارا لے کر چلا کرتا۔ جب بخار ٹوٹا تو کسی عامل کے مشورہ کے مطابق ماں وڈی نے ایک کالا بکرا ذبح کروایا۔ بکرے کا گوشت تو مصلّیوں میں بانٹ دیا گیا۔ مگر اس کی سری پر عامل نے دم کیا۔ پھر

اس کا منہ کھول کر زبان پر ایک روپیہ رکھ دیا گیا اور حسب ہدایت ماں وڈّی سری کو میری استعمال شدہ قمیض میں لپیٹ کر کسی اندھے فقیر کی جھولی میں ڈال آئیں۔ ماں وڈّی کے بقول فقیر نے انہیں کوستے ہوئے کہا کہ بدبخت میری جھولی میں کیا ڈال دیا۔ مگر وہ کان لپیٹ کر بغیر کوئی جواب دیئے گھر چلی آئیں۔

ویسے بھی میں کبھی بیمار ہو جاتا تو والدہ میرے سرہانے روپوں کے نوٹ رکھتیں اور بستر پر لیٹے لیٹے کھیلنے کے لیے نو اشرفیاں دیا کرتیں جو میری ولادت کے وقت والد کے مختلف احباب کی طرف سے مجھے تحفہ میں ملی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر بچہ بیمار ہو اور اسے کھیلنے کے لیے روپے یا اشرفیاں دی جائیں تو وہ صحت یاب ہو جاتا ہے۔

ماہ رمضان میں گھر میں والدہ اور دیگر خواتین باقاعدہ روزے رکھتیں اور قرآن شریف کی تلاوت کرتیں۔ گھر کے ملازم بھی روزے رکھتے۔ البتہ میرے والد شاذ و نادر ہی روزہ رکھتے تھے اور جب رکھتے تو ہر چند گھنٹوں بعد علی بخش کو بلوا کر پوچھتے کہ افطاری میں کتنا وقت باقی ہے۔ والدہ کی دیکھا دیکھی شاید میں بھی سحری کے وقت اٹھنے اور پراٹھے کھانے کی خاطر روزہ رکھ لیتا۔ گھر کی خواتین کو نماز پڑھتے دیکھنا مجھے یاد نہیں۔ والد کو کبھی کبھار فجر کی نماز پڑھتے ضرور دیکھا ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ماں باپ نے کبھی نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ میں نے اگر کبھی نماز پڑھی تو اپنی مرضی سے پڑھی کسی کی تلقین پر نہیں پڑھی۔ ایک مرتبہ شاید اچانک میرے والد نے مجھے نماز پڑھتے دیکھ لیا تو انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار اِن اشعار میں کیا ؏

سحر جاوید را در سجدہ دیدم — بہ صبحش چہرۂ شامم بیاراے

(ارمغانِ حجاز)

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں عموماً والد کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن اس شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے نہاتا۔ نئے کپڑے یا جوتوں کا جوڑا سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے 'عیدی ملتی' کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے' مجھے والدہ پہنایا کرتیں۔ سر پر تلّے کی گول مخملی ٹوپی پہنتا اور کلائی پر باندھنے کے لیے مجھے ایک سونے کی گھڑی بھی دی جاتی جو افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ نے مجھے تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ میں والد کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ان کی انگلی پکڑے شاہی مسجد میں داخل ہوتا اور ان کے ساتھ عید کی نماز ادا کرتا۔ نماز سے فارغ ہو کر میرے والد بمطابق معمول بارود خانہ میں میاں نظام الدین (منیرہ کے شوہر میاں صلاح الدین کے نانا) کی حویلی میں ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ گھر واپس آ کر والد کی عادت تھی کہ وہ عید کے روز سویوں پر دہی ڈال کر کھایا کرتے تھے۔ سارا

دن انہیں ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ منیرہ تو زرق برق لباس پہنے مصلّی لڑکیوں راجاں یا نوراں کی گود سے نہ اترتی تھیں۔ لیکن میرا سارا دن ہمجولیوں کے ساتھ ہمارے گھر کے پیچھے شاہ عبدالمعالی کے مزار پر لگے میلے پر کھاتے پیتے ہنستے کھیلتے گزر جاتا۔ رات آتی تو والدہ سونے کی گھڑی اور اچکن اتروالیتیں اور پھر اگلی عید تک مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا۔

اسی طرح بسنت کا دن منانے کے لیے بھی میری خواہش کے مطابق خوب اہتمام کیا جاتا۔ شب کو ڈور کا پنا اور پتنگیں سرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح منہ اندھیرے ہمجولیوں کے ساتھ کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ سارا دن پتنگیں اڑاتے یا پیچ لڑاتے گزرتا اور رات گئے تک نیچے اترنے کا نام نہ لیتا۔ شب برات کے روز پٹاخے خرید کر چلانے کے لیے بھی ماں سے پیسے ملتے۔

میں نے چند بار ماں باپ میں تکرار ہوتے بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ تو میری والدہ کا اصرار تھا کہ والد باقاعدگی سے وکالت کریں کیونکہ گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ نیز کرایہ کی کوٹھی میں رہنے کی بجائے اپنا گھر بنوائیں۔ یہ منظر اب تک میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ والدہ میرے والد کے ذاتی کمرے میں کھڑی انہیں کوس رہی ہیں اور روتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ میں اس گھر میں ایک لونڈی کی طرح کام کرتی ہوں اور ساتھ ہی پیسے بچانے کی کوشش میں لگی رہتی ہوں۔ دوسری طرف آپ ہیں کہ بجائے نیک نیتی سے کچھ کرنے کے بستر پر دراز شعر لکھتے رہتے ہیں اور جواب میں میرے والد لیٹے ہوئے بغیر کچھ منہ سے بولے کھسیانی ہنسی ہنس رہے ہیں۔

بعض اوقات میری وجہ سے بھی دونوں میں جھگڑا ہو جاتا۔ مثلاً والدہ کو میرے متعلق یہی فکر رہتا کہ جب بھی میں اکیلا کھانا کھاؤں پیٹ بھر کر نہیں کھاتا۔ اس لیے ہمیشہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا کرتیں۔ یہاں تک کہ میں آٹھ نو برس کا ہو گیا لیکن پھر بھی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے کی عادت نہ پڑی۔ میرے والد اس بات پر ناراض ہوتے کہ تم اُسے بگاڑ رہی ہو اگر یہ جوان ہو کر بھی خود کھانا نہ کھا سکا تو کیا ہو گا؟ ہم لوگ رات کو عموماً چاول کھایا کرتے تھے۔ لہٰذا اب یوں ہوتا کہ بطور احتیاط چمچہ میری پلیٹ کے قریب رکھ دیا جاتا مگر کھانا والدہ ہی کھلاتیں۔ میرے والد کی عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دبے پاؤں زنانہ میں آیا کرتے۔ اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ بہرحال جب بھی والدہ مجھے کھلا رہی ہوتیں اُن کا دھیان باہر ہی رہتا اور جونہی وہ والد کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنتیں تو اپنا ہاتھ پھرتی سے علیحدہ کر کے چمچہ میرے آگے رکھ دیتیں اور میں خود کھانا کھانے میں مشغول ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ والد کئی مرتبہ اس کا سراغ لگا چکے تھے لیکن وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے بعد چلے جایا کرتے۔

مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے جب میں پہلی بار سکول گیا۔ مجھے سیکرڈ ہارٹ مشنری سکول میں داخل کیا

گیا جہاں لڑکیوں کے ساتھ پڑھائی ہوتی تھی۔ میری عمر کوئی پانچ ساڑھے پانچ برس کی ہوگی۔ والدہ بہت فکر مند تھیں کہ میں سارا دن گھر سے دور کیسے رہ سکوں گا۔ والد انہیں دلاسا دیتے رہے لیکن ساتھ خود بھی علی بخش سے پوچھتے کہ جاوید کو لینے کب جاؤ گے؟ چھٹی ہونے پر جب میں گھر آیا تو والدہ برآمدہ میں کھڑی میری راہ تک رہی تھیں۔ والد بھی اپنے کمرے سے اٹھ کر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے۔

میں بچپن میں بے حد شریر تھا' اس لیے والدہ سے مار کھانا میرا معمول بن چکا تھا۔ میری والدہ ایک خوبصورت اور مدبر خاتون تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں' ناک ستواں' ہونٹ پتلے' پیشانی فراخ اور چہرہ بیضوی تھا۔ جسم متناسب اور قد درمیانہ تھا۔ بڑی نرم دل اور حلیم طبع تھیں۔ لیکن بچوں کی پرورش کے بارے میں ان کا اصول یہی تھا کہ اولاد کو کھانے کو دو سونے کا نوالہ پر دیکھو قہر کی نظر سے۔ گو میں ان کے ہاں دس بارہ برس کے شدید انتظار کے بعد پیدا ہوا' مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے مجھ پر کبھی ایسی شفقت یا پیار کا اظہار کیا ہو جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ میں نے سن رکھا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مجھے پیار کرتیں میرے سوتے کے عالم میں کرتیں۔ شاید اسی لیے بچپن میں میرے ذہن سے یہ خیال بھی گزرا کرتا کہ میری ماں دراصل میری حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔

والد سے میں نے بہت کم مار کھائی ہے۔ میرے لیے ان کی ڈانٹ یا جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے پر مجھے کئی بار کوسا گیا۔ والد کبھی برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے "احمق آدمی! بیوقوف"۔ زیادہ ناراض ہوتے تو پنجابی کی بجائے اردو یا انگریزی میں غصہ کا اظہار کرتے۔

والدہ خود چاہے مجھے کتنا مار لیں' کسی اور کو مجھ پر ہاتھ اٹھانے نہ دیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ والد نے کسی شرارت پر مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن والدہ بیچ میں آ کھڑی ہوئیں اور ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ والد نے دوسرا ہاتھ اٹھایا تو والدہ نے وہ بھی پکڑ لیا۔ اس دوران میں تو خوف کے مارے نیچے بیٹھا والدہ کی ٹانگ سے چمٹا رہا لیکن وہ دونوں اس عجیب صورتحال پر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

مجھے والد سے تھپڑ کھانے کا صرف ایک واقعہ یاد ہے۔ مجھے خرچ کرنے کے لیے والدہ سے روز ایک آنہ ملتا تھا اور اسے خرچ کر چکنے کے بعد خواہ میں ان کی کتنی ہی منتیں کروں مجھے مزید کچھ نہ ملتا۔ ایک دفعہ اتفاق یوں ہوا کہ کوئی مٹھائی بیچنے والا ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا۔ مٹھائی دیکھ کر میں للچا گیا۔ مگر جیب خالی تھی۔ اسے بٹھا تو لیا اور ماں کے پاس دوڑا آیا کہ شاید کچھ مل جائے۔ انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ خوانچہ فروش کے پاس واپس آیا تو اس نے کہہ دیا کہ پیتل لے کر بھی مٹھائی دے سکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ سائے کی طرح والد کے کمرے میں گھسا اور بڑے ٹیبل فین کے پیچھے لگے پیتل کا پرزہ اتار کر خوانچہ فروش کو دے دیا اور مٹھائی

لے لی۔ لیکن شامت اعمال سے فیروز ڈرائیور نے یہ کارروائی دیکھ لی اور والد سے شکایت کر دی۔ میں گھر کے اندر داخل ہوا تو اطلاع ملی کہ والد بلا رہے ہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں گیا۔ وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور چند تھپڑ میری گردن پر جما دیئے۔ اس کے علاوہ اگر مجھے انہوں نے کبھی برا بھلا کہا تو اس کی وجہ نوکروں سے بدتمیزی کرنا یا جھوٹ بولنا تھی۔

ایک دفعہ میں آنکھوں پر والدہ کا دوپٹہ باندھے ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر پڑا' جس کے سبب ہونٹ کٹ گیا اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ اتفاق سے اسی لمحہ والد زنان خانہ میں داخل ہوئے اور اچانک میرے منہ سے یوں خون بہتا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

ایک دو مرتبہ والد اور والدہ کے ساتھ سیالکوٹ بھی گیا۔ تب میرے دادا بقید حیات تھے گو بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اپنے مخصوص کمرے میں ہمیشہ چارپائی پر بیٹھے رہتے۔ ان کا نام شیخ نور محمد تھا' مگر شیخ نتھو کہلاتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی ولادت پر والدہ نے انہیں ناک میں نتھ پہنا دی تھی تاکہ بدی کی قوتیں لڑکی سمجھ کر ان کی جان بخش دیں۔ شیخ نور محمد کی پیدائش سے پیشتر ان کے والدین کے ہاں گیارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ مگر پیدا ہوتے ہی مر جایا کرتے تھے۔ صرف یہی بچے اور لمبی عمر پائی۔ آپ کسی مدرسے کے پڑھے ہوئے نہ تھے۔ البتہ حروف شناس تھے۔ صوفیاء کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے اور خود بھی صوفی منش تھے۔ میں ان کے پاس جاتا تو آنکھوں کو اپنے ہاتھ کا سایہ دے کر مجھے بغور دیکھتے اور پوچھتے کہ کون ہے' آفتاب کہ جاوید؟ جب میں انہیں بتاتا کہ میں جاوید ہوں تو ہنس دیتے' طاق میں سے ایک ٹین کا ڈبہ اٹھاتے اور اس میں سے برفی نکال کر مجھے کھانے کو دیتے۔ سیالکوٹ کے اس مکان میں یا محلّہ چوڑیگراں کی گلیوں میں جہاں میں بھاگتا پھرتا تھا وہیں میرے والد کا بچپن بھی گزرا تھا۔

پنجاب کونسل کے انتخاب میں کامیابی کے بعد میرے والد گھر میں عموماً ملنے والوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ مثلاً ملک لعل دین قیصر' ملک میراں بخش' میاں عبدالعزیز مالواڈا' نواب ذوالفقار علی خان' خلیفہ شجاع الدین...... یہ بزرگ ہستیاں تو مجھے خوب یاد ہیں۔ کیونکہ لاہور شہر کی سیاسیات میں پیش پیش تھیں۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے روبرو بھی پیش کیا گیا۔ دونوں تحریک خلافت کے معروف قائد تھے۔ تحریک پاکستان سے پیشتر اسی تحریک نے مسلمانان ہند کو سیاسی طور پر بیدار کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اردو اور انگریزی اخبار "ہمدرد" اور "کامریڈ" نکالتے تھے۔ دونوں اخبار اس زمانے میں مسلم ہند کے مشہور اخبار تھے۔ مولانا محمد علی میرے والد کو اقبال کہہ کر بلاتے تھے اور میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی کو انہیں اقبال کہتے سنا۔ مولانا محمد علی ایک متناسب جسم' میانہ قد' باریش بزرگ تھے جو نہایت خوش پوش' خوش باش اور

خوش خور تھے۔ مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا۔ آپ کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے رہتے اور میری والدہ ان کے لیے طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ یہ وہی مولانا محمد علی تھے جن کے بارے میں اس زمانہ میں مجھے ایک شعر حفظ ہو گیا تھا ؎

بولی اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

میری والدہ واقعی عمدہ کھانا پکانے کی ماہر تھیں۔ والد کے مرغوب کھانے مثلاً پلاؤ، زردہ، مرغ قورمہ، شامی کباب، کریلے گوشت، آلوؤں کا بھرتا، فرنی اور خمیری روٹیاں تو اکثر پکتے تھے۔ وہ خود ایسے کھانوں کی شوقین نہ تھیں۔ ان کے پسندیدہ کھانے خشکہ چاولوں کے ساتھ دال، بینگن کی بھجیا، ناخیں (کچی ناشپاتیاں) گوشت یا شب دیگ تھے۔ پھلوں میں گرمیوں میں سب آم، آم اور آم، اور سردیوں میں خشک میوے کھاتے تھے۔ آم تو میاں نظام الدین کے دریائے راوی کے کنارے باغ میں کھانے یاد ہیں، جہاں میرے والد گرمیوں کی دوپہر میں میاں نظام الدین، میاں امیر الدین، میاں ایم اسلم، محمد دین تاثیر وغیرہ کے ساتھ سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے گزارتے۔ میں یخ بستہ پانی کے حوض میں جو آموں سے بھرا ہوتا، لنگوٹا باندھ کر اتر جاتا اور خوب خوب آم کھاتا۔ یہ باغ چوسنے والے آموں کا تھا جو میرے والد بہت پسند کرتے تھے اور انہوں نے ہی اس آم کی قسم کا نام "ٹیپو" رکھ دیا تھا۔

مجھے نو برس کی عمر میں سیکرڈ ہارٹ سکول سے فارغ کر دیا گیا کیونکہ اس سے بڑی عمر کے لڑکے لڑکیوں کے سکول میں نہیں رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انگریزی میں ہونے کے سبب مجھے لاہور کے سنٹرل ماڈل سکول میں داخل ہونے سے پیشتر ایک سال کے لیے سینٹ فرانسس سکول انارکلی میں داخلہ لینا پڑا۔ یہاں ماسٹر تارا چند میرے استاد تھے جو گھر آ کر بھی مجھے پڑھاتے تھے۔ لڑ والی سفید پگڑی، ہاف کوٹ، قمیص شلوار پہنتے تھے۔ بڑی بڑی سیاہ مونچھیں تھیں جن پر گھی لگایا کرتے۔ نہایت نرم مزاج اور شفیق استاد تھے۔ ایک سال بعد میں سنٹرل ماڈل سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا اور کچھ مدت تک ماسٹر تارا چند ہی سے اردو پڑھتا رہا۔ اردو زبان میں میری دلچسپی اور اردو لکھنے میں میری خوشخطی بھی ماسٹر تارا چند ہی کی بدولت ہے۔ وہ میرے پہلے استاد تھے جنہوں نے اپنا نقش کسی نہ کسی صورت میں مجھ پر چھوڑا۔ میں انہیں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

مجھے موسیقی سے بھی خاصا لگاؤ تھا۔ لیکن ہمارے گھر میں نہ تو ریڈیو تھا اور نہ گراموفون۔ گانا سننے کا شوق تو والد کو بھی تھا۔ جوانی میں ستار بجاتے تھے۔ جب کبھی فقیر نجم الدین گھر پر انہیں طاؤس بجا کر سناتے تو مجھے بھی پاس بٹھا لیا کرتے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب انگلستان گئے تو

میں نے انہیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب واپس آئیں تو میرے لیے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے مگر میرا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا ۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں مری غزل ہے مرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

معاشرتی طور پر میرے ماں باپ کے خاندانوں کا تعلق نچلے درمیانی طبقہ سے تھا۔ میرے والد کے خاندان کے مقابلے میں میری والدہ کا خاندان کم افراد پر مشتمل اور معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور تھا۔ میری والدہ کے صرف ایک ہی بھائی تھے' خواجہ عبدالغنی' جو مجھ سے اور منیرہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ دونوں بہن بھائی بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور انہیں ان کی پھوپھی اور پھوپھا نے پالا تھا جن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ پھوپھا ہائیکورٹ میں عرضی نویس تھے اور موچی دروازہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے پر وہ فوت ہو چکے تھے۔ البتہ پھوپھی بقیدِ حیات تھیں جنہیں میں نانی جی کہتا تھا۔ ماموں عبدالغنی ایک کشمیری قالین فروش عنایت اللہ کی مال روڈ پر دکان میں ملازم تھے۔ گرمیوں میں تین ماہ کے لیے دکان مسوری میں لگتی تھی۔ اس لیے وہ صرف سردیوں کے مہینے ہی لاہور میں گزارتے۔

میں اپنی والدہ کے ہمراہ کبھی کبھار موچی دروازہ میں نانی جی کو ملنے بھی جاتا۔ ان کے مکان میں دو کوٹھریاں تو نیچے ایک دوسری کے پیچھے تھیں جو کھڑکی نہ ہونے کی وجہ سے خاصی تاریک تھیں۔ اسی طرح دو کوٹھریاں آگے پیچھے اوپر کی منزل پر تھیں۔ ایک کی کھڑکی دالان میں کھلتی تھی جس کے تینوں طرف اور لوگوں کے مکان تھے۔ سیڑھیاں اوپر چھت تک جاتی تھیں جس کی ایک طرف بیت الخلا اور دوسری طرف غسلخانہ تھے۔ گرمیوں میں ماموں اور نانی جی یہیں سوتے تھے۔ نانی جی سامنے کے دالان ہی میں اپنا کھانا پکاتیں۔

ایک بوڑھی خادمہ ان کی مدد کرتیں جن کی ناک کٹی ہوئی تھی۔ میں انہیں نک وڈھی اماں کہہ کر بلاتا تھا۔ میری ماں کے کہنے کے مطابق اس کے شوہر نے غصہ میں اس کی ناک کاٹ دی تھی۔ بچپن میں میں اکثر سوچا کرتا کہ نک وڈھی اماں کے شوہر نے ان کی ناک کیسے کاٹی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے شوہر کے ہاتھ کیوں نہ پکڑ لیے؟ شاید شوہر نے سوتے میں ان کی ناک کاٹ دی ہو۔

مجھے اپنے ماموں کی شادی میں شریک ہونا یاد ہے۔ ہماری ممانی سرخ وسفید رنگ کی خالص کشمیری خاتون تھیں۔ موچی دروازہ ہی کی جم پل تھیں۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ دبلے پتلے جسم کی تھیں۔ عینک لگاتی تھیں اور تمباکو والے پان کھانے کی انہیں عادت تھی۔ موچی دروازے کے لہجے کی پنجابی بولتیں۔ اولاد کوئی نہ ہوئی۔ غالباً شادی کے تین سال بعد ماموں عبدالغنی فوت ہو گئے۔ انہیں میری ماں کی قبر کے پہلو میں دفنایا گیا۔ نانی جی کب فوت ہوئیں؟ مجھے یاد نہیں۔ موچی دروازہ کے اندر اس مکان کی شناخت کرسکنا ممکن نہیں۔ نہ اب کوئی ایسی شخصیت زندہ ہے جو اس مکان کی نشاندہی کر سکے۔ خدا جانے وہ مکان کس کی ملکیت تھا اور اب موجود بھی ہے یا نہیں۔ میری ماں کے خاندان کا اب کوئی بھی نام ونشان باقی نہیں رہا۔

مرے لیے تو ہے اقرارِ باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ ملّا ہیں صاحبِ تصدیق
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

باب ۳

جاوید منزل

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ میری ماں اور باپ میں اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ والد تمام دن گھر پر بیٹھے اشعار لکھنے کی بجائے اپنی وکالت کا کام دلجمعی سے کریں یا کہیں ملازمت کر لیں۔ اسی طرح وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ کرایہ کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بنانے کی جستجو کریں۔

بالآخر چند سال بعد والدہ کے گھر کے اخراجات سے بچائے ہوئے روپوں اور ان کے زیورات کی فروخت سے اراضی خریدی گئی اور میورو ڈ (اب علامہ اقبال روڈ) پر عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ نقشہ شیخ عطا محمد نے بنایا اور تعمیر بھی انہی کی زیر نگرانی کی گئی۔ اراضی اور کوٹھی جاوید منزل (اب علامہ اقبال میوزیم بہ تحویل محکمہ آثار قدیمہ) والدہ کے نام تھیں اور انہی کی ملکیت تھیں۔ گھر کی تعمیر کی تکمیل کے بعد ہم میورو ڈ پر اٹھ آئے۔ مگر والدہ نئے گھر میں بیمار گاڑی میں ہی لائی گئیں کیونکہ ان دنوں وہ سخت علیل تھیں۔ انہیں چار پائی پر لیٹے اندر لایا گیا۔ دوسرے روز جب والد انہیں دیکھنے کے لیے زنانخانے میں آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں کچھ کاغذات اٹھا رکھے تھے۔ والدہ سے کہنے لگے کہ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کر دو۔ لیکن والدہ نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔ مگر والد نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر انہوں نے بغیر کچھ کہے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں جاوید منزل میرے نام منتقل ہو گئی۔ والد نے ایک کرایہ نامہ بھی تحریر کیا جس کی رو سے آپ میرے کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے۔ آپ سامنے کے تین کمروں میں رہائش کا پیشگی کرایہ ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ادا کرتے تھے۔

نئے گھر میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز والدہ پر اچانک غشی کا عالم طاری ہو گیا۔ کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب مجھے ان کے پاس لے جایا گیا تو وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا۔ ”اماں! میری طرف دیکھئے۔“ آپ نے آنکھیں کھول کر لحظہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی شام انہوں نے غشی کے عالم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور

رات کو بی بی پاکدامن کے قبرستان میں دفنا دی گئیں۔ جب ان کی قبر کھودی جا رہی تھی تو والد قریب کے درخت کے تلے سوٹی کی ٹیک لیے بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں پہلے کبھی اس قدر مغموم حالت میں نہ دیکھا تھا۔

اپنی زندگی میں والد نے مجھے شاذ ہی کوئی ایسا موقع دیا گیا ہوگا جس سے میں ان کی شفقت یا الفت کا اندازہ کر سکتا جو انہیں میری ذات سے تھی۔ باپ بیٹوں کو اکثر پیار سے بھینچا کرتے ہیں، انہیں گلے لگاتے ہیں، انہیں چومتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کے خدوخال سے کبھی اس قسم کی شفقت پدری کا احساس نہ ہوا۔ بظاہر وہ کم گو اور سرد مہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کبھی گھر میں منہ اٹھائے ادھر ادھر بھاگتے دیکھ کر مسکراتے تو مربیانہ انداز میں، گویا کوئی انہیں مجبوراً مسکرانے کو کہہ رہا ہو۔ اور اکثر اوقات تو میں انہیں اپنی آرام کرسی یا چارپائی پر آنکھیں بند کیے اپنے خیالات میں مستغرق پاتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں غیر ضروری ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جسے سمجھ سکنا میرے لیے مشکل تھا۔ بہر حال جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں ان سے محبت تھوڑی کرتا تھا اور خوف زیادہ کھاتا تھا۔

والدہ کی رحلت کے بعد ہم دونوں بچے والد کے زیادہ قریب آ گئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت والدہ فوت ہوئیں اور ان کی میت گھر میں پڑی تھی تو ہم دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے روتے روتے والد کے کمرے میں گئے۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے کیونکہ ان ایام میں خود بھی بیمار رہتے تھے۔ گلا بیٹھ چکا تھا اور صاف بول نہ سکتے تھے۔ میں اور منیرہ دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کو کہا اور جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ایک پہلو میں مجھے اور دوسرے پہلو میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ پیار سے ہمارے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے مجھ سے گویا ہوئے: ''تمہیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو، تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے۔'' اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار انہوں نے ہم دونوں بھائی بہن کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

ماں کی بے وقت موت نے والد کو پژمردہ سا کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ ہم دونوں بچوں کا بے حد خیال رکھنے لگے تھے۔ اب تو منیرہ بھی کنیرڈ اسکول میں داخل ہو گئی تھیں۔ ہمیں حکم تھا کہ ان سے مل کر اسکول جایا کریں۔ جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسہ دیا کرتے۔ والد مجھے پیار سے ببا اور منیرہ کو بی بلایا کرتے تھے۔ منیرہ کو یقیناً مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ رات کو عموماً انہی کے بستر میں لیٹی سو جایا کرتیں۔ اُن کی ہر خواہش بغیر کسی حیل و حجت کے پوری کر دی جاتی اور اگر میں کبھی اُنہیں ڈانٹتا یا اُن پر ہاتھ اٹھا بیٹھتا تو میری شامت آ جاتی۔ انہیں ہم دونوں کے جھگڑوں پر بہت رنج ہوتا تھا اور

احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ احباب کے یہ کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ مجھ سے بارہا جل کر کہا کرتے: ''تمہارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمہارا دنیا میں کوئی نہیں۔''

والدہ کی وفات کے بعد سب سے اہم مسئلہ تو گھر میں کسی ایسی خاتون کی موجودگی کا تھا جو خصوصی طور پر منیرہ کی دیکھ بھال کر سکے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کی مصلّی لڑکیاں جو گھر کا کام کاج کیا کرتی تھیں، وہیں رہ گئی۔ گھر میں اب صرف ماں وڈی رہ گئی تھیں جو اکیلی یہ فرض انجام نہ دے سکتی تھیں۔ ہماری بیوہ ممانی کچھ عرصہ تک ہمارے پاس رہیں لیکن ان کی شادی ہوگئی اور وہ رخصت ہوگئیں۔ ان کے بعد والدہ کی کسی رشتہ دار خاتون کا تو وجود ہی نہ تھا۔ والد کے رشتہ داروں میں سے وقتاً فوقتاً ہماری کوئی نہ کوئی پھوپھی، تائی جی یا ان کے بیٹے بھائی امتیاز اور ان کی بیوی ہمارے یہاں رہے مگر یہ انتظام عارضی تھا۔ اس لیے منیرہ ان میں سے کسی سے مانوس نہ ہوسکیں۔ ان دنوں ایک دو خواتین بھی ہمارے گھر کے چکر لگایا کرتی تھیں، اس خیال سے کہ شاید والد دوبارہ شادی رچا لیں لیکن ایسا نہ ہوا۔ کوشش کی گئی کہ کوئی مسلم خاتون اتالیقہ (گورنس) کی حیثیت سے ملازم رکھ لی جائے۔ اس ضمن میں ایک مسلم خاتون آئیں بھی لیکن ان کا مطالبہ تھا کہ میرے والد ان سے نکاح پڑھوالیں۔ والد نے انہیں ہنس کر ٹال دیا۔ مجھے اس خاتون کا نام یاد نہیں۔ دیکھنے میں نہایت رجعت پسند قسم کی مسلمان لگتی تھیں۔ برقع پوش تھیں۔ منیرہ نے تو انہیں دیکھتے ہی مسترد کر دیا تھا۔

عارضہ قلب، دمہ اور گلے کی تکلیف کے سبب والد کی وکالت تو چھوٹ چکی تھی۔ گھر کا خرچہ ان کی شعری تصانیف کی رائلٹی اور نواب بھوپال کے مقرر کردہ پانچ صد روپے وظیفہ سے چلتا تھا۔ حساب کتاب اب بھی ان کے گزشتہ کلرک منشی طاہر الدین رکھتے تھے۔ منشی طاہر الدین ۱۹۱۰ء سے میرے والد کے ساتھ بطور کلرک منسلک تھے جب انہوں نے لاہور میں وکالت شروع کی۔ میرے والد سے پیشتر وہ لاہور کی ارائیں برادری کی اہم سیاسی شخصیت سر محمد شفیع کے کلرک تھے۔ مگر جب سر محمد شفیع وائسرائے کی کونسل کے رکن کی حیثیت سے دہلی چلے گئے تو منشی طاہر الدین میرے والد کے پاس آ گئے۔ منشی طاہر الدین حکمت بھی کرتے تھے اور مشہور دوا ''دلروز'' کے موجد ہیں جو پھوڑے پھنسیوں کے علاج کے لیے آج بھی دستیاب ہے۔ میرے والد ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور اسی بنا پر انہیں میرا اور منیرہ کا گارڈین مقرر کیا۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا تھا کہ گلے کی تکلیف کے سلسلہ میں وی آنا (آسٹریا) جائیں مگر یہ تجویز انہوں نے اس لیے مسترد کر دی کہ میں اپنے علاج کی خاطر روپیہ خرچ کر کے اپنے بچوں کی آئندہ بہتر زندگی کا حق غصب کرنا

نہیں چاہتا۔ اس پر نواب بھوپال نے انہیں بھوپال آنے کی پیشکش کی جہاں ہسپتال میں بجلی کے ذریعہ ان کے عارضہ کا علاج کیا جا سکتا تھا۔ یوں والد ہر سال گرمیوں کے ایک دو ماہ بھوپال میں گزارنے لگے۔

ایک مرتبہ والد مجھے اس خیال سے اپنے ہمراہ بھوپال لے گئے کہ ان کی عدم موجودگی میں منیرہ سے لڑتا نہ رہوں۔ اس سفر کی یاد اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ بڑا لمبا سفر تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی دن اور کئی راتیں ریل گاڑی میں ہی گزریں۔ رات کو علی بخش مجھے اوپر کی برتھ پر سلا دیتا اور والد نیچے کی برتھ پر سوتے۔ ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا وہیں منگوا لیا جاتا۔ جب گاڑی بھوپال پہنچی تو نواب بھوپال کے سیکرٹری اور مولانا شوکت علی کے عزیز محمد شعیب استقبال کے لیے موجود تھے۔ ہم موٹر کار میں شیش محل پہنچے جہاں ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں سر راس مسعود (سرسید احمد خان کے پوتے اور جسٹس محمود کے صاحبزادے) کے سیکرٹری ممنون حسن خان ہمارے منتظر تھے۔ سر راس مسعود ان دنوں نواب بھوپال (حمید اللہ خان مرحوم) کے وزیر تعلیم کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور اپنی عظیم الشان کوٹھی ریاض منزل میں مقیم تھے۔ میرے والد سے ان کے گہرے تعلقات کی وجہ یہی تھی کہ وہ سرسید کے پوتے تھے۔ نیز اپنے دادا کی قائم کردہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے۔ میرے والد کی ان سے ملاقات غالباً ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ جب وہ علی گڑھ میں اپنے خطبات کے سلسلہ میں گئے تھے۔ سر راس مسعود ہی کی کوشش سے میرے والد کو نواب بھوپال کی طرف سے وظیفہ ملا۔ شیش محل ایک پرانی وضع کی نہایت وسیع و عریض عمارت تھی۔ اتنے بڑے بڑے کمرے تھے کہ مجھے رات کو ان میں سے گزرتے ڈر آیا کرتا۔

والد تو ہر صبح ہسپتال چلے جاتے جہاں ڈاکٹر باسط ان کے معالج تھے اور ان کے گلے کا علاج برقی شعاؤں سے کرتے تھے۔ مجھے پڑھانے کے لیے صبح صبح ایک استاد بھی شیش محل آیا کرتے تھے جو دوپہر تک رہتے۔ والد کی واپسی پر میں ان کے ساتھ کھانا کھانے والے کمرے میں کھایا کرتا۔ بعد ازاں وہ تو آرام کرتے اور میں شام تک ڈاکٹر باسط کے بچوں بالخصوص ان کے بیٹے زین العابدین کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ (زین العابدین بعد میں امریکہ جا آباد ہوئے۔ کلامازو یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے۔ پھر جدہ تشریف لے آئے اور مسلم اقلیتوں کے حقوق سے متعلق ایک انگریزی رسالے کی ادارت کرتے رہے۔ اب فوت ہو چکے ہیں۔) شیش محل کے نزدیک ایک جھیل نما تالاب تھا۔ شام کے وقت اس تالاب سے کچھوے باہر میدان میں نکل آتے اور ہم ان کی پیٹھوں پر موم بتیاں جلا کر ان کے پیچھے بھاگا کرتے۔ ڈاکٹر باسط کا گھر شیش محل کے مقابل تھا اور میں اکثر رات گئے تک انہی کے ہاں رہا کرتا۔

ہر دوسرے تیسرے روز میں والد کے ساتھ سر راس مسعود کے ہاں ریاض منزل جایا کرتا۔ رات کا کھانا انہی کے ہاں کھایا جاتا۔ وہ میری زندگی میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنہیں میں نے والد کو اقبال کہہ

کر پکارتے سنا۔ سید راس مسعود قد میں والد سے بہت اونچے، قومی ہیکل اور گورے چٹے بزرگ تھے۔ مجھ سے ہر وقت مذاق کرتے رہتے۔ سر راس اور بیگم امت المسعود والد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک روز والد نے انہیں کہہ دیا: ''مسعود! تمہارا دماغ تو انگریز کا ہے مگر تمہارا دل مسلمان کا ہے۔'' وہ بڑے حاضر جواب تھے، فوراً بول اٹھے: ''اقبال، خدا کا شکر ادا کرو کہ میرا دماغ مسلمان کا اور دل انگریز کا نہیں۔''

ہم اور لوگوں کے ہاں بھی اکثر کھانے پر مدعو ہوتے۔ ایک بار ہم کسی کھانے سے واپس لوٹ رہے تھے۔ والد نے گاڑی میں مسز سروجنی نائیڈو (ہندوستان کی معروف انگریزی شاعرہ جنہیں والد اپنے طالب علمی کے زمانہ سے لندن میں جانتے تھے) کو تو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ سامنے کی سیٹوں پر ڈرائیور اور گارڈ بیٹھے اور مجھے علی بخش کے ہمراہ ڈگی میں بیٹھنا پڑا جو مجھے بہت ناگوار گزرا لیکن میں نے اس کا کسی سے ذکر نہ کیا۔

اسی طرح ایک شام بیگم صاحبہ بھوپال کے محل میں چائے پر مجھے اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ بیگم صاحبہ نے فرمائش کر رکھی تھی کہ جاوید کو ساتھ لائیے۔ سید راس مسعود اور بیگم امت المسعود بھی ہمراہ تھے۔ جب ان سب نے بیگم صاحبہ بھوپال کو جھک کر فرشی سلام کئے تو مجھے بڑی ہنسی آئی۔ اتنے میں ولیّہ عہد پرنسس عابدہ سلطان تشریف لے آئیں اور سب سے ملیں۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ شیر کو مچان پر بیٹھ کر مارنے کی بجائے زمین پر کھڑی ہو کر گولی کا نشانہ بناتی ہیں اور اس طرح وہ بیسیوں شیر مار چکی تھیں۔ انہیں بعد میں بھی چند ایک بار سڑکوں پر بڑی تیزی سے سپورٹس کار چلاتے دیکھا۔ میں اور زین العابدین ان کی رعب دار شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ نواب صاحب بھوپال کو تو میں نے زیادہ تر ٹینس کھیلتے ہی دیکھا۔ بہر حال یہ برطانوی ہند میں نوابوں اور راجاؤں کے ٹھاٹھ تھے۔

بھوپال میں میرا بیشتر وقت والد کی نگاہوں کے سامنے ہی گزرتا تھا۔ رات کو کھانے کی میز پر مجھے سکھایا کرتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا چاہیے اور کانٹا یوں۔ میں فطرتاً شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اس لیے جب کبھی انہیں لوگ شیش محل میں ملنے آتے یا وہ لوگوں کے ہاں جاتے تو مجھے ہمیشہ کہا کرتے کہ لوگوں کے سامنے خاموش بیٹھے رہنے کی بجائے ان سے بات چیت کرنی چاہیے۔ (شیش محل اب اقبال مرکز بنا دیا گیا ہے اور اس کے سامنے کا میدان اقبال میدان کہلاتا ہے جس میں کسی معروف ہندو مجسمہ ساز نے لوہے کی تاروں کا شاہین بنا کر اسے ایک ستون پر نصب کر رکھا ہے۔ ممنون حسن خان اقبال مرکز کے مہتمم تھے مگر اب فوت ہو چکے ہیں۔)

بھوپال سے واپسی پر ہم چند دنوں کے لیے دہلی ٹھہرے۔ وہاں والد بذات خود مجھے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے لے گئے۔ پہلے لال قلعہ دیکھا۔ پھر نظام الدین اولیاء گئے۔ غالب کی تربت پر فاتحہ پڑھی اور پھر نئی دہلی سے ہوتے ہوئے قطب مینار پہنچے۔ میرا دل چاہا کہ قطب مینار کے اوپر

چڑھ جاؤں اور میں نے انہیں بھی ساتھ آنے کو کہا مگر وہ بولے: ''تم جاؤ، میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو۔'' بالآخر ہم واپس لاہور آ گئے۔ منیرہ کے لیے تحفوں کے علاوہ دہلی کی مٹھائیاں، امرتیاں، سوہن حلوہ، حبشی حلوہ اور نجانے کیا کیا کچھ کھانے کے لیے لائے۔

گرمیوں میں والد باہر دالان میں سوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کو دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو وہ علی بخش کو اس غرض کے لیے بھی بلواتے کہ میری پائینتی پر پڑی ہوئی چادر کو میرے اوپر ڈال دو۔ علی بخش نے غالباً ۱۹۰۰ء میں میرے والد کی ملازمت اختیار کی جب انہوں نے اورینٹل کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے پڑھانا شروع کیا تھا اور بھاٹی دروازے کے اندر ایک مکان میں فروکش تھے۔ علی بخش ان کے لیے کھانا بھی پکاتا اور دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ اصلاً اس کا تعلق مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور موضع اٹل گڑھ سے تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب میرے والد تعلیم کی تحصیل کی خاطر انگلستان گئے تو اسے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کے پاس چھوڑ گئے۔ مگر وہ ان کے ساتھ زیادہ عرصہ نہ رہا۔ بعدازاں ۱۹۰۸ء میں جب میرے والد انگلستان سے واپس آئے اور بالآخر لاہور میں وکالت شروع کی تو علی بخش کو پھر اپنے پاس بلا لیا۔ تب سے ان کی وفات تک وہ ان کی خدمت کرتا رہا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی ہمارے پاس ہی رہا۔ ۱۹۵۶ء میں میرے انگلستان سے واپس آنے پر بھی علی بخش جاوید منزل ہی میں مقیم تھا۔ اس نے ساری عمر شادی نہ کی۔ میرے والد کی خدمت کے اعتراف کے طور پر صدر اسکندر مرزا نے غالباً ۱۹۵۸ء میں اسے ضلع فیصل آباد کے کسی چک میں دو مربع ارضی عطا کی۔ جو اب بھی اس کے بھائی کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔ علی بخش کی وفات وہیں غالباً ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔

والد کی عادت سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں اکثر ہلتا رہتا جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ کر سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں لیکن جب گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے اور نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار میں ان کے خراٹوں سے ڈر جایا کرتا۔

ایک دوپہر انہیں دمہ کا بہت شدید دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے غالباً بے ہوش ہو گئے۔ پھر یکدم آنکھیں کھول دیں اور اپنے کندھے دباتے ہوئے علی بخش سے کہا: ''ابھی ابھی مولانا (رومی) اٹھ کر باہر گئے ہیں، اگر چلے نہیں گئے تو انہیں بلا لاؤ۔ میں نے کچھ پوچھنا ہے۔'' جب علی بخش نے بتایا کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا تو بولے: ''چلو، ٹھیک ہے۔'' اسی طرح ایک مرتبہ غشی کے عالم میں میں نے انہیں غالب سے باتیں کرتے ہوئے پایا۔

والد کو میں نے بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی تنہائی میں بیٹھے اپنا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور فضا میں گھوم کر اپنی پہلی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ گرمیوں میں باہر رکھے ہوئے تخت پر ہی فجر کی نماز پڑھ لیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی۔ دیواریں گرد و غبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑتا تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے، اس لیے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں ہمیشہ دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے خوش تھے۔ کئی بار دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کے سبب بھول جایا کرتے اور جب کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: ''کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟'' شام کو گھر کے دالان ہی میں ایک دو چکر لگا لیا کرتے۔ اس کے سوا ان کی زندگی میں بظاہر کامل جمود تھا۔

میں اگر کبھی بیمار ہو جاتا تو بڑے پریشان ہوتے۔ ایک مرتبہ میرے گلے میں ایک گلٹی سی بن گئی۔ آپ اتنے فکرمند ہوئے کہ بخار چڑھ گیا لیکن اس کے باوجود مجھے خود ساتھ لے کر ڈاکٹر یعقوب بیگ کے کلینک گئے۔ اس نے سرجری کر کے گلٹی نکال دی اور میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا مگر مدت تک آپ کا بخار نہ ٹوٹا۔

میری والدہ کے انتقال کے بعد وہ صرف ایک بار زنان خانے میں آئے اور وہ بھی جب میں شدید زکام کی وجہ سے بستر پر پڑا تھا۔ تب انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ گھر کے زنانہ حصہ میں کمروں کی تعداد کتنی ہے۔ اسی طرح والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن میں نے انہیں ازسرنو خضاب شروع کرنے کو کہا تو مسکرا کر بولے: ''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔'' میں نے پھر کہا: ''لیکن اباجی! ہم تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔'' چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے میرے سفید بالوں کو دیکھ کر مجھے ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا مگر چند ہی ماہ بعد پھر چھوڑ دیا اور میری ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کو کہوں۔

والد نے ہندوستان بھر میں اپنے جاننے والوں کو لکھ رکھا تھا کہ انہیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی خاتونِ اتالیقہ (گورنس) کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر ان کے پاس رہ سکے۔ کچھ عرصہ بعد جواب میں علی گڑھ سے ان کے دوست رشید احمد صدیقی (معروف اردو مزاح نگار پروفیسر احسان رشید سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کے والد) نے ایک جرمن خاتون کو یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار کیا جو اپنی بہن کے ساتھ علی گڑھ میں رہتی تھیں۔ ان کی بہن علی گڑھ یونیورسٹی میں بیالوجی کے پروفیسر کی اہلیہ تھیں۔ بالآخر پچاس روپے ماہوار کی تنخواہ پر آنٹی ڈورس گرمیوں کی ایک دوپہر علی گڑھ سے لاہور تشریف لے آئیں۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر میاں محمد شفیع (م۔ش) منیرہ اور میں نے ان کا استقبال کیا۔ چونکہ والد کی موٹر کار اب گیراج میں بند کر دی گئی تھی اور فیروز ڈرائیور کو فارغ کر دیا گیا تھا، اس لیے ہم آنٹی ڈورس کو ٹانگہ میں بٹھا کر جاوید منزل لائے۔

آنٹی ڈورس کے گھر میں آنے سے ہماری گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی اور لائف اسٹائل کچھ حد تک یورپین ہو گیا۔ گھر میں سب آنٹی ڈورس کو ''آپا جان'' کہتے تھے۔ وہ اپنی مادری زبان جرمن کے علاوہ انگریزی اور اچھی خاصی اردو بول لیتی تھیں۔ ہم سب والد سمیت دوپہر کا کھانا اکٹھے کھانے والے کمرے میں میز پر کھایا کرتے۔ والد بھی گھر میں اب دھوتی اور بنیان کی بجائے شلوار اور قمیص پہننے لگے تھے۔ کھانا پکانے کے لیے ایک مدت سے خانساماں رکھا جا چکا تھا جسے آنٹی ڈورس نے سوپ اور جرمن کھانے پکانے بھی سکھا دیئے۔ وہ خود بھی مختلف قسم کے کیک بنانے اور جرمن کھانے پکانے کی ماہر تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا کا سب سے بڑا شہر برلن تھا اور سب سے اچھی موٹر کار مرسڈیز تھی۔ وہ منیرہ اور میرے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتیں۔ شام کو گھر کے پیچھے اینگلو انڈین ریلوے ملازمین کی آبادی برٹ انسٹی ٹیوٹ کی خاموش سڑکوں پر ہمیں سیر کرانے کے لیے لے جایا کرتیں۔ رات کا کھانا پھر ہم اکٹھے کھانے والے کمرے میں کھاتے۔ والد رات کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے جو ان کے کمرے میں پیش کی جاتی۔ رات کو منیرہ، میں اور آنٹی ڈورس والد کے کمرے میں بیٹھتے۔ والد جرمن زبان جانتے تھے، اس لیے آنٹی ڈورس سے جرمن ہی میں گفتگو کرتے اور منیرہ سے بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ ان دنوں کچھ کچھ جرمن فقرے سیکھ گئی تھیں۔ اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرنے کی کوشش کرتیں اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔

میرے میکلوڈ روڈ والے ہمجولی تو اب نہ رہے تھے مگر ہمارے گھر سے کچھ فاصلہ پر راجہ حسن اختر (والد کے معتقدین میں سے ایک اہم شخصیت) اور ڈاکٹر تصدق حسین خالد ایڈووکیٹ رہتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے صاحبزادے ظہور اختر اور اسلم ریاض (بعد میں چیف جسٹس ہائیکورٹ لاہور، گورنر

پنجاب اور بالآخر سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے) میرے ساتھ کھیلنے کے لیے آ جاتے تھے۔ اسلم ریاض تو سنٹرل ماڈل اسکول میں میرے ساتھ پڑھتے بھی تھے۔ ظہور اختر کسی اور اسکول میں جاتے تھے۔ بعدازاں وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے چلے گئے اور پھر فوج میں کرنیل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ لے لی۔

آنٹی ڈورس ایک دفعہ منیرہ کے ساتھ کنیرڈ اسکول گئیں تو انہیں پتہ چلا کہ منیرہ کو بائبل کلاسوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اگرچہ وہ خود مسیحی عقیدہ کی تھیں، انہوں نے واپس آ کر والد سے شکایت کی کہ اسکول میں منیرہ کو بائبل پڑھنا پڑتی ہے، اس لیے انہیں وہاں سے اٹھالیا جائے۔ والد نے کہا کہ اس میں کوئی بری بات نہیں کیونکہ منیرہ کو مختلف مذاہب کی تعلیمات کا علم ہونا چاہیے اور اگر ایسی کوئی بات ہے تو ان کے لیے گھر پر قرآن شریف پڑھانے کے لیے کسی معلّمہ کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ کوئی معقول بندوبست نہ ہو سکا، اس لیے آنٹی ڈورس نے منیرہ کو کنیرڈ اسکول سے اٹھوا کر انجمنِ حمایتِ اسلام کے ایک لڑکیوں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ ان ایام میں اسی اسکول کی تیز طرار ہیڈ مسٹرس جو ایک نوجوان، خوبصورت اور خوش پوش خاتون تھیں، ہمارے یہاں اکثر آیا جایا کرتی تھیں اور فخریہ بیان کرتی تھیں کہ انہوں نے آ کر انجمن کے اسکول میں کتنی شاندار تبدیلیاں کر دی ہیں مگر وہاں منیرہ کے بالوں میں جوئیں پڑ گئیں، لہٰذا انہیں وہاں سے اٹھوا کر بالآخر کوئین میری اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ میرے لیے تو سنٹرل ماڈل اسکول جانے اور آنے کے لیے ماہانہ بنیاد پر ایک ٹانگہ کا انتظام کیا گیا تھا لیکن منیرہ کا اسکول ہمارے گھر کے قریب ہی تھا، اس لیے وہ علی بخش کے ساتھ چند سہیلیوں کو رستہ میں لیتی ہوئی پیدل جایا کرتی تھیں۔

والد کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نہایت سخت مزاج اور قدامت پسند ذہنیت رکھتے تھے۔ انہیں منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے کسی یورپین خاتون کا تقرر بالکل پسند نہ تھا۔ اس بارے میں وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی والد سے برملا کر دیتے۔ والد کا قاعدہ تھا کہ بڑے بھائی کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے سامنے کبھی نہ بولتے مگر کرتے وہی تھے جو انہیں پسند تھا۔ ایک دفعہ تایا جی نے منیرہ کے اوڑھنے کے لیے سیالکوٹ سے ایک ننھا سا ریشمی برقعہ بنوا کر بھیجا۔ تب منیرہ کی عمر شاید سات برس تھی۔ برقع دیکھ کر آنٹی ڈورس سخت غصہ میں آ گئیں۔ اسے ہاتھ میں اٹھائے والد کو دکھانے کے لیے لائیں اور احتجاجاً کہا کہ اتنی چھوٹی عمر میں کیا آپ منیرہ کو پردہ کرانا چاہتے ہیں؟ والد ہنس دیئے اور فرمایا: ''میرے بڑے بھائی نے یوں منیرہ کے لیے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ آپ ان کا تحفہ رکھ لیں۔ ضروری نہیں کہ منیرہ یہ برقع اوڑھے اور میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جب منیرہ بڑی ہوگی تو خواتین میں پردہ رہے گا بھی یا نہیں۔'' منیرہ کے لیے وہ ننھا سا برقع اچھا خاصا تماشا تھا۔ وہ برقع پہنے گھر میں ادھر ادھر بھاگتی پھرتی۔ حتیٰ کہ اس بھاگ دوڑ میں برقع پھٹ کر نا کارہ ہو گیا۔

مجھے مصوری سے بھی دلچسپی تھی مگر والد کو میرے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے اچھی خاصی بن گئی۔ ان دنوں تایا جی لاہور آئے ہوئے تھے اور ہمارے یہاں مقیم تھے۔ جب انہوں نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تو بے حد خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر والد کو دکھانے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ والد کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر میں نے بنائی ہے لیکن جب یقین آ گیا تو میری حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے میرے لیے خاص طور پر آرٹ کی کتابیں منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوروں کے شاہکار دیکھ کر میرا مصوری کے لیے شوق بڑھے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا۔ جب میری نظر سے مصوری کے شاہکار گزرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصاویر نہیں بنا سکتا۔

والد کی خواہش تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں میرے لیے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوادیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹ باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ چند بار میں ان کے ساتھ کشتیوں کے مقابلے دیکھنے بھی گیا۔ والد میں بڑی قوت برداشت تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں اپنی جوانی میں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی تمنا تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں بہت سارے کبوتر چھوڑ دیئے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

والد کے عقیدت مندوں میں ایک حجازی عرب بھی تھے جو کبھی کبھار آتے اور انہیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا کرتے۔ میں نے بھی ان سے کچھ عرصہ کے لیے قرآن مجید پڑھا ہے۔ وہ بڑے خوش الحان تھے۔ والد جب بھی ان سے قرآن مجید سنتے، مجھے بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۃ مزمل کی تلاوت کی تو آپ اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: ''تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔'' اسی طرح مجھے ایک بار مسدس حالی پڑھنے کو کہا اور خاص طور پر وہ بند...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا ع

''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا''

تو آپ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ میں نے انہیں والدہ کی موت پر آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے وقت یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی

ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔

عجیب بات ہے کہ والد نے مجھے کبھی روزہ رکھنے یا نماز ادا کرنے پر زور نہیں دیا۔ نہ کبھی اس بات میں دلچسپی لی کہ میں فارسی پڑھوں کیونکہ ان کا اپنا بیشتر کلام فارسی میں تھا۔ اسکول میں میں اپنی مرضی سے کبھی ہندی اور کبھی عربی پڑھتا رہا اور ان میں سے کسی زبان میں مہارت حاصل نہ کر سکا مگر بعض معاملات میں والد کا ڈسپلن میرے لیے خاصا سخت تھا۔ مثلاً اندھیرا ہونے سے پیشتر وہ مجھے گھر کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریزی لباس یعنی کوٹ پتلون یا نیکر پہننے کی ممانعت تھی۔ صرف شلوار، قمیص اور اچکن یا کوٹ پہننے کا حکم تھا۔ ہیٹ پہننے کی اجازت نہ تھی۔ عموماً رومی ٹوپی پہن کر اسکول جایا کرتا۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے: ''اپنے بال ایسے مت بنایا کرو۔ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے۔'' اور اگر میں کبھی غلطی سے اپنی قمیصوں یا شلواروں کا کپڑا بڑھیا قسم کا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے اور کہتے: ''تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو؟ تمہاری طبیعت میں امارت کی بُو ہے اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو میں تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔'' میرے لیے بارہ آنے گز سے زائد قمیص کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کا بوٹ خریدنا جرم تھا جس کی سزا کافی کڑی تھی لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ میں پلنگ پر سونے کی بجائے زمین پر سویا ہوں تو بہت خوش ہوا کرتے۔

اپنی زندگی میں صرف دو بار انہوں نے مجھے سینما دیکھنے کی اجازت دی۔ دونوں بار فلمیں انگریزی میں تھیں۔ ایک تو فرانسیسی ادیب ایمائیل زولا کی حیات سے متعلق تھی اور دوسری فلم نپولین کے حالاتِ زندگی پر مبنی تھی۔ والد دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ کہا کرتے کہ ہر صاحبِ عمل کو صاحبِ فکر پر فوقیت حاصل ہے۔ مجھے اکثر خالد بن ولید اور فاروق اعظم کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ نپولین کے اجداد عرب سے آئے تھے اور واسکوڈی گاما کو عرب جہاز رانوں ہی نے ہندوستان کا رستہ دکھایا۔ میں دونوں فلمیں میاں محمد شفیع، آنٹی ڈورس اور منیرہ کے ساتھ دیکھنے کے لیے گیا۔

مجھے اردو ادب سے متعلق کتب اور افسانے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ باغ و بہار (قصۂ چہار درویش) حاتم طائی، طلسم ہوشربا اور عبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے۔ ساتویں جماعت کے امتحان کے قریب میرے ہاتھ الف لیلیٰ لگ گئی اور اس کتاب سے میں اس قدر مسحور ہوا کہ رات گئے تک اسے پڑھتا رہتا۔ امتحان سر پر آ گئے لیکن میں نے الف لیلیٰ کو نہ چھوڑا بلکہ رات کو امتحان کی تیاری کی بجائے الف لیلیٰ پڑھتا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساتویں جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ جب والد کو علم ہوا کہ میں الف لیلیٰ میں منہمک ہونے کی وجہ سے امتحان میں فیل ہوا ہوں تو برہم نہ ہوئے بلکہ فرمایا: ''اگر تم

امتحان میں کامیاب ہو جانے کے بعد الف لیلیٰ پڑھتے تو تمہیں اور بھی لطف آتا۔‘‘

ایک بار گرمیوں کے موسم میں والد نے کشمیر جانے کا ارادہ بھی کیا کیونکہ ان کے احباب کا اصرار تھا کہ وہ تبدیلی آب وہوا کی خاطر لاہور سے تھوڑے عرصہ کے لیے کہیں باہر چلے جائیں۔ انہوں نے منیرہ اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم سب بڑے خوش تھے کہ والد کے ساتھ کشمیر جارہے ہیں لیکن کشمیر میں ان کا داخلہ ممنوع تھا، لہٰذا انہوں نے حکومت کشمیر سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عرصہ تک خط و کتابت جاری رہی مگر جب اجازت ملی تو گرمیوں کا موسم نکل چکا تھا۔ یوں وہ اپنی زندگی میں آخری بار وادیٔ کشمیر میں کچھ دن گزارنے سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح بیت اللہ کے حج پر جانے کا قصد بھی کیا لیکن وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

والد کو معلوم تھا کہ مجھے بڑی بڑی شخصیتوں کے آٹوگراف لینے کا شوق ہے۔ گو وہ میری اس عادت کو نہ تو برا سمجھتے اور نہ سراہتے تھے۔ مگر مئی ۱۹۳۶ء کی ایک شام انہوں نے مجھے خاص طور پر بلوا کر کہا کہ ہمارے یہاں ایک مہمان آرہے ہیں۔ جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو تھوڑی دیر بعد میں کمرے میں داخل ہوں اور ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کروں۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے تو میں ان کے حکم کے مطابق کمرہ میں داخل ہوا۔ والد کے ساتھ صوفہ پر ایک دبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہوں میں عقاب ایسی پُھرتی تھی۔ ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ والد نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میں نے آٹوگراف کی کتاب آگے بڑھادی۔ مہمان نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔ ’’کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’جی نہیں۔‘‘ اس پر فوراً دوسرا سوال آیا۔ ’’پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟‘‘ میں خاموش رہا۔ وہ ہنستے ہوئے والد سے مخاطب ہوئے۔ ’’کوئی جواب نہیں دیتا۔‘‘ ’’وہ جواب نہیں دے گا۔‘‘ والد بولے۔ ’’کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اسے بتائیں گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔‘‘ میری آٹوگراف کی کتاب پر دستخط کر دیئے گئے۔ یہ میری خالق پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور محترمہ فاطمہ جناح سے پہلی ملاقات تھی۔ تب قائداعظم کو پنجاب میں زیادہ لوگ نہ جانتے تھے اور مسلم عوام پاکستان کے تصور سے ابھی روشناس نہ ہوئے تھے۔ بہرحال میں نے اس مختصر سے عرصہ میں یہ اندازہ کر لیا کہ والد ان کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔

آخری ایام میں والد کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے حکم تھا کہ انہیں ہر روز صبح انقلاب یا زمیندار اخبار پڑھ کر سنایا کروں۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا کر جاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اسی طرح رات کو عموماً دیوان علی ہارمونیم پر انہیں بلھے شاہ، سلطان باہو، وارث شاہ یا کسی اور پنجابی صوفی شاعر کا کلام گا کر سنایا کرتا۔ کبھی کبھار مجھے بھی اپنی کوئی غزل سنانے کو کہتے۔ ان ایام میں مجھے ان کی صرف ایک غزل یاد تھی

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

والد کے سامنے وہ غزل پڑھنا میرے لیے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھ جاتا تو ناراض ہوتے اور کہتے۔ ''شعر پڑھ رہے ہو یا نثر؟''

ان کی وفات سے کوئی دو ایک ماہ پیشتر ایک شام پنڈت جواہر لعل نہرو کو ان سے ملنے کے لیے آنا تھا۔ والد نے مجھے بلا کر حکم دیا کہ میاں محمد شفیع کے ساتھ پنڈت نہرو کے استقبال کے لیے باہر ڈیوڑھی میں کھڑا رہوں۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ پنڈت نہرو کون ہیں؟ فرمایا۔ ''جس طرح محمد علی جناح مسلمانوں کے لیڈر ہیں، اسی طرح پنڈت نہرو ہندوؤں کے سربراہ ہیں۔'' ہم پنڈت نہرو کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ میاں و بیگم افتخار الدین کے ہمراہ تشریف لائے تو میں نے انہیں ''سلام علیکم'' کہا اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر سلام کا جواب دیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر نہایت شفقت سے میری کمر میں بازو ڈال کر میرے ساتھ والد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ والد انہیں بڑے تپاک سے ملے اور صوفہ پر بیٹھنے کو کہا لیکن پنڈت جی نے نیچے فرش پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ بالآخر وہ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھ گئے اور والد بستر پر لیٹے ان سے باتیں کرنے لگے۔

والد کا گھر سے نکلنا تو ختم ہو گیا تھا۔ لوگ انہیں گھر پر ہی ملنے آتے۔ ہر شام احباب کی محفل جمتی۔ عقیدت مندوں میں سید نذیر نیازی، راجہ حسن اختر، حکیم قرشی اور میاں محمد شفیع تو تقریباً زیادہ وقت جاوید منزل ہی میں گزارتے تھے۔ والد کی چارپائی کے گرد بہت سی کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر بیٹھ جایا کرتے۔ آپ چارپائی پر لیٹے ان سے باتیں کرتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ چودھری محمد حسین شام کو آتے اور رات گئے تک والد کے پاس بیٹھے رہتے۔ رات گئے تک علی بخش ان کے پاؤں دابتا اور اگر میں کبھی دابنے بیٹھ جاتا تو منع کر دیتے اور کہتے کہ تم ابھی چھوٹے ہو، تھک جاؤ گے۔

ایک بار میں نے دیکھا کہ والد نے اپنے کمرے میں منشی طاہر الدین کے سامنے کاغذوں سے بھرا ایک ٹرنک رکھوایا اور اس میں سے خود چھانٹ چھانٹ کر بعض تصاویر اور کاغذات انہیں انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ میں پھینکنے کو دیئے۔ وہ تصاویر اور کاغذات ان کے سامنے جلا دیئے گئے۔ جو کاغذات یا مسودات بچ گئے اور اب اقبال میوزیم کی زینت ہیں، میرے والد کے ذاتی کاغذات میں سے وہی ہیں جو انہوں نے بذاتِ خود محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے۔

مجھے خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی ان کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو تو میں وہاں ضرور موجود ہوں لیکن مجھے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی کیونکہ وہ میری سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو میں عموماً موقع پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا جس پر انہیں بہت رنج ہوتا اور وہ اپنے احباب سے کہتے۔ ''یہ لڑکا نجانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے۔'' دراصل اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے

لگے تھے اور اکثر اوقات افسردگی کے ساتھ کہا کرتے۔ ''سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں۔ میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا۔''

والد کے لیے ہندوستان بھر سے اور افغانستان سے آموں، انگوروں، سیبوں اور سردوں کی پیٹیاں آیا کرتیں۔ جب کبھی ایسی کوئی پیٹی آتی اور ملازم اسے کھول کر بتاتے کہ اس میں کیا ہے تو یہ منیرہ کی عادت تھی کہ وہ بھاگتی ہوئی والد کے کمرے میں جاتیں اور اعلان کرتیں کہ ابا جی آم آئے ہیں یا ابا جی سردے آئے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ سر سید مراتب علی کے فرزند سید واجد علی اور سید امجد علی والد سے ملنے آئے۔ ان کی اسٹیشن ویگن میں ان کے بہت سے کتے تھے۔ منیرہ کتے دیکھتے ہی بھاگی بھاگی والد کے کمرہ میں داخل ہوئیں جب یہ سب لوگ وہاں بیٹھے تھے اور اعلان کیا کہ ابا جی کتے آئے ہیں۔ اس پر والد کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فرمایا۔ ''نہیں بیٹی! یہ سب تو انسان ہیں۔''

لاہور میں پہلا یوم اقبال غالباً جنوری ۱۹۳۸ء میں والد کی زندگی ہی میں منایا گیا۔ جلسے کا اہتمام مینارڈ ہال میں کیا گیا اور اس کی صدارت کے لیے سید غلام السیدین مصنف کتاب اقبال کا فلسفہ تعلیم (انگریزی) بھارتی حکومت کے سابق سیکرٹری تعلیم دہلی سے تشریف لائے۔ میں بھی اس جلسہ میں شریک ہوا اور شام کو اتفاق سے سید غلام السیدین کے ہمراہ ان کے کسی عزیز کے گھر ماڈل ٹاؤن چلا گیا۔ والد سخت پریشان تھے کہ جاوید کہیں گم ہو گیا ہے۔ تلاش کے لیے لوگ دوڑائے گئے۔ جب رات کو میں گھر واپس پہنچا تو ان کی تسلی ہوئی۔

اسی طرح انہی ایام میں مصری علماء کا ایک وفد بھی انہیں ملنے کے لیے آیا۔ والد نے ان کے لیے دوپہر کے کھانے کا انتظام شریف پوری کے ہوٹل میں کیا۔ اس دعوت میں وہ خود بھی سر پر لنگی باندھ کر شریک ہوئے کیونکہ سب مہمان علماء تھے۔

آخری رات ۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء ان کی چارپائی گول کمرے میں بچھی تھی۔ عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی نو بجے کے قریب کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا ''کون ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میں جاوید ہوں۔'' ہنس پڑے اور بولے۔ ''جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔'' پھر قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے مخاطب ہوئے۔ ''چودھری صاحب، اسے میرے جاوید نامہ کے آخیر میں وہ دعا ''خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجئے گا۔'' اسی دوران آنٹی ڈورس منیرہ کو لے آئیں۔ منیرہ ان کے بستر میں گھس گئیں اور ان کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگیں۔ رات کے تقریباً دس بجے آنٹی ڈورس نے منیرہ کو لے جانا چاہا کیونکہ یہ ان کے سونے کا وقت تھا مگر وہ بولیں کہ آنٹی ڈورس تھوڑی دیر اور۔ والد نے مسکراتے ہوئے آنٹی ڈورس سے انگریزی میں کہا کہ اس کی چھٹی حس اسے آگاہ کر رہی ہے کہ آج باپ

سے آخری ملاقات ہے۔ اس لیے اسے کچھ دیر یہیں رہنے دیں۔ بالآخر منیرہ والد کے بستر میں سو گئیں اور آنٹی ڈورس انہیں اپنی گود میں اٹھا کر اندر لے گئیں۔

اس رات ہمارے ہاں بہت سے ڈاکٹر آئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا کیونکہ ڈاکٹروں کے بورڈ نے کہہ دیا تھا کہ آج کی رات مشکل سے کٹے گی۔ کوٹھی کے صحن میں کئی جگہوں پر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں لوگ کھڑے باہر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ والد سے ڈاکٹروں کی رائے مخفی رکھی گئی تھی مگر وہ بڑے تیز فہم تھے۔ انہیں اپنے احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ بساط عنقریب الٹنے والی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس رات ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔

مجھے بھی اصل صورتحال سے آگاہ نہ کیا گیا۔ اس لیے میں معمول کے مطابق اپنے کمرے میں جا کر سو رہا مگر صبح طلوع آفتاب کے وقت علی بخش نے آ کر مجھے جھنجوڑا اور چیختے ہوئے کہا کہ جاؤ دیکھو تمہارے باپ کو کیا ہو گیا ہے۔

نیند اچانک میری آنکھوں سے کافور ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے بستر سے اس خیال سے نکلا کہ جا کر دیکھوں تو سہی کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب میں اپنے کمرے سے گزرتا ہوا ساتھ کے کمرے میں پہنچا تو منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھیں۔ مجھے والد کے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ میری طرف لپکیں اور میرے بازو سے چمٹ گئیں۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ ہم دونوں والد کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کر رک گئے۔ میں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ والد کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی جانب تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔

والد کی وفات کی خبر لاہور میں آگ کی طرح پھیلی۔ صبح ہی سے لوگ جوق در جوق ان کے آخری دیدار کی خاطر جاوید منزل میں جمع ہونے لگے۔ والد کے خاندان اور شہر کی دیگر خواتین بھی آتی چلی گئیں۔ والدہ آفتاب بھی ان میں موجود تھیں۔ اسی طرح بھائی آفتاب سارا دن اپنے باپ کی پائینتی کی طرف فرش پر بیٹھے کبھی ان کے پاؤں کو چومتے اور کبھی اپنی آنکھوں سے لگاتے رہے۔

اس وقت والد کے احباب کے سامنے سب سے اہم مسئلہ میت کو دفنانے کے لیے موزوں جگہ کا انتخاب تھا۔ اس ضمن میں ان کے زیر غور تین مقامات تھے۔ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ، نیلا گنبد کی مسجد

اور میڈیکل کالج کے درمیان خالی قطعہ اراضی اور بادشاہی مسجد کی بائیں دیوار کے ساتھ۔ چودھری محمد حسین کی نگاہ میں موزوں جگہ بادشاہی مسجد کی دیوار کے ساتھ تھی۔ (موجودہ مقام مزار اقبال) کیونکہ اس مقام کی تاریخی اہمیت تھی۔ نیز والد نے اپنے ایک شعر میں یہ دعا بھی کر رکھی تھی کہ ان کی آخری آرامگاہ مسجد کے سایۂ دیوار میں ہو۔ سب نے چودھری محمد حسین کی تجویز سے اتفاق کیا، لہٰذا اس کی اجازت لینے کے لیے چیف منسٹر پنجاب سر سکندر حیات خان کو تار بھیجی گئی کیونکہ ان دنوں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی خاطر کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ جواب میں سر سکندر حیات نے بادشاہ مسجد والے مقام کی اجازت تو نہ دی لیکن نیلا گنبد والی جگہ کو مناسب سمجھا۔ یہ رائے والد کے احباب نے مسترد کر دی۔ نتیجہ میں میاں امیر الدین، سید محسن شاہ اور لاہور کے دیگر معتبرین ایک وفد کی صورت میں پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک کے پاس گئے۔ انہوں نے شاہی مسجد والی جگہ پر میت دفنانے کی اجازت دے دی۔

بالآخر شام چار بجے کے قریب جنازہ اٹھا۔ چارپائی کو لمبے لمبے بانس باندھے گئے تاکہ بیک وقت زیادہ سے زیادہ لوگ کندھا دے سکیں۔ جنازہ ہزاروں لوگوں کے ساتھ قلعہ گوجر سنگھ کے بازار اور فلیمنگ روڈ سے گزرتا اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا۔ یہاں سینکڑوں لوگ جنازے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس لیے پہلی مرتبہ نماز جنازہ وہیں پڑھی گئی۔ معلوم ہوا کہ اسی طرح لاتعداد لوگ بادشاہی مسجد میں بھی جنازے کے منتظر ہیں، لہٰذا اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ سے جنازہ خراماں خراماں چلتے ہوئے موچی دروازہ کے باہر سے ہوتا ہوا بادشاہی مسجد پہنچا۔ وہاں خطیب صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ والد کے لیے مسجد کے زیرِ سایہ مدفن کے لیے تجویز کردہ مقام پر قبر کھودی جا چکی تھی۔ میت کو ایک لکڑی کے تابوت میں رکھا گیا مگر دفنانے سے پیشتر تابوت قبر کے قریب رکھ دیا گیا کیونکہ سیالکوٹ سے والد کے برادر شیخ عطا محمد اور چند دیگر عزیزوں کی آمد کا انتظار تھا۔ ان کے آنے پر میت قبر میں اتاری گئی اور اس عمل میں تقریباً رات کے دس بج گئے جب میں چند عزیزوں کی معیت میں واپس جاوید منزل پہنچا۔

باب۴

اپنے آپ کی تلاش

عجیب بات ہے کہ مفکر اور شاعر ہونے کے باوجود والد ایک عملی انسان تھے۔ وکالت کے پیشہ سے تعلق بھی ان کی شخصیت کے اس پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان گئے تو ایک بند خط میری والدہ کے نام لکھ کر میاں امیر الدین کے پاس چھوڑ گئے۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر ان کے ساتھ کوئی نیکی بدی ہو جائے تو اکاؤنٹ کس بینک میں ہے۔ تصانیف کی رائلٹی کا حساب کیا ہے۔ نیز ایسی صورت میں والدہ کو کیا کرنا ہوگا۔ لفافہ پر درج تھا کہ میری موت پر کھولا جائے۔ اسی طرح ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو اپنی یادداشت کی کتاب میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے ہدایت کی۔ "جاوید اقبال کو لازم ہے کہ بالغ ہونے پر اس تحریر کو جو اس کتاب میں درج ہے، پڑھ لے۔" اس تحریر میں وہ اپنی اس وصیت کا ذکر کرتے ہیں جو سب رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر کرائی جا چکی تھی اور جس کی رو سے انہوں نے اپنے دوست چودھری محمد حسین، میرے تایازاد بھائی شیخ اعجاز احمد، اپنے کلرک حکیم طاہر الدین اور میرے ماموں خواجہ عبدالغنی کو میری اور منیرہ کی جائیداد اور ذات کا ولی مقرر کیا تھا۔ خواجہ عبدالغنی تو والد سے پہلے فوت ہو گئے۔ والد نے ان کی جگہ سر راس مسعود کو ولی مقرر کرنا چاہا مگر ان کا اعتراض تھا کہ ہم سے بہت دور ہونے کے سبب وہ صحیح معنوں میں ہماری دیکھ بھال نہ کر سکیں گے لیکن راس مسعود بھی والد سے پیشتر وفات پا گئے۔ والد کے لیے ان کی موت بڑے دکھ کا باعث بنی۔ اس موقع پر ارشاد کیا

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ میں باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

خواجہ عبدالغنی کی جگہ میاں امیر الدین کو ولی مقرر کر دیا گیا۔ ۱۷-۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک اور تحریر یادداشت کی کتاب میں لکھی جس میں خصوصی طور پر مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"جاوید کو میری عام وصیت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے بڑی ہے۔ ان کا احترام کرے اور اگر ان کی طرف سے کبھی سختی ہو بھی تو برداشت کرے۔ دیگر رشتہ داروں کو اگر اس سے مدد کی ضرورت ہو اور اس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں، ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔ باقی دینی معاملات میں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکانِ دین میں سے نہیں ہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد میں کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اسی راہ پر گامزن رہے اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لیے ہیں، ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے۔ غرض یہ ہے کہ طریقہ حضراتِ اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے اور آئمۂ اہلِ بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے۔"

ہمارے ولیوں کی ایک میٹنگ تو والد کے انتقال کے دوسرے روز ہی ہوئی جس میں طے پایا گیا کہ میں اور منیرہ جاوید منزل میں اسی طرح رہیں گے جیسے والد کی زندگی میں رہتے تھے یعنی منیرہ کی دیکھ بھال آنٹی ڈورس اور ماں وڈی بدستور کریں گی اور وہ بمطابق معمول اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں گی۔ اسی طرح گھر کے ملازمین علی بخش، رحماں اور خانساماں بھی اپنے اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے اور میری تعلیم کا سلسلہ بھی برابر جاری رہے گا۔ بھوپال سے والد کا وظیفہ تو ان کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا مگر وفات کے بعد والد کی آخری تصنیف "ارمغان حجاز" چودھری محمد حسین کی زیر نگرانی شائع ہوئی اور خوب بکی۔ اسی طرح ان کی دیگر کتب کی رائلٹی بھی ہماری ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی سے زیادہ تھی۔ ولیوں میں زیادہ ذمہ داری تو چودھری محمد حسین اور حکیم طاہر الدین کے کندھوں پر تھی جو لاہور میں مقیم تھے۔ میاں امیر الدین بعض خاص

معاملوں میں مشورہ دیتے تھے اور شیخ اعجاز احمد تو لاہور سے باہر جج کے فرائض انجام دے رہے تھے، اس لیے ان سے ضرورت پڑنے پر تحریری مشورہ کر لیا جاتا۔ والد کی شعری تصانیف کے تمام نئے ایڈیشن چودھری محمد حسین کی زیر نگرانی شائع ہوتے تھے اور ان سے آمدنی کا حساب حکیم طاہر الدین رکھتے تھے جو گھر کے ملازمین کی تنخواہوں، ہمارے اسکولوں کی فیس، روزمرہ کے گھریلو اخراجات اور انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لیے رقوم فراہم کرتے تھے۔ مزار اقبال کی تعمیر کے لیے بھی چودھری محمد حسین کی زیر صدارت مرکزی اقبال کمیٹی قائم کی گئی مگر صحیح معنوں میں تعمیر کا کام ۱۹۴۶ء سے ہوا اور چار سال بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں تعمیر مکمل ہوئی۔ بعد ازاں یہی مرکزی اقبال کمیٹی بصورت مرکزی مجلس اقبال ہر سال یوم اقبال منانے کا اہتمام بھی کرنے لگی۔ سو چار مخصوص اشخاص جن پر والد کو کامل اعتماد تھا، ولی مقرر کر کے انہوں نے میرے اور منیرہ کے لیے ایسا مکمل بندوبست کر دیا کہ سن بلوغ تک پہنچنے پر ہم دونوں کو کبھی احساس ہی نہ ہوا کہ یتیم ہیں۔

شیخ عطا محمد کو اس بات کا رنج تھا کہ والد نے انہیں اپنی اولاد کا ولی کیوں نہ مقرر کیا۔ میرے خیال میں والد نے ان کی سخت طبیعت اور بزرگی کے پیش نظر انہیں تکلیف نہ دی۔ تایا جی کے خاندان میں صرف بھائی اعجاز ہی تھے جنہوں نے بی اے، ایل ایل بی تک اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اپنے چچا کی طرح ادبی ذوق بھی رکھتے تھے۔ اگرچہ والد کو بھائی اعجاز کا احمدی عقیدہ اپنانا پسند نہ تھا، پھر بھی بڑے بھائی کے سب سے بڑے فرزند ہونے کی حیثیت سے انہیں محبت کرتے تھے۔ تایا جی کے دوسرے بیٹے بھائی امتیاز تو موٹر مکینک تھے اور ان کا سیالکوٹ میں گیراج تھا۔ جب ہمارے یہاں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ آ کر ٹھہرے تو جاوید منزل کے سامنے ملک بلڈنگ کی ایک دکان میں گیراج کھولا لیکن وہ نہ چل سکا۔ نتیجہ میں وہ لاہور چھوڑ کر بحرین چلے گئے اور تھوڑے عرصہ بعد وہیں وفات پائی۔ سب سے چھوٹے بیٹے بھائی مختار ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب سول سیکرٹریٹ میں کلرک بھرتی ہوئے اور بعد ازاں سیکرٹریٹ کی عمارت کے نگران کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اب وہ بھی فوت ہو چکے ہیں۔ تایا جی کی تین بیٹیاں اپنے خاندان ہی میں بیاہی گئی تھیں۔ بڑی بیٹی آپا اکبری کے شوہر فضل الٰہی تھے جو میری سب سے بڑی پھوپھی فاطمہ بی (عرف جیونی) کے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کا کوئٹہ میں موٹر گیراج تھا مگر وہاں زلزلے میں ان کا کاروبار تباہ ہو گیا اور وہ بلوچستان سے واپس آ گئے۔ بیوی بچوں کو سیالکوٹ میں چھوڑا اور خود کلکتہ جا کر ہاتھ دیکھنے والے نجومی کے طور پر خوب کاروبار چمکایا۔ ان کے چھوٹے بھائی فضل حق (جالی آرٹسٹ اور حمید کارٹونسٹ کے والد) پہلوانی کے ساتھ جادوگری کرتے تھے۔ بالوں سے موٹر کھینچ لیتے، دہکتے ہوئے کوئلوں پر چلتے اور اسی قسم کے سینکڑوں کرتب دکھا کر روزی کماتے تھے۔ بچپن میں میں ان کی شخصیت سے بڑا مرعوب تھا۔ انہوں نے مجھے ایک آدھ منتر بھی سکھایا اور اسے استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس منتر کو تین بار سوئی پر پڑھ کر

اسے جسم کے کسی نرم حصے میں سے بلا تکلیف اور خون بہے گزارا جا سکتا تھا۔ منتر مجھے اب تک یاد ہے:

سوئی بناں سلائی بناں
دھرتی دا اے قاصد
ناردی سوئی پٹ دادھاگہ
چلے منتر فرے واشا
دیکھاں بیر نار سنگھ تیرے علم دا تماشا

دوسری بیٹی آپا عنایت میری تیسری پھوپھی زینب (جن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی) کی سوتن کے بیٹے غلام محی الدین سے بیاہی گئی تھیں جو ریلوے انجن چلاتے تھے۔ ان کے والد پھوپھا غلام رسول بھی ریلوے میں ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے تھے۔ تیسری بیٹی آپا وسیمہ نذیر صوفی سے بیاہی ہوئی تھیں جو سیالکوٹ میں کھیلوں کا سامان بنانے کا کاروبار کرتے تھے اور میری دوسری پھوپھی طالع بی (جو جوانی ہی میں فوت ہو گئی تھیں) کے پوتے تھے۔ میری چوتھی پھوپھی کریم بی کے شوہر نے کسی طوائف سے دوسری شادی کر لی تھی جس پر وہ اپنے بچوں سمیت شوہر کو چھوڑ کر بڑے بھائی کے پاس آ گئی تھیں۔ وہ سیالکوٹ میں شیخ عطا محمد کے گھر ہی میں فوت ہوئیں۔ میرے دادا اپنی دکان پر برقعوں کی ٹوپیاں سیا کرتے اور تایا جی رڑکی میں ابتدائی تعلیم حاصل کر کے فوج میں بھرتی ہو گئے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ میرے والد کا خاندان بھی میری والدہ کے خاندان کی طرح نچلے درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان میں صرف ایک نابغۂ عصر اور یگانۂ روزگار شخص اتفاقاً یا ناگہانی یا حادثاتی طور پر پیدا ہوا اور ظاہر ہے اپنی ساری زندگی وہی شخص خاندان کی تمام تر توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اس کی موت کے بعد اس سے خاندان کا وہ تعلق ٹوٹ گیا لیکن اس کی اولاد کے امور میں دلچسپی لینا ایک قدرتی بات تھی۔

والد کی وفات کے بعد میں ان کے نافذ کردہ ڈسپلن سے آزاد ہو گیا۔ جن باتوں سے انہوں نے منع کر رکھا تھا، میں نے بڑی رغبت سے ان میں سے ہر ایک کو اپنایا۔ صحیح و غلط میں غلط اور نیکی و بدی میں بدی کا رستہ منتخب کرنا بہتر سمجھا۔ اگر سر شام گھر میں موجود رہنے کا حکم تھا تو میں آدھی رات سے پہلے گھر میں قدم نہ رکھتا۔ اگر سینما دیکھنا منع تھا تو ہر روز دو دو بلکہ تین تین شو دیکھتا۔ روزمرہ کے باورچی خانہ کے حساب لکھتے وقت پیسوں میں گھپلا کرتا، رنگ برنگی ریشمی قمیصیں، مہنگے ولایتی بوٹ اور یورپی انداز کے سلے ہوئے سوٹ، نکٹائیاں، اوورکوٹ، دستانے اور فلٹ ہیٹ زیب تن کرتا۔ اگر کبھی اچکن پہنتا تو وہ بھی بہترین درزی کی سلی ہوئی ہوتی۔ اس زمانہ میں مال روڈ پر کرپارام اچھی قمیصیں سینے میں مشہور تھا اور جہاں تک سوٹ سینے کا

تعلق ہے، اس میں دھنی رام روڈ کے سراج دین ٹیلر اور مال روڈ پر رینکن یا چیپ جان کی دکانیں تھیں۔ مال روڈ پر ہی لاہور کے مشہور ریسٹورانٹ اور ہوٹل واقع تھے۔ ان میں لورینگز جو شاہ دین بلڈنگ میں تھا، اپنی چائے اور پیسٹریوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ اسی طرح اسٹینڈرڈ اسٹیفلز، میٹرو، فلیٹیز، نیڈوز وغیرہ بھی مے نوشی، یورپی طرز کے رقص و سرود اور رات کے کھانے کے لیے معروف جگہیں تھیں۔ اسٹینڈرڈ ریگل چوک میں تھا۔ اسٹیفلز وسطی مال روڈ پر واقع تھا۔ میٹرو کی جگہ اب واپڈا کی بلڈنگ ہے۔ نیڈوز کی عمارت گرا کر اب وہاں آواری ہوٹل بن چکا ہے۔ البتہ فلیٹیز تقریباً اپنی اصلی شکل میں اب تک موجود ہے۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ والد کی زندگی ہی میں میں ساتویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا جس کے بعد گھر میں پڑھانے کے لیے سنٹرل ماڈل اسکول کے ایک استاد غلام ناصر خان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان کی توجہ سے میں نے اگلے سال نہ صرف ساتویں جماعت میں کامیابی حاصل کی بلکہ بعدازاں والد کی حیات ہی میں آٹھویں جماعت میں کامیاب ہوا اور سائنس کے پرچے میں جماعت میں اول آیا۔ والد بہت خوش ہوئے۔ انہیں یونہی خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اگر میں نے آئندہ کلاسوں میں سائنس کے موضوع پر اپنی دلچسپی برقرار رکھی اور میڈیکل ڈاکٹر بننے کا قصد کیا تو اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر مجھے وی آنا (آسٹریا) بھیجیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ والد کی وفات کے بعد میں نویں جماعت میں چڑھا۔ اسکول کے احباب میں اسلم ریاض، غلام مجدد (بعد میں چیف جسٹس ہائی کورٹ لاہور اور جج سپریم کورٹ کے طور پر ریٹائر ہوئے) محمد ذکی اور شمیم الدین (خان بہادر شیخ محمد نقی رئیس اعظم لاہور کے پوتے۔ اب دونوں فوت ہو چکے ہیں) مسعود محمود ضامن (جو بعد میں پولیس کے آئی جی مقرر ہوئے اور بھٹو کے مقدمہ قتل میں وعدہ معاف گواہ بنے) وغیرہ تو اپنی اپنی پڑھائی میں غفلت نہ برتتے تھے لیکن میرے ساتھ گھر میں ان دنوں شفیق احمد (حکیم طاہر الدین کے سب سے چھوٹے فرزند جو اب فوت ہو چکے ہیں) فرد کش تھے۔ انہیں پڑھائی سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پس ان کی معیت میں اسکول سے بھاگ کر پڑھائی کے اوقات جہانگیر کے مقبرے یا ہرن مینار پر گزارنا معمول بن گیا۔ بعض اوقات ریل کا سفر ہماری دلچسپی کا باعث بنتا اور ہم دونوں ٹکٹ لے کر گوجرانوالہ، وزیر آباد، سیالکوٹ اور جموں تک پہنچ جاتے اور جموں کے دریائے توی کے ٹھنڈے پانیوں میں نہا چکنے کے بعد لاہور واپس آتے۔

گھر میں آنٹی ڈورس اور علی بخش مجھے ڈسپلن کا پابند کرنے کی کوشش کرتے مگر میں ان کی بات کب مانتا تھا۔ کسی کا حکم مجھ پر نہ چل سکتا تھا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں والد کی وفات سے تقریباً ایک سال بعد نتیجہ نکلا اور میں نویں کے امتحان میں پھر فیل ہو گیا۔ سنٹرل ماڈل اسکول میں اب دسویں جماعت میں جا سکنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے چودھری محمد حسین نے انجمن حمایتِ اسلام میں اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے

مجھے سنٹرل ماڈل اسکول سے اٹھوا کر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ کی دسویں جماعت میں داخل کرا دیا۔ ماسٹر عباسی مجھے گھر پر میٹرک کی تیاری کرانے کے لیے رکھے گئے۔ چودھری محمد حسین کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے کبھی میرے اچھے برے میں دخل دینے کی کوشش نہ کی۔ نہ کبھی قابل اعتراض اور بری حرکتوں پر میری ملامت کی اور حکیم طاہر الدین تو ہمیشہ صرف شفقت اور محبت ہی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے بیٹوں کی طرح میں بھی انہیں میاں جی کہتا۔ کوئی جھوٹ سچ ان کے روبرو بول دو، وہ جواب میں کبھی ناں نہ کہتے تھے۔ جس خواہش کا اظہار کرتا، پوری کر دی جاتی۔ یہی صورت منیرہ کی تھی۔ چودھری صاحب اور میاں جی کو تو ایک طرف رکھیں، اس زمانہ میں اچھی کیا اگر میں بری نیت سے بھی کچھ خدا سے مانگتا تو مل جایا کرتا۔ سو بات کسی آرزو کے اچھا یا برا ہونے کی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ انسان جس بھی شے کی خواہش بے چینی سے کرتا ہے، وہ شے اسے مل جاتی ہے یعنی ذوق طلب کے پیچھے جب تک بے تابی نہ ہو، دعا پوری نہیں ہو سکتی۔

چودھری محمد حسین میرے والد کی زندگی میں ان کے دست راست سمجھے جاتے تھے۔ اسی بنا پر انہیں میرا اور منیرہ کا ولی بنایا گیا۔ آپ کا تعلق موضع پہاڑنگ اونچہ تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے سے تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ عربی فارسی اور اردو ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ شعر بھی کہتے تھے۔ والد سے ان کا تعارف غالباً ۱۹۱۸ء میں ہوا جب آپ مالیر کوٹلہ کے نواب ذوالفقار علی خان کے بچوں کے اتالیق تھے۔ والد کی نواب صاحب کے ساتھ دوستی تھی اور ان کے ہاں جاتے رہتے تھے۔ والد نے چودھری صاحب کی مخلص دیانت داری کو بھانپ لیا اور پھر ایسا اپنایا کہ مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ پنجاب سول سیکرٹریٹ کی پریس برانچ میں ملازم ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے۔ ۱۹۴۳ء میں خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ انجمن حمایت اسلام کو بھی ان کی خدمات کا فخر حاصل ہے۔ آپ میرے والد کے ساتھ جنوبی ہند کے دورے پر بھی گئے۔ ریٹائرمنٹ سے پیشتر حکومت پنجاب کے پریس کے معاملات میں مشیر تھے۔ وفات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اولاد چھ بیٹیوں اور تین بیٹوں پر مشتمل تھی۔ بڑے بیٹے نفیس سیشن جج کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ دوسرے بیٹے جلیس پولیس میں ملازم تھے مگر وفات پا چکے ہیں۔ تیسرے شاید لاہور کے کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔

ماسٹر عباسی کے پڑھانے کا انداز دوسرے استادوں سے مختلف تھا۔ وہ ایک دوست اور راز دان کی طرح پڑھائی اور کھیل دونوں میں شریک ہوتے۔ اسی طرح میرے معلم جو علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے رکن ہونے کی حیثیت سے عسکری عادات و خصائل کے مالک تھے، مجھے قرآن مجید پڑھانے اور نماز وں

میں ہماری امامت کرنے کے ساتھ ہماری معیت میں ہیرا منڈی جا کر طوائفوں کا گانا سننے یا مجرا دیکھنے پر بھی اعتراض نہ کرتے تھے۔ خاکسار تحریک ایک نیم فوجی تحریک تھی۔ ارکان خاکی کپڑے پہنتے اور بیلچے اٹھائے مارچ کرتے پھرتے۔ لیکن شاید اس کا کوئی سیاسی پروگرام نہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے سبب میرے اکثر دوست کسی نہ کسی شکل میں فوج میں بھرتی ہوتے چلے گئے۔ شفیق احمد، ان کے بھائی عزیز احمد، مسیحی دوست آرچی وغیرہ سب کے سب لاہور سے باہر چلے گئے۔ ماسٹر عباسی کی ترغیب اور میری محنت بار آور ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں میں نے میٹرک کا امتحان دوسری ڈویژن میں پاس کیا اور چودھری محمد حسین کی وساطت سے گورنمنٹ کالج کے فرسٹ ایئر میں داخل ہو گیا۔

اسی سال تایا جی فوت ہوئے۔ انہوں نے سیالکوٹ میں امام صاحب کے قبرستان میں اپنی قبر پہلے ہی سے کھدوا رکھی تھی اور عموماً وہاں جا کر قبر کی دیکھ بھال خود کرتے تھے۔ بعض اوقات اپنے ساتھ تکیہ اور اخبار بھی لے جاتے اور قبر میں لیٹ کر انہیں پڑھتے۔ میں ان کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے سیالکوٹ گیا۔ اسی قبرستان میں ان سے چند گز کے فاصلہ پر میرے دادا، دادی اور ان کے پہلو میں میری سوتیلی بہن معراج دفن ہیں۔ بعد ازاں تایا جی کے پہلو میں تائی جی کی تدفین ہوئی۔

فرسٹ ایئر میں پرانے دوست تو غلام مجدد تھے۔ عربی کی کلاس میں الطاف شیخ، احمد رضا بخاری، علی رضا، اسلم اویس اور دیگر لوگوں سے دوستی ہوئی۔ احمد رضا بخاری اور نذیر مومن تو خاصی مدت تک میرے گھر پر مقیم رہے اور ہم نے اکٹھے امتحانوں کی تیاری کی۔ ۱۹۴۲ء میں میں نے ایف اے تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا اور اسی کالج میں تھرڈ ایئر میں داخل ہوا۔ یہ درست ہے کہ لاہور میں جاگیردار طبقہ یا رؤساء کے لیے ایچی سن کالج مختص تھا لیکن اس زمانے کے گورنمنٹ کالج میں بھی جاگیرداروں کے بچے پڑھتے تھے۔ بعض ایسے مسلم اور سکھ طلباء تو کلاسوں کے پیریڈ کے وقفے میں بھی سوٹ یا موٹر کار بدل کر آیا کرتے۔ میں نے بھی اب سائیکل چھوڑ کر موٹر کار استعمال کرنا شروع کر دی اور ان طالب علموں میں شامل ہو گیا جو اپنی موٹر کار چلا کر کالج آتے تھے۔ چودھری محمد حسین اور میاں طاہر الدین نے تو اجازت دے دی لیکن اگر والد زندہ ہوتے تو ایسا یقیناً نہ ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جی۔ڈی سوندھی تھے اور میرے اساتذہ میں سے پروفیسران لطیف، سراج دین، ڈکنسن، قاضی اسلم، حمید اب تک یاد ہیں۔

اب اتنی عمر گزر جانے کے بعد جب پیچھے کی طرف مڑ کر نگاہ ڈالتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ انسان غریبی کی بجائے امیری یا نیکی کی بجائے بدی کا رستہ منتخب کرنے میں عجلت سے کام کیوں لیتا ہے؟ میرے ایک دوست ہوا کرتے تھے۔ العطاس جو ملیشیا میں جدید اسلامی مرکز کے صدر تھے اور ابن عربی کے تصور توحید وجودی کے قائل تھے۔ آپ میرے ساتھ اس بات پر اتفاق نہیں کرتے تھے کہ خدا نے انسان کو نیکی

اور بدی میں انتخاب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ ان کے خیال میں انتخاب صرف زیادہ نیکی یا کم نیکی کا رستہ اختیار کرنے کا دیا گیا ہے۔ گویا بدی یا گناہ کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ان کے بقول مولانا رومی بھی مثنوی میں اپنی معروف نظم ''معاویہ و ابلیس'' میں یہی بات واضح کرتے ہیں۔ جب ابلیس معاویہ کے سامنے اعتراف کرتا ہے کہ میں نے تمہیں صبح کی نماز وقت پر ادا کرنے کی خاطر اس لیے جگایا کہ اگر تیری نماز قضا ہو جاتی تو اس کا جو ملال تجھے ہوتا اس کا تجھے سینکڑوں گنا زیادہ ثواب مل جاتا۔ سو تمہیں زیادہ ثواب سے محروم رکھنے کی خاطر میں نے تمہیں کم ثواب کی تحصیل کے لیے جگا دیا۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ میں خدا کا عاشق ہوں اور میدانِ عشق میں انسان کو اپنا رقیب سمجھ کر اس سے حسد کرتا ہوں۔

العطاس جو بھی سمجھیں، میرے نزدیک نیکی اور بدی یا گناہ وثواب کے بارے میں ایسے عقیدے پر اعتماد کرنا چاہیے جو تخیلی ہونے کی بجائے زیادہ عملی ہو۔ بدی، شر یا گناہ کی ایک اپنی تعلیمی حیثیت ہے اور اپنی ''انا'' پر اعتماد کرنے والا انسان بدی کا رستہ اختیار کر کے اس سے چاہے تو سبق حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص جس نے گناہ نہ کیا ہو یا بدی کا رستہ اختیار نہ کیا ہو یا جو فرشتہ سیرت ہو، عموماً بے وقوف ہوتا ہے۔ کیوں بے وقوف ہوتا ہے؟ کیونکہ سادہ لوح ہوتا ہے۔ کیا خدا کے نزدیک ایک سادہ لوح انسان قابلِ ستائش ہے یا غیر سادہ لوح گنہگار جو خوف اور امید کے جذبہ کو مایوسی کے عالم میں بھی زندہ رکھتے ہوئے معافی کا طلبگار رہو؟ اس کا جواب تو خدا ہی دے سکتا ہے۔ ایک اور نکتہ جو غور طلب ہے، وہ انسان کے ذاتی عزم یا قوت ارادی سے متعلق ہے۔ یہ خصوصیت بھی انسان کو اپنی جگہ علیحدہ اور اضافی طور پر ملی ہے اور اس کا تعلق آزادیٔ انتخاب سے نہیں۔ انسان اگر بدی یا گناہ کی دلدل یا شیطان کے چنگل سے نکل سکتا ہے تو قوت ارادی یا عزم کے زور پر ہی نکل سکتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مستقل طور پر ایسی نجات پیغمبروں یا اولیاء اللہ ہی کے نصیب میں ہو۔ انسان کے لیے ایسا ممکن نہیں۔ اس کی ساری زندگی نیکی اور بدی کے راستوں پر آمد و رفت ہی میں گزر جاتی ہے۔

ایف اے میں جہاں تک مجھے یاد ہے' میرے مضامین انگریزی' عربی' جغرافیہ اور اردو تھے۔ اردو میں ''مسدس حالی'' کورس میں شامل تھی۔ عربی کے استاد غالباً مولوی کریم بخش تھے۔ وہ کالج کی مسجد میں جمعہ کی نماز کی امامت بھی کرتے تھے۔ جو اُن کی امامت میں جمعہ کی نماز ادا کرتا اسے امتحان میں پاس کر دیا کرتے۔ بی اے میں انہی مضامین کے ساتھ جغرافیہ آنرز کا موضوع بھی لیا۔ اردو میں دیوان غالب پڑھنے کا موقع ملا۔ اساتذہ میں صوفی تبسم کی شاگردی بھی اختیار کی جو کالج میں فارسی پڑھاتے تھے۔ بی اے میں میں علم کی تحصیل کے لیے شوق اور عیش و عشرت میں غرق رہنے کی تمنا کے درمیان کشمکش میں مبتلا رہا۔ میں نے ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری موٹر کار بدلی۔ عیش و عشرت کی راہ چھوڑنے کو دل نہ چاہتا

تھا۔اسی طرح علم کی تحصیل کے دوران تجسس کی تسلی کی خاطر جو ریاضت کرنا پڑتی ہے، وہ بھی اپنی طرف کھینچتی تھی۔ کشمکش کا یہ سلسلہ اب تک میری حیات کا حصہ ہے اور "کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے" یا "یہ بھی جاری ہے وہ بھی جاری ہے" کے مصداق دونوں کو چھوڑ سکنا میرے لیے محال ہے مگر علم کی تحصیل کے لیے شوق کو جو مہمیز چودھری محمد حسین نے لگائی، اس نے میری کایا ہی پلٹ کر رکھ دی۔ بی اے میں مجھے چودھری صاحب سے دیوان غالب پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اس طرح میں فکری اور غالباً روحانی طور پر ان کے زیر اثر آ گیا۔ وہ غالب اس انداز سے پڑھاتے کہ کسی شعر کے معانی کی وضاحت کرتے کرتے کسی اور ہی جانب نکل جاتے اور میں رستہ میں ان کا منتظر کھڑا رہ جاتا۔ میرے اور ان کے رشتہ کا فکری اور جذباتی پہلو اس قدر لطیف ہے کہ اسے الفاظ کے احاطے میں لا سکنا میرے لیے ممکن نہیں۔ غالب کے ذریعے میں نے اردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور ابتداء سے لے کر ترقی پسند تحریک تک پہنچا۔ غالب کے ذریعے میرے دل میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، یونانی اور روسی ادب کے مطالعہ کے لیے تجسس پیدا ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ چودھری صاحب سے اشعار غالب کی تشریح نے ہی مجھ میں فلسفہ بطور موضوع پڑھنے کا ذوق پیدا کیا۔ غرضیکہ غالب کی شاعری نے میرے لیے کئی دروازے کھول دیئے۔ چودھری صاحب نہ صرف خزینۂ غالب تک پہنچنے کی کلید ثابت ہوئے بلکہ بعدازاں جاوید نامہ میں خطاب بہ جاوید پڑھانے سے ان کی رہبری میں میرے سفر در اقبال کی ابتدا ہوئی۔ یہ میری زندگی کا وہ دور ہے جب میں نے اپنی میراث کو پانے کے لیے تگ و دو شروع کی۔ مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ میری میراث دولت یا جاہ و حشمت نہیں، علم ہے۔ علم ہی وہ میراث ہے جو مجھے باپ سے ملی ہے۔

میں نے بی اے (آنرز) کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ آنرز جغرافیہ میں حاصل کی کیونکہ اس کے دو اضافی موضوع پولیٹیکل جغرافیہ اور فزیکل جغرافیہ مجھے دلچسپ لگے۔ پولیٹیکل جغرافیہ میرے لیے نیا موضوع تھا کیونکہ اس کا تعلق کسی ریاست کے وجود میں آنے، اس کے بچپن، بلوغت، ادھیڑ عمر، بڑھاپے اور موت تک پہنچنے سے تھا۔ نیز اگر کسی ریاست کی احیاء ممکن ہو تو کیسے عمل میں آتی ہے۔ اس موضوع کے مطالعہ سے مجھے جوان، بوڑھی، شرارتی، بدمعاش سب قسم کی ریاستوں کی خصوصیات سے شناسائی کا موقع ملا۔ فزیکل جغرافیہ کرۂ ارض کی عمر کا تعین اور اس کے باطن کا مطالعہ کرتا ہے۔ میری نظر میں یہ موضوع اس لیے اہم تھا کہ جس زمین پر ہم رہتے ہیں، اس کے ظاہر اور باطن سے پوری طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ارض کی کششِ ثقل کے سبب ہم اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں لیکن ارضی حوادث میں سب سے عظیم حادثہ زلزلہ ہے جس کو آنے سے روک سکنا ہمارے بس میں نہیں۔ انسانیت کے لیے قحط، سیلاب، طوفان، وبائیں کئی ایسے دکھ ہیں جن کے تدارک کے لیے مذہب آج تک سوائے دعا کی تلقین کرنے کے کوئی حل پیش نہیں کر سکا۔

۱۹۴۵ء میں ایم اے میں داخلہ کے لیے میں نے انگریزی ادب کا موضوع منتخب کیا۔ جن اساتذہ سے میں نے ایم۔اے میں انگریزی پڑھی، وہ سراج دین، اشفاق احمد، لطیف اور ڈکنسن (سب فوت ہو چکے ہیں) تھے۔ اسی سال سے میں نے علم کی تحصیل کی خاطر صحیح معنوں میں تگ و دو شروع کی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ احباب کو گھر میں بیٹھے خوش گپیاں لگاتے چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں چلا جاتا اور پڑھنے لگتا۔ اتنی دیر واپس نہ آتا جب تک میری پڑھائی کا کام ختم نہ ہو جاتا۔ اردو ادب کے بعد انگریزی ادب کے مطالعہ نے میرے قلب و ذہن کو بڑی وسعت عطا کر دی۔ اسی وسعت نے اخلاقی طور پر میری فطرت میں چھپی ہوئی عجز کی خصوصیت کو اجاگر کیا اور ذاتی تکبر کی خصلت کا اظہار میں نے صرف متکبر کے روبرو کرنے تک محدود کر دیا۔ انہی ایام میں میری تخلیقی تحریروں کے تجربے مضمونوں یا افسانوں کی شکل میں کالج کے ادبی رسالہ راوی کی زینت بننے لگے۔ میری پہلی کوشش ایک افسانہ تھا جس کا تعلق ''کووں'' سے تھا۔ یہ افسانہ غالباً ۱۹۴۵ء میں راوی میں چھپا۔ اس زمانہ میں اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا سب سے اہم نقیب رسالہ ''ادب لطیف'' تھا جس کے مدیر احمد ندیم قاسمی تھے۔ بعض اور رسالے بھی دہلی اور بمبئی سے نکلے مگر وہ اتنے مقبول نہ ہوئے۔ میں نے کبھی لاہور کی کسی ادبی محفل میں شرکت نہیں کی۔ میں ترقی پسند تحریک کی سیاست سے تو متاثر نہ ہوا مگر ادب میں اظہار کی نئی راہوں کی تلاش تک میں نے ترقی پسندی قبول کی۔ چونکہ میں فطرتاً جدت پسند تھا، اس لیے ادب، فکر یا زندگی کے کسی بھی شعبہ میں فرسودگی کو قبول کر لینا میرے لیے ناممکن تھا۔ انگریزی ادب کی تعلیم کے دوران جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ یونانی ڈرامہ یا دوسرے الفاظ میں یونانی تصور ''المیہ'' (ٹریجڈی) تھا، لہٰذا میں نے ارسطو کے رسالہ بوطیقا کے موضوع پر نہ صرف ایک مدلل مضمون شائع کیا بلکہ اردو ادب کی مختلف صنفوں میں سے ڈرامہ نویسی کو اپنا لینے کی کوشش کی۔ نئے ادبی تجربات پر مبنی میرے ڈرامے، افسانے وغیرہ ادب لطیف یا دیگر ترقی پسند رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ بعض ڈرامے آل انڈیا ریڈیو نے کئی بار اپنے مختلف مرکزوں سے نشر بھی کئے۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ بعد ازاں محمد حنیف رامے نے بھی رسالہ ''نصرت'' نکالا اور اس زمانہ میں ایک بار وہ سائیکل پر سوار ہو کر میرے گھر تشریف لائے اور میرا طویل انٹرویو شائع کیا۔

میری زندگی کے یہ چند سال کئی اعتبار سے بڑے اہم تھے۔ مثلاً ادبی نقطہ نگاہ سے میں یونانی تصور ''المیہ'' سے کیوں متاثر ہوا؟ میں نے ادب کی مختلف صنفوں میں سے ڈرامہ نویسی کو کیوں چنا؟ ان ایام میں میری نسل کے مسلمان طلباء کی سیاسی زندگی میں کس قسم کا انقلاب آ رہا تھا؟ لاہور میں ہندو مسلم فسادات کا مجھ پر اور میری تحریروں پر کیا اثر پڑا؟ قیام پاکستان کے بعد اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے بارے میں میرے دل میں کس نوعیت کے شکوک پیدا ہوئے؟ فلسفہ کے مطالعہ سے میری فکری زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

''المیہ'' کا تعلق بہ حیثیت مجموعی انسانی زندگی کے آلام یا اس کی محرومیوں سے ہے اور اس کی جھلک اردو، فارسی، عربی، ترکی سب زبانوں کے ادب میں نظر آتی ہے مگر یونانیوں کے ہاں ''المیہ'' کے تصور کا اصل سبب ان کا مذہب تھا۔ ان کے عقائد کے مطابق لاتعداد نر اور مادہ خدا کوہ المپاس میں رہتے تھے۔ وہ کبھی آپس میں لڑتے جھگڑتے، کبھی معاشقے کرتے اور کبھی ایک دوسرے کے رفیق کار بن جاتے تھے مگر جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، وہ ان سب کے لیے محض کٹھ پتلیاں تھے۔ چونکہ خدا بنیادی طور پر بیکار بیٹھے رہتے تھے، اس لیے اپنے آپ کو محظوظ کرنے کی خاطر ان کٹھ پتلیوں میں سے کسی اہم کٹھ پتلی (ہیرو) سے فاش غلطی (ہمارطیہ) کا ارتکاب کروا دیتے اور یوں ''ہیرو'' ایک غلطی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری غلطی کا مرتکب ہوتا چلا جاتا۔ انجام کار سب غلطیاں اس کی اپنی' خاندان' قبیلہ یا قوم کی تباہی کا باعث بنتیں۔ یہ کیفیت خداؤں کے لیے تو محظوظ ہونے، ہنسنے یا آپس میں ٹھٹھا مذاق کرنے کا موقع فراہم کرتی لیکن انسانوں کے لیے ماتم، رونے یا آہ و بکا کا ماحول پیدا کرنے والا ''المیہ'' بن جاتی۔ یونانی ''المیے'' منظوم ڈرامائی یا تمثیلی شکل میں لوگ عموماً کھلے (اوپن ایئر) تھیٹروں میں دیکھتے اور غم واندوہ کی داستانیں انہیں رلا دھلا کر ان کے جذبات کا بوجھ ہلکا کر دیتیں۔

مجھے یہ سوال اکثر تنگ کیا کرتا تھا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ اور طب ایسے علوم کو عربی میں منتقل کیا۔ علم ہندسہ ہندوؤں سے سیکھا اور اسے اپنا لیا۔ غرضیکہ اپنے اردگرد کی تہذیبوں سے جو کچھ بھی مفید یا انوکھا دکھائی دیا، اسے لے کر اپنے مخصوص رنگ میں پیش کر دیا مگر یونانی المیوں کے تراجم عربی زبان میں کیوں نہ کیے گئے؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ ''المیے'' بظاہر تو انسانی محرومیوں کی داستانیں تھیں اور ان کا تعلق مذہب کی بجائے ادب سے تھا لیکن ان کے باطن میں ایک ایسا الٰہیاتی تصور موجود تھا جو مسلمانوں کے لیے جاہلی کفریات وخرافات پر مبنی تھا۔ قرون وسطیٰ کے مسیحی یورپ میں بھی مدتوں تک ان المیوں کو کفریات سمجھ کر ہاتھ نہ لگایا گیا بلکہ کیتھولک عقیدے کے مطابق ''اخلاقی کھیل'' پیش کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ عوام میں مسیحی اخلاقی قدروں کی تشہیر ہو سکے۔ (یہ صورت تقریباً ویسی ہی تھی جیسے شیعہ ایران میں حادثہ کربلا کو تمثیلی اشکال میں پیش کر کے اسلامی تہذیب میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا) یورپ میں تو یونانی ''المیوں'' کی ادبی قدر و منزلت تحریک اصلاح دین اور اس کے بعد تحریک احیائے علوم کے زمانوں میں پہچانی گئی۔ جب یورپی تہذیب تاریک عہدوں سے نکل کر روشن خیال عہد میں داخل ہو رہی تھی۔ آج دنیا کے عظیم ڈرامہ نگاروں میں قدیم یونان کے سافوکلیز، برطانیہ کے شیکسپیئر اور ناروے کے ابسن کے نام لیے جاتے ہیں۔

ابسن کا کمال تھا کہ اس نے ''المیہ'' کے ذریعہ اپنی قوم کو بدلتے ہوئے زمانہ کا احساس دلایا اور اس کے ڈرامے سکینڈے نیویا کے قدامت پسند لوتھروی معاشرے میں روشن خیال انقلاب لانے کا سبب

بنے۔ میں بھی یہ خواب دیکھا کرتا تھا کہ ڈرامہ نویسی کے ذریعے شاید اپنے معاشرے میں ایسا ہی ثقافتی انقلاب لاسکوں۔ کیا ایک معاشرے کے تغیر قبول نہ کرنے کی ضد ایک ''المیہ'' نہ تھا؟

ابسن سے تو نثری ڈرامہ نویسی کی ابتداء ہوتی ہے مگر منظوم ڈرامہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جو الہامی یا آفاقی شاعری کے زمرے میں آسکتی ہے۔ مثلاً مثنوی رومی کی ڈرامائی نظمیں، گوئٹے کا ڈرامہ فاؤسٹ یا اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ بات اصل میں یہ ہے کہ بعض اوقات خدا نابغۂ روزگار انسانوں سے ہمکلام ہوتا ہے اور بقول غالب انہیں غیب سے مضامین ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ یہ گفتگو مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے۔ جب یہ ہمکلامی کسی پیغمبر سے ہو تو وحی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اگر ولی سے ہو تو کشف کی اور اگر کسی شاعر سے ہو تو القا کہلاتی ہے لیکن یہ ہمکلامی صرف انبیاء، اولیا اور شعراء تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں مائیکل اینجلو جیسے مجسمہ ساز بھی آجاتے ہیں۔ مائیکل اینجلو کے متعلق مشہور ہے کہ مجسمہ تراشنے سے پیشتر وہ چٹان موقع پر رکھوالیتا۔ پھر چند گز کے فاصلے سے اس پر نگاہ ڈالتا اور اسے مطلوبہ مجسمہ گھڑا گھڑایا چٹان کے اندر دکھائی دینے لگتا۔ بعدازاں وہ چٹان پر چڑھ کر سنگ تراشی شروع کرتا اور تب تک نیچے نہ اترتا جب تک مجسمہ مکمل طور پر نہ تراش لیتا۔ اسے پتھر کے اندر مجسمہ اسی طرح نظر آجاتا جیسے کسی شاعر کے ذہن میں بنا بنایا شعر نازل ہو جائے۔

ڈرامہ نویسی میں میرے تجربات زیادہ تر ''اظہاریت'' کی اس جرمن ادبی تحریک سے متاثر تھے جس نے مغربی دنیا کے ڈرامہ نویسوں کو اظہار کی نئی راہیں تلاش کرنے کی ترغیب دی تھی۔ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ ''المیہ'' انسان کے ظاہر و باطن میں تضاد سے وجود میں آتا ہے، اس لیے ڈرامہ میں کردار کی صرف ظاہری صورت ہی پیش نہ کی جائے بلکہ اس کی ایکسرے پورٹریٹ دکھائی جائے تاکہ انسان کے ظاہر و باطن کے تضاد کو واضح کیا جاسکے۔ افسوس ہے کہ اردو ادب میں نہ تو ''نظریات'' کا ڈرامہ موجود ہے، نہ اسٹیج ہے جس پر اسے پیش کیا جاسکے۔

بہرحال مجھے صرف ڈرامہ نویسی کا شوق ہی نہ تھا بلکہ جہاں موقع ملے ایکٹنگ کرنے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ اس ضمن میں ایک بار گرمیوں کے موسم میں میں اور میرے احباب جن میں عزیز احمد، نذیر اے سید، افضل اقبال، مظہر (سب فوت ہو چکے ہیں) وغیرہ اتفاق سے شملہ میں موجود تھے۔ میں نے انہیں اکسایا کہ ٹیگور کے ڈرامہ ''پوسٹ آفس'' کا اردو ترجمہ کر کے اسٹیج کیا جائے۔ چنانچہ ہم سب نے مل کر ''پوسٹ آفس'' کا اردو میں ترجمہ کیا اور اسے شملہ کے کالی باڑی ہال میں تین روز کے لیے اسٹیج کیا۔ میں نے اس ڈرامہ میں امل کا کردار ادا کیا۔ ڈرامہ اتنا مقبول ہوا کہ ہمیں لوگوں کے اصرار پر تین دن مزید بڑھانے پڑے۔

پاکستان بننے سے پیشتر گرمیوں میں بعض اوقات شملہ جانے کا موقع مل جاتا۔ میرے تعلقات

ہماری لدھیانہ والی سوتیلی والدہ مرحومہ کے خاندان سے بدستور قائم تھے۔ ان میں عبدالباری اور عبدالرحیم (ڈیمو) تو میرے اور فرزندان حکیم طاہرالدین کے دوست تھے۔ خالہ زہرہ اور خالہ عائشہ، لدھیانے والی والدہ مرحومہ کی چچیری بہنوں کی کوٹھیاں شملہ میں موجود تھیں اور ان کی دعوت پر ان کے ہاں جا کر ٹھہرتا۔ کوٹھیوں میں سے ایک جس کا نام ہائیڈ ویل تھا ''بھاری'' تھی۔ وہاں کسی زمانے میں ایک انگریز پادری کی رہائش تھی جو قتل کر دیا گیا تھا۔ بعض اوقات اتوار کی رات اس کی روح وہاں آیا کرتی اور گھر کے دروازے کھٹکنے لگتے۔ اگر کوئی ایک دروازہ کھول دیا جاتا تو سکوت طاری ہو جاتا۔ ایک رات میں اور عزیز نچلے بیڈروم میں سوئے ہوئے تھے اور ان دنوں صرف ہم دو ہی گھر میں مقیم تھے۔ اچانک برآمدے میں لکڑی کے فرش پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد ہمارے دروازے پر کھٹکا ہوا جیسے کوئی چھڑی سے اسے کھٹکھٹا رہا ہو۔ ہم دونوں جاگ اٹھے۔ دروازے کے پیچھے تیز روشنی تھی۔ گویا کسی نے پہاڑی سڑک پر موٹر کار کھڑی کر کے بتیاں جلا دی ہوں حالانکہ وہاں کوئی موٹر کار نہ آ سکتی تھی۔ اس روشنی میں دروازے کے اندھے شیشوں سے ہمیں ایک شبیہ نظر آئی جو سیاہ گاؤن اور ہیٹ میں ملبوس تھی۔ عزیز کا پلنگ دروازے کے قریب تھا اور وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہا۔ ''یس، یور ہائی نس! کم اِن کم اِن پلیز۔ آئی اوپن دی ڈور فار یو سر! کم اِن!!'' اتنے میں اپنی رضائی سے نکل کر وہ دروازے کی طرف لپکا اور اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھول دیا۔ پل بھر میں روشنی غائب ہو گئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

جاوید منزل کے انتظام میں ایک اہم تبدیلی آئی۔ آنٹی ڈورس کچھ تو مجھے ڈسپلن نہ کر سکنے کی وجہ سے نالاں تھیں۔ اسی دوران علی گڑھ سے ان کی بہن نے اطلاع دی کہ کوئی پروفیسر ان سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے۔ وہ پروفیسر کو دیکھنے کی غرض سے چند دنوں کے لیے علی گڑھ گئیں اور پھر منیرہ کو خط میں بتایا کہ پروفیسر سے شادی کرنے کے بعد وہ شاید لکھنو چلی گئی ہیں۔ چودھری محمد حسین نے بڑی کوشش کی کہ منیرہ کے لیے کسی اور مسلم یا غیر مسلم خاتون اتالیق کا بندوبست کر دیا جائے مگر جب کوئی مناسب خاتون نہ مل سکی تو منیرہ کوئین میری کالج کے ہوسٹل میں منتقل ہو گئیں۔ میں یا بھائی مختار انہیں ملنے کے لیے دوسرے تیسرے روز جایا کرتے اور جس شے کی انہیں ضرورت ہوتی، مہیا کر دی جاتی۔ وہ تقریباً سال دو سال ہوسٹل ہی میں مقیم رہیں اور دسویں جماعت تک پہنچ گئیں لیکن ہوسٹل میں رہنا انہیں پسند نہ تھا۔ کالج گراؤنڈ کی ایک طرف کسی بزرگ کا مزار تھا۔ منیرہ قریب سے گزرتیں تو دعا کیا کرتیں کہ بزرگو! مجھے اپنے گھر بھیجو، میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ منیرہ کی دعا قبول ہوئی۔ آنٹی ڈورس نے اپنے شوہر سے طلاق لی اور واپس ہمارے پاس آ گئیں۔ آنٹی ڈورس نے دوبارہ شادی کا تجربہ کیا لیکن کامیاب ازدواجی زندگی گزارنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔

میرے احباب میں پرانوں کے علاوہ چند نئے دوستوں کا اضافہ ہوا۔ ان میں غلام اصغر خان لغاری (پولیس میں کپتان یعنی ایس پی تھے لیکن فرسٹ ایئر میں میرے ساتھ پی ٹی کی کلاس میں تھے) منور حسین بخاری (ہیڈ ماسٹر) ارزانی، بھائی رفیع اور بھائی مختار شامل تھے۔ اسی طرح حکیم طاہر الدین کی وفات کے بعد ان کے فرزند بشیر احمد ہمارے ولی بنے۔ وہ ہمارے ولی ہی نہ تھے بلکہ مجھ سے عمر میں بڑے ہونے کے باوجود میرے بے تکلف دوست بھی تھے۔ آنٹی ڈورس کی عدم موجودگی میں کچھ مدت تک وہ اور ان کی بیگم ہمارے گھر میں مقیم بھی رہے۔ دوستوں کے اس گروپ کا نام بشیر احمد نے ''درویش گروپ'' رکھا ہوا تھا۔ ''درویش'' اچھے اور برے کاموں میں عموماً من حیث الگروپ شریک ہوتے۔ میری تمام تحریریں وغیرہ چھپنے سے پہلے یہی گروپ انہیں سنتا، اصلاح کرتا اور پاس کرتا تھا۔ اس بازار میں گانا سننے یا مجرا دیکھنے بھی اکٹھے جاتے تھے۔ بھائی رفیع (جنہیں ہم سب مین وودی گولڈن ہارٹ کہتے تھے) اپنی شاہ خرچی کے سبب اور بھائی مختار اپنے مردانہ حسن اور خوش لباسی کے سبب طوائفوں میں بڑے مقبول تھے۔ باقی ہم تو ان کے ساتھ محض ''شامل واجا'' ہوا کرتے۔ اسی طرح ہمارے ایک اور تماش بین بزرگ عاشق بھی ہوا کرتے تھے۔ اب ان سب حضرات میں سے کوئی بھی زندہ نہیں۔ خدا ان سب کے گناہ معاف کرے۔ میں نے جن احباب کے نام لیے ہیں۔ ان میں عزیز احمد سمیت سب ڈرپوک لوگ تھے اور کسی سے لڑنے وڑنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے مگر میں فطرتاً ناانصافی یا کسی قسم کے ظلم کے خلاف صرف آواز اٹھانے پر ہی اکتفا نہ کرتا بلکہ ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ (میرے احباب میں ہمارے ولی بھائی اعجاز احمد کے فرزند تحسین مرحوم تو باقاعدہ ورزش کرتے اور کسی سے مار کٹائی میں ہمیشہ پہل کیا کرتے تھے۔ میرے خاندان میں تایا جی کے بعد سب سے زیادہ ''ہتھ چھٹ'' تو وہی تھے۔ دوسرے دوست راجہ ظہور اختر تھے۔ میری ذات کے لیے ان کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کے کان میں بھنک بھی پڑ جاتی کہ کسی نے مجھے میلی آنکھ سے دیکھا ہے تو وہ بغیر مجھ سے پوچھے صرف اسی بات پر اسے ''پھینٹی'' لگا دیتے۔)

ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ہم سب بازار حسن میں گانا سن چکنے کے بعد رات گئے لوٹ رہے تھے۔ بازار میں ہنگامہ سا تھا۔ ایک بدمعاش ٹانگہ کے کوچوان کو اسی کے چابک سے بڑی بے دردی سے پیٹ رہا تھا اور کوچوان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ چابک کا بیت ریزہ ریزہ ہو گیا لیکن بدمعاش نے کوچوان کو نہ چھوڑا بلکہ ساتھ ہی دودھ دہی کی دکان سے ابلتے دودھ کی کڑاہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کوچوان کے اوپر انڈیل دی۔ اس کی چیخ وپکار سے لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ مگر یہ ظلم دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ بدمعاش کو گریبان سے پکڑا اور پلک بھر میں دائیں ہاتھ سے ایک مکہ اس کے پیٹ پر مارا اور پھر بائیں ہاتھ سے دوسرا مکہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رسید کیا۔ بدمعاش اس اچانک حملہ سے اتنا

بدحواس ہوا کہ ناک آؤٹ ہو کر گھوڑے کے قریب کیچڑ بھری زمین پر گر گیا۔ یہ صورتحال دیکھ کر میرے دوست سخت پریشان ہوئے۔ فوراً قریب کھڑی موٹر کار میں مجھے دھکیلا اور وہاں سے فرار ہو گئے۔ گیارہ بارہ برس گزرنے پر جب میں نے انگلستان سے ڈاکٹریٹ اور بار کے امتحان پاس کرنے کے بعد خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے ساتھ وکالت کا آغاز کیا تو ایک دن یہی بدمعاش صاحب خواجہ صاحب کے دفتر میں ان کے موکل کی حیثیت سے موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے جواب میں ارشاد کیا۔ ''جی! ڈاکٹر صاحب کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میرے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ میں نے ان کے ہاتھوں مار کھائی ہے۔''

۱۹۴۰ء میں لاہور کے منٹو پارک میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو میری عمر تقریباً سولہ برس تھی اور میں نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ قرارداد پاکستان منظور ہونے کی خبر سے تو ہر مسلم طالبعلم متاثر تھا مگر میں شاید امتحانات کی مصروفیت کے سبب اس موقع پر منٹو پارک کے عظیم الشان جلسہ میں شریک نہ ہو سکا۔ قرارداد پاکستان کی منظوری کی خبر لاہور میں آگ کی طرح پھیلی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان زور پکڑتی چلی گئی اور اسکولوں اور کالجوں کے مسلم طلباء جوق در جوق اس کا دم بھرنے لگے۔ غالباً ۱۹۴۶ء میں میرے دو اہم انگریزی مضمون ''ڈان'' اخبار میں شائع ہوئے۔ ایک کا عنوان ''قائداعظم ایک عظیم انسان'' تھا جس میں میں نے کارلائل کے تصور ''اوور مین'' (برتر انسان) کی روشنی میں ثابت کیا تھا کہ کس طرح قائداعظم عام انسانوں سے برتر ہیں۔ دوسرے مضمون ''اسلام اور پاکستان'' میں میرا موقف تھا کہ پاکستان کا تصور اسلام کی کسی روایتی فرقہ وارانہ تعبیر پر نہیں بلکہ اصلاحی تعبیر پر مبنی ہے۔ دونوں مضمون قائداعظم کی نظروں سے گزرے اور بقول ان کے سیکرٹری کے انہوں نے مضامین کو پسند فرمایا۔

تحریک پاکستان کے زور پکڑنے کے ساتھ ساتھ پنجاب میں اس کی حکومتی مخالفت بھی بڑھنے لگی۔ چنانچہ خضر حیات کی یونینسٹ حکومت نے پنجاب میں مسلم لیگی کارکنان کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اسی طرح واحد مسلم لیگی انگریزی اخبار ''ڈان'' کے پنجاب میں داخلہ پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ نتیجہ میں اکثر مسلم طلباء کے گروہوں نے اپنے گھروں میں بیٹھے خفیہ طور پر ''وائس آف اسلام'' کے نام سے اخبار جاری کئے جو مسلم لیگی کارکنان کی گرفتاریوں کی خبریں شائع کر کے باقاعدہ عوام میں تقسیم کئے جاتے تھے۔ میرے گھر جاوید منزل میں بھی یار دوست یہی کام کرتے تھے۔ ان میں پیش پیش اسلم ریاض (جن کے گھر میں ان کی والدہ بیگم سلمیٰ تصدق حسین کے مسلم لیگی لیڈر ہونے کے سبب سیاسی طور پر ہر وقت بڑی گہما گہمی رہتی تھی) محمد ذکی، شمیم الدین، الیاس مسعود (معروف ہومیو پیتھک ڈاکٹر مسعود کے فرزند) شیخ

خورشید احمد، ایم بی زمان اور چند دیگر احباب بھی تھے۔ محمد ذکی یا شمیم الدین روزانہ رات کی گاڑی سے لاہور سے دہلی جاتے اور ''ڈان'' اخبار کی سینکڑوں کاپیاں صندوقوں میں بھر کر وہاں سے دن کی گاڑی پکڑ کر رات لاہور واپس آ جاتے۔ اگلے روز ہم لوگ اخبار کی کاپیاں لاہور میں تقسیم کر دیتے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا۔

۱۹۴۶ء میں اچانک مجھے ایک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایم اے (انگریزی) کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ میری تیاری میں تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ فیل کیوں ہوا۔ عین ممکن ہے کہ انگریزی ادب کی تاریخ، شاعری ڈرامہ، ناول، تنقید نویسی وغیرہ کے بارے میں میرا نقطہ نظر جو عموماً انوکھا ہوا کرتا تھا، ممتحن کو پسند نہ آیا ہو۔ چودھری محمد حسین سے میں نے شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ بعض اوقات آگاہی کا تکبر انسان کی ناکامی کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے علم کی تحصیل کے دوران عجز کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ میرا ارادہ ایم اے (انگریزی) کے بعد ہر قیمت پر ایم اے (فلسفہ) کرنے کا تھا۔ پس میں نے گورنمنٹ کالج کے فلسفہ کے پروفیسروں قاضی اسلم اور عبدالحمید سے مشورہ کرنے کے بعد ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لے لیا۔ پہلے سال بغیر کسی تیاری کے میں نے دوسری بار ایم اے (انگریزی) کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہو گیا۔ بعدازاں میری تمام تر توجہ فلسفہ کی طرف مبذول ہو گئی۔

۱۹۴۶ء کے اواخر ہی سے ہندو مسلم یا سکھ مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ لاہور میں ہر شام کرفیو لگتا اور قتل عموماً کرفیو لگنے سے چند منٹ قبل ہوتے۔ قاتل باقاعدہ ہلمٹ پہن کر واردات کرتے جیسے کوئی فوجی آپریشن ہو رہا ہو۔ ہمارے علاقہ میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی تھی، اس لیے اگر کوئی اکا دکا سکھ یا ہندو سائیکل سوار میو روڈ پر بھاگم بھاگ اپنے گھر مغلپورہ کی جانب جا رہا ہوتا تو چند ہی لمحوں بعد اس کی چیخ و پکار سنائی دیتی یا لاش سڑک پر تڑپتی ہوئی نظر آتی۔

''جاوید منزل'' کے ساتھ میرے والد کے زمانہ کی دو دکانیں تھیں جو شاید بیس روپے ماہوار کرایہ پر دی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو مسلمان درزیوں نے لے رکھی تھی۔ دوسری میں ہندو بنیا آٹے دال وغیرہ کا کاروبار کرتا تھا۔ درزی تو کرفیو لگنے سے گھنٹوں پہلے دکان بند کر کے چلے جاتے مگر بنیا اپنے دس سالہ لڑکے سمیت دکان پر قدرے دیر تک بیٹھتا۔ کہتا تھا کہ مجھے یہاں سب جانتے ہیں، اس لیے مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے اصرار پر باپ بیٹا رات کو تو ہمارے دیگر ملازموں کے ساتھ احاطے کے اندر ہی سونے لگے لیکن بنئے کا ایک پرابلم تھا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود ہر شام رفع حاجت کے لیے سڑک پار کر کے ریلوے ہیڈ کوارٹر کے اندر ہندو بیت الخلاء میں جاتا۔ بقول اس کے مسلم بیت الخلاء میں اس کی حاجت رفع

نہ ہوتی تھی۔ ایک شام اسی طرح کرفیو لگنے سے پیشتر اس نے لڑکے کو اندر بند کر کے دکان کو قفل لگایا اور بمطابق معمول رفع حاجت کے لیے ہندو بیت الخلاء کی جانب نکل گیا مگر چند ہی لمحوں بعد اس کی چیخ و پکار سن کر ہم سب بھاگتے ہوئے کوٹھی کے گیٹ پر پہنچے۔ خون سے لت پت اس نے اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اس نے سڑک عبور کی اور ''جاوید منزل'' کے گیٹ تک پہنچ کر گر گیا۔ اپنی واسکٹ کی جیب سے پانچ ہزار روپے کے نوٹ اور دکان کی چابیاں نکال کر مجھے پکڑائیں اور صرف اتنا کہا کہ بیٹا دکان میں بند ہے۔ اتنے میں کرفیو لگ گیا اور ہر طرف سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ چند ملازموں نے بنئے کو اٹھایا اور بھاگتے ہوئے قریب ہی ریلوے کے ہسپتال میں لے گئے۔ ہم نے لڑکے کو دکان سے باہر نکالا اور آنٹی ڈورس اور منیرہ نے اسے کھانا کھلا کر اپنے کمرے میں سلا دیا۔ رات گئے ہمیں معلوم ہوا کہ بنیا ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ چند ہفتوں کے بعد اس کی بیوی آئی اور بیٹا اور روپے لے کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں چلی گئی۔ کیمپ میں لاہور کے کئی ہندو اور سکھ خاندانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ مثلاً ڈاکٹر جمعیت سنگھ آنجہانی جو میرے والد کے معالج تھے اور ان کی وفات کے بعد جب تک زندہ رہے، ہمارا علاج معالجہ بلا معاوضہ کرتے رہے۔ ان کی بیوی تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھیں، شاید دو بیٹیاں تھیں۔ ہم نے علی بخش کے ذریعہ انہیں اپنے گھر میں قیام کرنے کی دعوت بھیجی کیونکہ ایبٹ روڈ، جہاں ڈاکٹر جمعیت سنگھ کی کوٹھی تھی، غیر محفوظ جگہ تھی لیکن معلوم ہوا کہ وہ کیمپ میں چند روز گزارنے کے بعد فوج کی حفاظت میں دیگر پناہ گزینوں کے ساتھ دہلی چلی گئی ہیں۔

ہر حساس پڑھے لکھے شخص پر خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، فسادات نے گہرا اثر چھوڑا۔ یہ بات تو کسی کے ذہن میں بھی نہ تھی کہ پاکستان کے وجود میں آنے پر اتنی جانوں کی قربانی دینا پڑے گی۔ علامہ اقبال نے نذیر نیازی کے نام ایک خط میں اپنے خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء) کی وضاحت کرتے ہوئے صاف تحریر کر دیا تھا کہ میری مجوزہ مسلم ریاست میں مطالبہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں اقتدار کی تقسیم کا ہے۔ اس کا کوئی تعلق آبادیوں کے تبادلے سے نہیں۔ اسی طرح قائداعظم محمد علی جناح کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی خون ریزی کے بعد پاکستان بنے گا۔ بہرحال فسادات کا جو اثر میرے شعور پر پڑا، اس کا اظہار نئے انداز میں تحریر کردہ میرے ایک افسانہ ''بحران'' میں کیا گیا ہے جو اس زمانہ میں کسی ترقی پسند رسالے میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ''چیچک''، ''سفر'' اور چند دیگر ڈرامے بھی اسی بیمار ذہنی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ڈرامے آل انڈیا ریڈیو پر نشر بھی ہوئے۔ بعض میں تو اس زمانے کے معروف ڈرامہ نویسوں امتیاز علی تاج مرحوم اور رفیع پیر مرحوم نے حصہ بھی لیا۔

فسادات یا انسانی بربریت کے پس منظر میں فلسفہ کا موضوع میرے لیے ایک طرح کی راہ فرار

تھی۔ میں نے فلسفہ بحیثیت مضمون پہلے کبھی نہ پڑھا تھا مگر یوں محسوس ہوتا تھا گویا مابعد الطبیعات، اخلاقیات اور فلسفہ بحیثیت مجموعی میری رگ رگ اور نس نس میں ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں فطرتاً اس موضوع سے کس قدر مانوس ہوں مگر باوجود اس کے کہ فلسفہ کی رہبری میں میں اپنے آپ کو پہچان سکتا، میرے لیے وہ ذہنی طور پر مزید مشکلات کا باعث بنا۔ اول تو یہ کہ خدا کے وجود سے متعلق عقلی یا منطقی دلیلیں عقل اور منطق ہی نے منہدم کر رکھی ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ مسلمانوں کا علم کلام خدا کا وجود ثابت کرنے کے بارے میں زیادہ تر دلیل غائی پر انحصار کرتا ہے۔ مختصراً اس دلیل کی بنیاد علت و معلول کے نظام پر رکھی گئی ہے یعنی کائنات یا حیات میں ہر ہونے والے واقعہ یا معلول کے پیچھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبب یا علت ہوتی ہے۔ یہ علت و معلول کا سلسلہ بالآخر آخری علت یا علت اولیٰ یا علت العلل جو کسی دوسری علت کا معلول نہیں پر ختم ہوتا ہے۔ یہ آخری علت خدا ہے جو کسی علت کا معلول نہیں۔ علم کلام ترتیب دینے والے بزرگوں کو یقیناً علم ہوگا کہ علت و معلول کا سلسلہ آخری علت پر ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ کیوں نہ علت العلل کو کسی اگلی علت کا معلول سمجھا جائے؟ ایسی بودی دلیل طالب علموں کے سامنے مدرسوں میں پیش کرنے کا کیا فائدہ جس سے ہم علل متناہیہ کے ایک لامتناہی سلسلہ میں مقید ہو کر رہ جائیں۔ باقی عقلی دلیلیں کونی، وجودی وغیرہ بھی بیکار تھیں۔ اس لیے خدا کو ماننے کے لیے غیب پر ایمان رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

مگر درحقیقت جو سوال میرے لیے مشکلات کا باعث بنا، اس کا تعلق خدا سے نہ تھا بلکہ میری اپنی ذات سے تھا۔ میرے پاس اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے جو ذرائع علم موجود ہیں، وہی قابل اعتماد نہیں۔ عقل بطور ذریعہ تحصیل علم اپنی جگہ پر محدود ہے اور اس کے ذریعہ حاصل کردہ معلومات میں کسی نہ کسی خامی یا غلطی کا امکان ہے۔ فلسفی کانٹ نے یہ حقیقت واضح کر رکھی ہے کہ مجھے صرف ''عملی عقل'' ملی ہے جو روزمرہ کے مسائل کو سلجھانے کے لیے کام میں لائی جا سکتی ہے مگر الٰہیات، خدا کی ذات، کائنات، حیات یا اپنے آپ کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ''خالص عقل'' درکار ہے جو میری دسترس سے باہر ہے۔

دوسرا اہم ذریعہ حواس کی مدد سے حاصل کردہ علم ہے جس کا تعلق تجربے، مشاہدے یا پیمائش وغیرہ سے ہے مگر یہ ذریعہ بھی قابل اعتماد نہیں کیونکہ مشاہدہ بھی غلط یا خام معلومات بہم پہنچا سکتا ہے اور سمع و بصر بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔

تیسرا ذریعہ تحصیل علم وجدان یا عرفان ہے جس کی بنیاد حس یا احساس پر قائم ہے۔ عرفان سے حاصل کردہ معلومات کو اسلامی تمدن نے معرفت کا نام دے رکھا ہے اور اس کے ماہر کو عقل سے حاصل کردہ علوم کے ماہر یعنی ''عالم'' سے ممتاز کرنے کے لیے ''عارف'' کہا جاتا ہے مگر میرے جیسے عامی انسان کے لیے یہ ذریعہ بھی قابل اعتماد نہیں کیونکہ میرے احساس یا وجدانی سرکٹ میں بسا اوقات شیطان یا میرے اندر

کا حیوان دخل انداز ہو کر گمراہی کا باعث بنتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میرے لیے جب اپنے آپ کو جاننا ایک نہایت مشکل مرحلہ ہے تو میں غیب پر ایمان کیسے برقرار رکھ سکتا ہوں؟ میں آج تک ان معموں کو حل نہیں کر پایا۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی تجربہ سے محروم ایک عامی انسان کی طرح میں کبھی کفر اور کبھی ایمان، کبھی نیکی اور کبھی بدی کی سیڑھیاں چڑھتا اترتا رہا ہوں اور شاید یہی نشیب و فراز کی راہ میری راہِ حیات ہے۔

۱۳ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات میں اور میرے احباب ریڈیو سے چپکے بیٹھے تھے۔ جب بارہ کا گھنٹہ بج چکنے کے بعد اعلان ہوا کہ یہ ریڈیو پاکستان ہے اور ایک نئی آزاد مسلم مملکت وجود میں آ گئی۔ اعلان سن کر ہم سب نے تالیاں بجائیں اور پھر ناچنا شروع کر دیا۔ بقیہ شب اسی طرح ہنستے کھیلتے گزر گئی۔ ویسے یہ کوئی جشن منانے کا موقع تو نہ تھا۔ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے لاہور میں داخل ہو رہے تھے اور ان کی کسمپرسی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

دوسری طرف ترقی پسند ادیبوں نے اپنے سوشلسٹ سیاسی فلسفہ کے تحت اپنی تحریروں میں بیان کرنا شروع کر دیا تھا کہ سرحدوں کے ذریعہ جغرافیائی تقسیم ہمیں تمدنی طور پر ہندوستان سے جدا نہیں کر سکتی۔ اسی دوران جو افسانے سعادت حسن منٹو نے تحریر کیے، نہ صرف فحش سمجھے گئے بلکہ وہ خصوصی طور پر پاکستانی مسلم نیشنلسٹ حلقوں کی دلآزاری کا سبب بھی بنے۔ اس زمانے میں چودھری محمد حسین حکومت پنجاب کے پریس کے معاملات میں مشیر تھے۔ وہ جس رسالے میں منٹو کا افسانہ چھپتا، اسے بین کر دیتے۔ چودھری صاحب کو علم تھا کہ میرے چند ترقی پسند ادیبوں سے تعلقات ہیں، لہٰذا انہوں نے مجھ سے کہا کہ کسی روز ان کو اپنے ہاں بلاؤ تاکہ میں ان پر واضح کر سکوں کہ اس نازک مرحلہ پر پاکستان کے شہری ہونے کے ناطے سے ادیبوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ چنانچہ میں نے احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، ظہیر کاشمیری، خدیجہ مستور وغیرہ ادیبوں کو بلایا اور چودھری صاحب نے انہیں ایک طویل خطبہ دیا جس کا ان پر تو شاید کوئی اثر نہ ہوا، البتہ مجھ پر اثر ضرور ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو ترقی پسند ادیبوں سے منقطع کر لیا۔ اس عہد کی یادگار ''نصب العین کا مسئلہ'' کے موضوع پر میرے اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان ایک دلچسپ بحث ہے جو ان دنوں مضمون اور جواب مضمون کی شکل میں چراغ حسن حسرت کی زیر ادارت چھپنے والے اخبار ''امروز'' میں شائع ہوئی۔

۱۹۴۸ء میں میں نے ایم اے (فلسفہ) کا امتحان دیا اور یونیورسٹی بھر میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ کانووکیشن کے موقع پر پنجاب کے گورنر مودی سے ڈگری اور سونے کا تمغا وصول کیا۔ اب میرا پروگرام انگلستان جا کر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنا اور بیرسٹری کا امتحان پاس کرنا تھا۔ چودھری صاحب نے بمطابق معمول جیسے کبھی میرے برے نتیجہ پر کوئی تبصرہ نہ کیا، اسی طرح ایم اے

(فلسفہ) میں میرے اچھے نتیجہ پر بھی کسی قسم کی مسرت کا اظہار نہ کیا۔ ان کا اصول تھا کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہر مرحلہ پر کسی نہ کسی مقصد کا تعین کر کے اس کی تحصیل کے لیے تگ و دو جاری رکھنی چاہیے اور کامیابی پر خوشی یا ناکامی پر غمی کے اظہار کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ خوشی یا غمی ذہنی کیفیات ہیں اور ان کا نہ تو کوئی تعلق مقاصد کے تعین سے ہے، نہ اس کی تحصیل کے لیے تگ و دو سے۔ چودھری صاحب بھی اپنی نوع کے نابغۂ روزگار انسان تھے۔ میرے والد سے ان کی وابستگی عشق کی ایک عجیب وغریب مثال تھی۔ انہوں نے کلامِ اقبال اور اولادِ اقبال سے متعلق اپنے تمام فرائض انجام دیئے۔ یہاں تک کہ اپنی وفات سے پیشتر مزارِ اقبال کی تکمیل بھی کروا گئے اور اس دوران یہ نہ سوچا کہ اپنے ذاتی فرائض ادھورے چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں اب ان کی خواہش تھی کہ میں اگر ملک سے باہر جاؤں تو منیرہ کی شادی کے بعد جاؤں۔ انہوں نے میاں امیر الدین کے ساتھ بات کر کے ان کے فرزند میاں صلاح الدین سے منیرہ کا رشتہ بھی طے کر دیا تھا بلکہ منیرہ سے صلاح مشورہ کر کے انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اس معاملے میں صلاح الدین کے ماموں میاں ایم۔ اسلم، ان کی والدہ آپو (دختر میاں نظام الدین مرحوم) اور بہن حنیفہ آپا (زوجہ خواجہ عبدالرحیم مرحوم) اور ننھی آپا (زوجہ لیفٹیننٹ جنرل ریاض حسین مرحوم) پیش پیش تھے۔ منیرہ کی شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہونے لگیں۔ دوسری طرف گورنمنٹ کالج کے شعبہ فلسفہ کے سربراہ پروفیسر قاضی اسلم نے پروفیسر آربری سے خط وکتابت کر کے مجھے کیمبرج یونیورسٹی کے پیمبروک کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ چنانچہ میں انگلستان جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے لاتعداد قمیصیں، سوٹ وغیرہ سلوائے، گویا جہاں میں جا رہا ہوں وہاں پہننے یا اوڑھنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ سارے سامان کو سمیٹنے کے لیے دو کیبن ٹرنک بھر گئے۔ اسی طرح میری سمجھ کے مطابق انگلستان میں ولایتی ڈانس ایک اہم معاشرتی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے پلازہ سینما کی پہلی منزل پر جیمز بال روم ڈانسنگ اسکول میں مغربی رقص کے سبق لینا شروع کر دیئے۔ جیمز صاحب گوا سے تعلق رکھتے تھے اور بہت اچھے رقاص تھے۔ میں ان کا منظورِ نظر شاگرد بن گیا۔ انہوں نے مجھے بڑی جانفشانی سے سارے بال روم ڈانس سکھائے بلکہ ٹینگو میں تو تقریباً چھپن سٹیپس سکھائے جیسے میں نے کسی مقابلہ میں حصہ لینا ہو (اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دو سال بعد لندن میں ایک بین الاقوامی بال روم ڈانس مقابلہ میں میں نے ٹینگو میں اول پوزیشن حاصل کر کے ایوارڈ لیا) اب مشرقی رقص وسرود کی محفلوں سے میں نے دل اٹھا لیا تھا اور مغربی طرز کے رقص وسرود میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مال روڈ کے اکثر ریستورانوں میں جیمز اسکول کی اینگلو انڈین لڑکیوں کے ساتھ رقص وسرود کی محفلیں جمتیں مگر افسوس ہے میرے احباب نے اپنی قدامت پسندی کے سبب میرا ساتھ نہ دیا اور مشرقیت ہی سے وابستہ رہے۔

قائداعظم کی وفات والی شام میں کراچی میں تھا۔ اس شب کراچی جمخانہ کلب کے لان میں ڈانس تھا اور سندھ کے وزیراعلیٰ غلام حسین ہدایت اللہ بھی مجمع میں موجود تھے۔ میں اور بھائی اعجاز کے فرزند تحسین دونوں ڈنر جیکٹ پہنے محفل میں شریک تھے۔ بینڈ بج رہا تھا اور ہر کوئی محو رقص تھا۔ اتنے میں اچانک سب روشنیاں گل ہو گئیں اور تاریکی میں اعلان ہوا کہ قائداعظم فوت ہو گئے ہیں۔ چند لمحوں ہی میں محفل برخواست ہو گئی اور لان خالی ہو گیا۔

اگلے روز صبح میں اور تحسین قائداعظم کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ لوگوں کا اژدہام وہاں موجود تھا۔ قائداعظم کی میت ایک وسیع و عریض ڈیوڑھی میں رکھی گئی تھی تاکہ ہر کوئی ان کے چہرے کا آخری بار دیدار کر سکے۔ ان دنوں میرے پاس ایک مووی کیمرہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے قائداعظم کے چہرے کو فلمانا شروع کر دیا مگر پولیس کے ایک سارجنٹ نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا اور کیمرہ سے فلم نکلوا کر ضائع کرا دی۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں منیرہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے انجام پائی۔ برات میں پنجاب مسلم لیگی حکومت کے وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین خان ممدوٹ مرحوم اور دیگر وزراء شریک تھے۔ جاوید منزل میں دوپہر کے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا۔ صوفہ سیٹ، کرسیوں اور میزوں کی تزئین عزیز احمد نے بڑی نفاست سے کر رکھی تھی۔ میرے سب احباب انتظامات میں مصروف رہے۔ اس موقع پر میں نے بہت مدت کے بعد چودھری محمد حسین کو ہنستے اور قہقہے لگاتے دیکھا۔ حالانکہ میرے والد کی وفات کے بعد وہ کچھ خاموش خاموش اور کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ منیرہ کو آنٹی ڈورس اور دیگر رشتہ دار خواتین نے رخصت کیا۔ میں نے اور چودھری صاحب نے انہیں سہارا دے کر موٹر کار میں بٹھایا اور منیرہ آنٹی ڈورس، ماں وڈی اور علی بخش کو روتا چھوڑ کر چلی گئیں۔

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی، مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

باب ۵

انگلستان

۱۹۴۹ء میں ہوائی جہاز سے بھی انگلستان پہنچا جا سکتا تھا لیکن اس زمانہ میں یہ ذریعہ اتنا مقبول نہ تھا۔ اس لیے تھامس کک کی وساطت سے میں نے روایتی سمندری رستہ سے انگلستان جانے کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں اینکر لائن کا ''سیسلیہ'' نامی جہاز غالباً سڈنی سے چل کر سنگاپور، کولمبو اور بمبئی سے ہوتا ہوا کراچی پہنچتا تھا اور پھر کراچی سے عدن، سوئز کینال کے رستہ پورٹ سعید، بحیرۂ روم میں جبل الطارق سے گزر کر بالآخر لورپول جا ٹھہرتا تھا۔ میں نے اسی جہاز پر اپنے لیے ایک کیبن بک کرایا۔

۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء کے دن کراچی جانے کی خاطر مجھے لاہور ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے تمام احباب موجود تھے۔ چودھری محمد حسین بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ منیرہ، ان کے شوہر میاں صلی اور آنٹی ڈورس تو میرے ساتھ کراچی تک کا سفر کر رہے تھے۔ یہ رخصتی بھی پرانے اسٹائل کی رخصتی تھی۔ البتہ آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے گاڑی چلی اور چودھری صاحب نے چلتی گاڑی کے ساتھ چند قدم پیدل چلتے ہوئے مجھے مسکراتے ہوئے کہا: ''علم شکار کرنا، علم!'' یہ ان کے آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے۔

کراچی پہنچ کر ہم سب نے میٹروپول ہوٹل میں قیام کیا۔ جہاز کی روانگی ایک دو دن کے بعد تھی۔ اس لیے یہ وقفہ عزیزوں اور دوستوں کی دعوتیں اڑاتے گزر گیا۔ کراچی پہنچ کر اچانک مجھے خیال آیا کہ اتنے سامان کے باوجود میں نے شیو بنانے کا سامان ساتھ نہیں رکھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں نے کبھی خود شیو بنانے کی تکلیف ہی نہ کی تھی۔ میرے والد کے زمانہ کے دہلوی حجام رشید مرحوم ان کی وفات کے بعد بھی بدستور ہمارے یہاں میری شیو بنانے یا بال کاٹنے کے لیے روزانہ آتے تھے۔ وہ شاید چار روپے ماہوار لیا کرتے تھے۔ بسا اوقات دن چڑھے میں ابھی بستر پر سو رہا ہوتا تو وہ سوتے ہی میں میری شیو بنا جایا کرتے۔ پس جو اس قسم کی عیاشی کا عادی ہو، وہ بھلا شیو کا سامان اپنے ساتھ رکھنے کا کیونکر سوچ سکتا ہے مگر چونکہ اب تو اپنی داڑھی خود ہی مونڈنے کا سامان کرنا لازمی تھا، اس لیے کراچی سے گزرتے ہوئے شیو کا سامان بھی خرید کیا گیا۔

جن بزرگوں نے پاکستان کو خیر باد کہنے سے پیشتر حسب دستور مجھے نصیحتیں کیں، ان میں ایک اہم شخصیت سردار عبدالرب نشتر کی تھی۔ سردار صاحب ان دنوں پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے لاہور میں مقیم تھے۔ انہیں جب علم ہوا کہ میں اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر انگلستان جا رہا ہوں تو مجھے بلوا بھیجا۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ سردار صاحب نے والد کے بارے میں تحریر کردہ میرے بیشتر مضامین مثلاً ۲۱-اپریل ۱۹۴۶ء کے یوم اقبال پر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کردہ ''اقبال بحیثیت ایک باپ'' ۱۹۴۸ء کے یوم اقبال کے موقع پر اسلامیہ کالج ہال میں پڑھا ہوا میرا مقالہ ''اقبال کا تصورِ اجتہاد'' اور بعدازاں ''اقبال کے مابعد الطبعیاتی تصور میں اخلاقیات کا مقام'' جو اردو اور انگریزی اخباروں میں چھپا، سب پڑھے ہوئے تھے۔ فرمایا۔ ''دیکھو! قائداعظم کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں جس میں ہم ان کا عکس دیکھ سکیں۔ آپ علامہ اقبال کے فرزند ہو۔ قوم آپ کو انہی کے بتائے ہوئے رستہ پر چلتے دیکھنا چاہتی ہے۔ ایک بات یاد رکھیں، آپ پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ آپ نے ہمیں مایوس نہیں کرنا۔'' میں نے ان کے سامنے ادب سے سر جھکا دیا۔

جہاز کی روانگی کے دن منیرہ، میاں صلی اور آنٹی ڈورس کے علاوہ کراچی کے بعض احباب نے عرشۂ جہاز پر میرے ساتھ چند گھنٹے گزارے۔ ان دنوں جسٹس دین محمد گورنر سندھ کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اپنے فرزند محمد معظم عرف موج کو الوداع کہنے کے لیے عرشۂ جہاز پر موجود تھے۔ موج سے پہلی مرتبہ تبھی میری ملاقات ہوئی جس نے بعد میں مستقل دوستی کی صورت اختیار کر لی۔

جہاز نے تقریباً پانچ بجے شام رخصت ہونے کے لیے اپنا ہارن بجایا اور عرشہ جہاز سے خیر باد کہنے والے جہاز خالی کر کے نیچے گودی میں جا کھڑے ہوئے۔ جونہی جہاز نے لنگر اٹھایا، نیچے کھڑے لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر یا رومال ہلا کر ہمیں الوداع کہا۔

جہاز بڑی تیزی سے بحیرہ عرب میں آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اور موج نے طے کیا کہ پہلے اپنے اپنے کیبن میں جا کر سامان کا معائنہ کرتے ہیں اور پھر عرشہ پر رکھی آرام کرسیوں پر دراز ہو کر سمندر میں غروب آفتاب کا نظارہ دیکھتے ہیں۔ آدھے گھنٹہ کے بعد ہم دونوں پھر اکٹھے ہو گئے لیکن سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی موج کو سمندری عارضہ نے آ لیا۔ وہ اٹھ کر اپنی کیبن میں چلے گئے اور پھر میں نے اتنے دن انہیں نہیں دیکھا جب تک ان کی طبیعت نہیں سنبھلی۔

جہاز میں روزمرہ کی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ صبح صبح کیبن میں ملازم آپ کی مرضی کے مطابق پینے کو کافی یا چائے کی پیالی لاتا۔ منہ دھونے کے لیے کیبن ہی میں چلمچی اور آئینہ لگے ہوئے تھے۔ نہانا ہوتا تو ملازم غسلخانہ میں سر دھونے کے لیے نرم پانی کی بالٹی رکھ دیتا۔ باقی جسم کھارے سمندری پانی سے دھویا جاتا۔ بعدازاں کپڑے بدل کر ڈائننگ ہال میں جاتے اور نہایت پر تکلف ناشتہ ملتا۔ پھر لنچ تک کرنے کو

کچھ نہ ہوتا۔ اس دوران عرشہ جہاز پر سیر کی جاتی یا بیٹھ کر سمندر کا نظارہ دیکھا جاتا یا ہمسفروں کیساتھ خوش گپیوں میں وقت گزرتا یا کتب خانے میں بیٹھ کر کسی کتاب کی ورق گردانی کی جاتی۔ کہتے ہیں کہ سمندری جہاز میں بنی ہوئی دوستیاں تاحیات قائم رہتی ہیں۔ پاکستان اور بھارت نے نئی نئی آزادی حاصل کی تھی۔ اس لیے جہاز میں سوار انگریز عملہ، خواتین اور مردوں کا رویہ ہمارے ساتھ بے حد مشفقانہ تھا۔ چند ہی روز میں میرے اور موج کے نئے دوستوں کا ایک گروہ بن گیا۔ ان میں ایک جوڑا تو مونا سکھ میجر اور اس کی بیوی تھے۔ ایک خوبصورت پنجابی ہندو لڑکی تھی جو لندن یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے جا رہی تھی۔ جہاز میں دو سٹیٹ روم تھے جن میں سے ایک میں تو کسی اچھے خاندان کی نہایت شستہ تلفظ سے انگریزی بولنے والی انگریز خاتون پامیلا تھامس مقیم تھیں جو بمبئی میں اپنے خاوند سے طلاق لینے کے بعد واپس وطن جا رہی تھیں اور دوسرے میں ایک مالدار یہودی خاتون مادام کیرا پئے ٹھہری ہوئی تھیں جو اپنے آپ کو آنٹی گل کہلانا پسند کرتی تھیں۔ ان دونوں خواتین کے ساتھ تو دس بارہ برس بعد تک میرا رابطہ رہا اور پھر منقطع ہو گیا۔ اب علم نہیں کہ زندہ ہیں یا مر چکی ہیں۔

جہاز میں لنچ پر کھانے کو عموماً جنوبی ہندوستان کی ڈشیں ہوتیں۔ غالباً باورچی بھی اسی خطے سے تعلق رکھتے تھے۔ لنچ کے بعد اہم مشغلہ اپنے اپنے کیبن میں جا کر آرام کرنا تھا۔ بستر پر سوتے وقت بیلٹ باندھنی پڑتی تھی تاکہ لڑھکنے یا فرش پر گرنے سے بچا جا سکے۔ رات کا کھانا عموماً فارمل ہوتا۔ میں اور موج ڈنر جیکٹ کی بجائے کالی اچکنیں پہن کر ہال میں جاتے۔ کھانا انگریزی یا یورپی ڈشوں پر مشتمل ہوتا۔ جہاز کا کپتان ہر تیسرے چوتھے روز اپنے کمرے میں کاک ٹیل پارٹیاں دیتا۔ ہر ہفتہ کی شب جہاز کے وسیع و عریض ہال میں بینڈ کے ساتھ ڈانس کا اہتمام کیا جاتا یا کسی نہ کسی کھیل کا انتظام ہوتا۔ اتوار کی صبح مسیحی مذہبی سروس منعقد ہوتی۔ جہاز کی ہر سوشل تقریب میں میں اور موج بڑے انہماک سے شریک ہوتے۔

بعض اوقات مجھے احساس ہوتا کہ میں جہاز میں اسی راہ سے انگلستان جا رہا ہوں جس راہ سے میرے والد گئے تھے۔ انہوں نے اپنے بحری سفر کی پوری روئیداد تحریر کر رکھی ہے اور میں بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس سفر کی تفصیل بیان کر رہا ہوں لیکن ہم دونوں کے تاثرات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ ان کے بدن میں ایک نابغۂ روزگار مسلم شاعر کا دل دھڑکتا تھا مگر میں شاید فلسفہ کا طالبعلم ہونے کے ساتھ جذبات و روحانیات سے خالی ایک ایسے دل کا مالک تھا جو میرے جسم میں محض ایک گوشت کے لوتھڑے کی مانند دھڑک رہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ بمبئی سے آگے نکل کر سمندر متلاطم ہو گیا اور نتیجتاً ان کے تمام ساتھی مرض بحری میں مبتلا ہو گئے مگر وہ محفوظ رہے۔ اس طرح کراچی سے رخصت ہو کر جب بحیرہ عرب کی موجیں اوپر اٹھنے لگیں تو میں بھی ان کی طرح سمندری عارضہ سے محفوظ رہا۔ حالانکہ

موج سمیت مسافروں کی اکثریت اگلے روز صبح ناشتہ پر موجود نہ تھی۔ میرے والد پر سمندر کے نظارے نے گہرا اثر کیا۔ فرماتے ہیں:

''جہاز کے سفر میں دل میں سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوت لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آج ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح میں بہت سویرے اٹھا ہوں۔ جہاز کے جاروب کش ابھی تختے صاف کر رہے ہیں۔ چراغوں کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے۔ آفتاب چشمہ آب میں سے اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور سمندر اس وقت ایسا ہی ہے جیسے ہمارا دریائے راوی۔ طلوع آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔''

والد نے آج کل کے ہوائی جہازوں میں سفر نہیں کیا تھا ورنہ فضا میں انہیں خدا کی قوت لامتناہی کا ایک اور ہی قسم کا احساس ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ سمندر کی خوفناک وسعت دیکھ کر مغرور انسان کو اپنے ہیچ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے مگر جن ترقی یافتہ اقوام نے سمندری اور ہوائی جہاز بنا رکھے ہیں، ان کے غرور کا باعث تو سمندر یا فضا کی خوفناک وسعت پر ان کی اپنی قدرت ہے بلکہ علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی رفتار اگر اسی طرح قائم رہی تو عین ممکن ہے کہ آئندہ کے ترقی یافتہ ملکوں کے انسان کو خدا کی ضرورت ہی نہ رہے اور خدا یا اس کی قوت لامتناہی کا احساس صرف پسماندہ اقوام تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔ بہرحال میرا ایمان میرے والد کے ایمان سے کمزور ہے۔ اس لیے سمندر کی خوفناک وسعت کا نظارہ کرتے وقت میرا دل صرف نظارے کے جمال سے متاثر ہوا، اس میں ان کی طرح خدا کی قوت لامتناہی کے جلال کا احساس پیدا نہ ہوا۔

جہاز عدن پہنچ کر لنگر انداز ہوا۔ برصغیر کے مسلم تاجروں کا گروہ عرشۂ جہاز پر ہمیں بڑے تپاک سے ملا اور ان کے قائد مجھے اور موج کو اپنی موٹر کار میں بٹھا کر شہر میں لے گئے۔ شہر کی سیر کے دوران ہم نے ملکہ سبا کے تعمیر کردہ تالاب دیکھے۔ یہ وہی ملکہ سبا یا بلقیس ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آتا ہے اور جنہوں نے شاید حضرت سلیمانؑ سے شادی کی تھی۔ بعد ازاں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں دیگر لوگوں کے ساتھ ہمیں پُرتکلف چائے سے نوازا گیا۔ جہاز کے رخصت ہونے کے وقت سے پیشتر وہ ہمیں چھوڑ گئے۔

اپنے بحری سفر کے دوران والد بوجہ قرنطینہ اور گرمی عدن کی سیر نہ کر سکے تھے لیکن ساحل عرب سے

قربت کے تصور نے جہاز میں بیٹھے ہوئے جو ذوق وشوق اس وقت ان کے دل میں پیدا کر دیا تھا، اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا فسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ اے پاک سرزمین! تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو! کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

میرے والد کو بیت اللہ کا حج نصیب نہ ہوا تھا مگر جذبۂ عشقِ رسول صلعم کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ساحلِ عرب کے نزدنے جہاز میں بیٹھے ہوئے بھی ان میں ذوق وشوق کی ایسی گداز کیفیت پیدا کر دی کہ مجھ جیسا عقل کا غلام اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ کہاں اقبال اور کہاں امیر قوموں کے سہارے جینے والی مجھ جیسے بھکاری مسلمانوں کی محکوم ومجبور نسل۔

جہاز نے عدن سے لنگر اٹھایا اور بحیرہ قلزم میں سے گزرتا سوئز کینال میں داخل ہوا۔ اب اس کی رفتار نہایت سست ہو گئی تھی اور اسے پورٹ سعید پہنچتے خاصا وقت لگا۔ پورٹ سعید پہنچنے پر مصری تاجروں کی دکانیں تختۂ جہاز پر سج گئیں۔ میں، موج اور چند دیگر مسافر کشتیوں میں بیٹھ کر بندرگاہ کی سیر کو نکل گئے۔ پورٹ سعید میں دیکھنے کو چند مساجد اور ایک مدرسہ ہیں یا سوئز کینال کے فرانسیسی موجد کا مجسمہ۔ ہم سیر کر کے جہاز کو لوٹے اور گرمی کے سبب اپنے اپنے کیبنوں میں جا کر سو رہے۔

میرے والد نے جس جہاز پر سفر کیا تھا، وہ کسی فرانسیسی کمپنی کا تھا۔ اس کا عملہ فرانسیسی تھا اور منزل بھی مارسیلز تھی، جہاں سے ریل گاڑی پر فرانس سے ہوتے ہوئے برٹش چینل کو عبور کر کے ڈوور کے رستے لندن پہنچے۔ اس جہاز پر انہوں نے اطالوی عورتوں کا رقص دیکھا بلکہ ایک کے حسن سے بے حد مرعوب بھی ہوئے مگر تحریر کرتے ہیں: "جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو، بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا

ہے۔" بعدازاں جب جہاز بحیرہ روم میں داخل ہوا تو موسم نہایت خوشگوار ہو گیا اور ان پر ہوا کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ بقول ان کے "میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہو گئی اور میں نے چند اشعار کی غزل لکھی۔"

ایسے تجربوں سے گزرنا میرے نصیب میں نہ لکھا تھا کیونکہ میں نہ شعر کہنے کی اہلیت رکھتا تھا اور نہ میرے نزدیک حسن کا کوئی معیار تھا۔ ہمارا جہاز جب بحیرہ روم میں داخل ہوا تو اگرچہ سمندر ایک جھیل کی مانند پرسکون تھا مگر موسم خاصا سرد ہو گیا۔ گرم کپڑے زیب تن کرنے پڑے اور جہاز میں ہفتہ کی رات رقص و سرود کے سبب بہت زیادہ دلکش اور رنگین ہو گئی۔

بحیرہ روم کے پرسکون پانیوں کو چیرتے ہوئے جبل الطارق سے نکل کر جہاز بحر اوقیانوس میں داخل ہوا اور سردی مزید بڑھ گئی۔ خلیج بسکے کے قریب جہاز کو بحری طوفان نے آلیا۔ لہریں عرشہ سے یوں ٹکراتی تھیں جیسے جہاز کو لے ڈوبیں گی۔ بہت سے مسافر ایک بار پھر بحری مرض میں مبتلا ہو گئے۔ متلاطم سمندر کے سبب جہاز اس قدر ڈولتا تھا کہ میز پر رکھی چائے کی پیالی لڑھک کر کبھی اس کے دائیں کنارے سے جا ٹکراتی اور کبھی بائیں کنارے سے۔ یہ صورت ایک دو دن تک برقرار رہی مگر میں ایک پیشہ ور جہاز ران کی طرح اس دفعہ بھی بحری مرض سے محفوظ رہا۔

غالباً ۲۸ ستمبر ۱۹۴۹ء کی ایک دھندلی صبح جہاز لورپول کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ میں، موج اور ایک ساتھی روڈز اسکالر مراد نے اپنا اپنا سامان قلیوں سے اٹھوا کر قریب ہی ریلوے اسٹیشن پر لندن جانے والی ریل گاڑی میں رکھوایا اور چند گھنٹوں کے بعد ہم لندن پہنچ گئے۔ یہاں پاکستان ہائی کمیشن کا ایک نمائندہ ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ موج نے اپنے ٹھہرنے کا انتظام تو پہلے ہی سے لندن ہاؤس میں کر رکھا تھا۔ میری منزل کیمبرج اور مراد کی آکسفورڈ تھی۔ میں نے چند روز لندن ٹھہر کر لنکنز ان میں اپنے داخلے کا انتظام مکمل کروانا تھا۔ چنانچہ میں اور مراد لندن ہاؤس کے قریب کسی سستے سے ہوٹل کے نہایت ہی تاریک اور خستہ حال کمروں میں ٹھہر گئے۔ مراد تو اگلے روز آکسفورڈ سدھارا مگر موج اور میں نے لنکنز ان پہنچ کر اپنے ناموں کا اندرج کرایا۔ اس سے اگلے روز میں نے موج کو خیر باد کہا اور کنگز کراس ریلوے اسٹیشن سے ریل گاڑی پکڑ کر کیمبرج پہنچ گیا۔

کیمبرج کے ریلوے اسٹیشن سے ڈرائیور کی مدد سے میں نے اپنے بھاری کیبن ٹرنک ٹیکسی میں رکھوائے۔ وہ پیمبروک کالج کے گیٹ پر سامان اتار کر چلا گیا۔ مجھے کمرہ کیو۴ الاٹ ہوا تھا جو خاصا دور تھا اور میرے لیے بھاری کیبن ٹرنک اٹھا کر وہاں لے جانا قدرے مشکل تھا۔ سو میں نے گیٹ پر بیٹھے پورٹر سے مدد مانگی۔ اس نے میری وضع قطع دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: "سر! یہاں کوئی سامان اٹھانے والا نہیں۔ اس لیے آپ کو اپنی مدد آپ کرنا ہو گی۔ میں آپ کو صرف ریڑھی دے سکتا ہوں اور وہ بھی اس شرط پر کہ واپس لا

کرا بھی دیں۔ اس پر خود ہی سامان لاد دیئے اور اپنے کمرے تک لے جائیے۔‘‘ میں نے بڑی مشکل سے دونوں ٹرنک ریڑھی پر لادے اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرا کمرہ تیسرے فلور پر ہے اور کوئی لفٹ نہیں۔ ظاہر ہے ریڑھی بھاری سامان کے ساتھ تو سیڑھیاں نہ چڑھ سکتی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیمی ٹرم (میکلمس) ۵-اکتوبر سے شروع ہوتی تھی، اس لیے یکم یا ۲-اکتوبر کو میرے سوا کوئی مکین بھی ابھی تک نہ پہنچا تھا جو میرا ہاتھ بٹا سکتا۔ پس یہ میں ہی جانتا ہوں کہ کس مشکل سے میں نے دو بڑے بڑے صندوق سیڑھیوں سے چڑھا کر اپنے کمرے تک پہنچائے۔ اصل میں یہ میری غلطی تھی کہ اتنا سارا سامان اٹھا کر ساتھ لے آیا۔ میرا تو خیال تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں ہر شے کی راشننگ ہے مگر یہاں تو راشننگ صرف مکھن، انڈے، کھانڈ اور گوشت کی تھی۔ جن اشیاء کی ایک مخصوص مقدار ہفتہ وار کالج کی دکان سے خریدنے پر ملتی تھی۔ باقی کپڑے وغیرہ خریدنے پر تو کوئی پابندی نہ تھی بلکہ کیمبرج میں تو رواج یہی تھا کہ ہر پڑھنے یا پڑھانے والا چڑھ مُڑھ سے چُڑھ مُڑھ ترین عامی لباس زیب تن کرتا تا کہ صحیح معنوں میں طالبعلم دکھائی دے۔ ہاں، دو ایک نشانیاں اور بھی تھیں۔ بوسیدہ پرانی فللینل یا کارڈرائی کی پتلون کے ساتھ کالج کا مخصوص بلیزر پہننا اور منہ میں بجھا یا جلا ہوا پائپ دبا کر رکھنا۔ جو نہایت صاف ستھرا استری شدہ سوٹ پہن کر پھرتا نظر آتا اسے ’’سسی‘‘ یا آکسفورڈ کا باشندہ تصور کر کے اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ خیر جس ونگ میں میرا کمرہ تھا، بقول شخصے اسی ونگ کے کسی کمرے میں لارڈ بائرن نے بھی قیام کیا تھا۔ ونگ کے صدر دروازے پر ایک طرف فرش پر کنڈا سا نصب تھا جس کے ساتھ وہ اپنا پالتو ریچھ باندھا کرتا تھا۔ واللہ اعلم۔

میرا کمرہ روشن اور وسیع تھا۔ کھڑکیاں بغلی لین میں کھلتی تھیں اور کمرہ گرم رکھنے کے لیے گیس کی انگیٹھی لگی تھی۔ واش بیسن اندر ہی نصب تھا۔ ایک طرف بستر لگا تھا اور دوسری طرف دیوار کے ساتھ لکھنے پڑھنے کے لیے میز کرسی رکھے تھے۔ انگیٹھی کے گرد دو صوفہ نما کرسیاں پڑی تھیں۔ کپڑوں کے لیے الماری موجود تھی مگر میرے کیبن ٹرنک ہی الماری کی طرح استعمال کیے جا سکتے تھے۔ لکڑی کے فرش پر مشینی دری بچھی تھی۔ کمرہ صاف کرنے کے لیے اتوار کے سوا روز صبح دس بجے ’’چار ویمن‘‘ آتی تھی جو ہر ہفتہ بعد بستر کی چادریں بھی بدل دیتی۔ کمرے سے باہر اسی فلور پر ’’جپ روم‘‘ میں گیس کا چولہا نصب تھا جہاں چائے وغیرہ بنائی جا سکتی تھی۔ ساتھ چھوٹا سا کمرہ رفع حاجت کے لیے مخصوص تھا جہاں کموڈ لگا تھا اور ٹائلٹ پیپر (یا پانی کا لوٹا) اپنا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ یہ سہولتیں مجھے اپنے سامنے والے کمرے کے مکین طالبعلم کے ساتھ بانٹنی پڑتی تھیں۔ غسل کرنے کے لیے کامن باتھ رومز میں جانا پڑتا جو قدرے دور تھے۔

کالج کے قواعد کے مطابق میں صرف ایک سال تک اپنے کمرے میں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کے بعد

رہائش کے لیے مجھے اپنا علیحدہ انتظام کرنا ضروری تھا۔ کمرے کے اندر خاتون مہمان رات ساڑھے دس بجے تک ٹھہرائی جا سکتی تھی۔ اسی طرح رات بارہ بجے تک کالج کے مکین اپنے کمروں میں جانے کے لیے صدر دروازے سے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ بعد میں انہیں کالج کے پچھواڑے اونچے لوہے کے دروازے کو پھلانگ کر اندر جانا پڑتا تھا اور اگر کوئی دروازے پر چڑھتا پکڑا جائے تو اسے خاصا نقصان اٹھانا یقینی تھا۔ غروب آفتاب کے بعد کیمبرج شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے اپنی شناخت کی خاطر ہر انڈر گریجوایٹ کے لیے چھوٹا اور ہر ریسرچ اسکالر کے لیے لمبا گاؤن پہننا لازمی تھا ورنہ یونیورسٹی کا پراکٹر اور اس کے دو اسسٹنٹ (جو بل ڈاگز کہلاتے تھے اور ریس لگانے میں ماہر تھے) اسے پکڑ کر چالان کر سکتے تھے۔ لڑکیوں کے لیے کیمبرج میں دو کالج مخصوص تھے جن میں سے ایک کا نام نیونہم تھا اور دوسرے کا گرٹن۔ ان کالجوں میں بھی اسی طرز کے قواعد نافذ تھے۔

کیمبرج کے ''ڈیئر ڈیول'' لڑکوں نے بھی صحیح طور پر ''کیمبرج مین'' کا اسٹیٹس کوالیفائی کرنے کے لیے چند قواعد بنا رکھے تھے۔ مثلاً پراکٹر اور اس کے تیز رفتار بل ڈاگز کے ہاتھوں سے بچ نکلنا۔ رات کے دو بجے کالج کے لوہے کا گیٹ پھلانگ کر بغیر پکڑے جانے کے اپنے کمرے تک پہنچنا اور سب سے اہم لڑکیوں کے کالج کے اندر بغیر پکڑے گئے پوری رات گزارنے میں کامیاب ہونا۔ اپنے پانچ سالہ کیمبرج کے قیام میں میں ان تین میں سے دو قواعد کوالیفائی کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ کونسے دو قواعد تھے؟ یہ ایک پہیلی ہے جسے کوئی بوجھے تو جانیں۔

ٹرم کے شروع ہونے میں ابھی دو ایک دن باقی تھے۔ اسی لیے مجھے کالج سے باہر جا کر اپنے کھانے وغیرہ کا انتظام کرنا پڑتا۔ بہرحال کالج میں اب لڑکے آنا شروع ہو گئے تھے۔ میرے جنرل ٹیوٹر مسٹر کیمپس تھے جو کالج ہی میں رہتے تھے۔ اسی لیے پہلے دن ہی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایک طویل قامت عینک پوش جوان تھے اور بولتے وقت ہکلاتے تھے۔ انہی کے مشورے سے میں نے اپنے استعمال کے لیے بائیسکل خریدی اور پہننے کے لیے گاؤن خریدا۔ دوسرے ٹیوٹر ڈاکٹر ڈیوئی تھے۔ وہ بھی کالج میں رہتے تھے اور کلیسا کے چیپلین تھے۔ ان سے ٹرم شروع ہونے کے بعد تعارف ہوا۔

یونیورسٹی میں میری انرولمنٹ چونکہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تحصیل کے لیے ہوئی تھی، اس لیے میرے نگران پروفیسر اے جے آربری تھے جو اس عہد کے معروف برطانوی اسلامک اسکالر تھے اور براؤن اور نکلسن کی طرح کیمبرج کی ایشین و اسلامک اسٹڈیز کی چیئر پر فائز تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کی شعری تصانیف ''رموزِ بے خودی'' ''زبورِ عجم'' اور ''جاوید نامہ'' کا انگریزی ترجمہ کر رکھا تھا۔ میں نے بذریعہ ٹیلی فون ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ خود میرے کمرے میں آ کر مجھ سے ملیں گے۔ چنانچہ وہ کمرے

میں تشریف لائے اور میری خیریت پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں ابھی تک "کلچرل شاک" کی کیفیت میں سے گزر رہا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے۔ ہر کوئی اپنی دھن میں بھاگا چلا جا رہا ہے اور میرے لیے اتنی تیزی سے قدم اٹھا کر چلنا شاید ممکن نہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے کہ رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے۔

اب مسئلہ تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کے تعین کا تھا۔ آربری کا اپنا موضوع چونکہ اسلامی تصوف تھا، اس لیے انہوں نے تجویز کیا کہ میں امام غزالی کے تصوف کے نفسیاتی پہلو پر تحقیقی مقالہ تحریر کروں مگر اس موضوع پر لکھنے کے لیے عربی زبان میں مہارت کے علاوہ یونانی اور لاطینی زبانوں سے شناسائی بھی ضروری تھی۔ جہاں تک میرے ذاتی رجحان کا تعلق ہے، میں تصوف کو فلسفہ کی بجائے روحانی تجربہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک روحانی تجربہ سے باطنی طور پر گزرا تو جا سکتا ہے (جس کو خداوند تعالیٰ نے اس نعمت سے نوازا ہو) لیکن اس پر خارجی طور پر لکھنا ایک اناڑی کی بیکار مشق ہے مگر آربری کا خیال تھا کہ میں چھ سات ماہ میں محنت کر کے اپنی عربی اور فارسی کو بہتر بناؤں اور پھر سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔ سو میں نے فیکلٹی میں عربی اور فارسی کی کلاسوں میں شریک ہونا شروع کر دیا۔ یہاں میرے استاد مانٹگمری واٹ، ڈنلوپ اور ایک ایرانی حیدری تھے۔

میں نے چودھری محمد حسین کو خط لکھا اور انہیں بھی صورتحال سے آگاہ کیا۔ چودھری صاحب یورپی مستشرقین کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ یورپی مستشرقین اسلام کو ایک مردہ نظام سمجھ کر اپنی طرف سے اس کا پوسٹ مارٹم کرتے رہتے ہیں۔ آربری چونکہ برطانیہ کی "قدامت پسند" جماعت (ٹوری پارٹی) سے تعلق رکھتے تھے، وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے روحانی تجربہ کو محض نفسیاتی الجھن ثابت کر کے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا جائے۔ چودھری صاحب نے تجویز کیا کہ کیوں نہ میں پاکستان کے قیام کے نظریاتی پس منظر پر مقالہ تحریر کروں کیونکہ جو کتب پاکستان پر لکھی گئی ہیں، ان میں اس اہم پہلو پر کسی نے روشنی ڈالنے کی تکلیف نہیں کی۔

چودھری صاحب کی تجویز کی روشنی میں میں نے آربری کو بتایا کہ میں گہرے فلسفہ یا تصوف سے متعلق کسی موضوع پر تحقیق کرنے کی بجائے طبعاً کوئی عملی موضوع چننا چاہتا ہوں اور اس نقطہ نگاہ سے میں نے تحقیق کے لیے "برصغیر میں مسلم سیاسی فلسفہ کا ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا ہے۔ آربری مان گئے اور اس ضمن میں اپنے علاوہ پروفیسر روبن لیوی کے زیرِ نگرانی کام کرنے کے لیے کہا۔ روبن لیوی آربری سے قطعی برعکس نظریات رکھتے تھے۔ عقیدہ کے اعتبار سے یہودی تھے اور سیاسی طور پر زاویہ نگاہ سوشلسٹ بلکہ مارکسسٹ تھا۔ ان کی مشہور تصنیف بھی "اسلام کی سوشیالوجی" کے موضوع پر ہے۔

موضوع کے انتخاب کی کشمکش میں میرا تقریباً ایک سال یونہی ضائع ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کیمبرج میں قیام کے دوران مجھے آربری اور لیوی سمیت جن مستشرقین سے تبادلۂ خیال کے مواقع ملے، میں ان میں سے کسی ایک سے بھی متاثر نہ ہوا۔ مجھے ان سے گفتگو کرتے وقت ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ انہیں نہ تو اسلام سے کوئی حقیقی دلچسپی ہے اور نہ ہمدردی بلکہ ان کا زاویہ نگاہ اسی پرانے تعصب پر مبنی ہے جو مسیحیوں اور یہودیوں کو قرونِ وسطیٰ کے زمانہ سے اب تک اسلام کے خلاف رہا ہے۔ ان کی منافقت کے باعث ان پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا۔ ان ایام میں مجھے عموماً مسلمانوں کی سادہ لوحی پر بھی غصہ آیا کرتا۔ جب وہ ان شخصیات کو اسلام دوست کے نام سے پکارتے۔

اسی مرحلہ پر جولائی ۱۹۵۰ء میں مجھے چودھری محمد حسین کی وفات کی خبر ملی اور میں بے قرار ہو گیا۔ چودھری صاحب کو ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی خواہش کے مطابق چارپائی پر جاوید منزل لایا گیا۔ تب جاوید منزل غیر آباد تھی۔ منیرہ وہاں موجود تھیں نہ میں۔ ماں وڈی اپنی منہ بولی بیٹی کے ہاں وفات پا چکی تھیں۔ آنٹی ڈورس زنانہ اسلامیہ کالج میں لڑکیوں کے بورڈنگ ہاؤس میں میٹرن کے طور پر مقیم تھیں۔ جاوید منزل میں صرف علی بخش نے روتے ہوئے چودھری صاحب کا استقبال کیا۔ آپ کی چارپائی میرے والد کے کمرے میں رکھی گئی۔ اس طرح شاید ان کی روح کو سکون نصیب ہوا۔ بعد ازاں اپنے گھر جاتے ہی وہ فوت ہو گئے۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں نے جذباتی اور فکری اعتبار سے اپنے آپ کو قطعی طور پر تنہا محسوس کیا۔ یہ احساس کئی دنوں تک میرے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ ایک چپ سی لگ گئی۔ جیسے کسی نے مجھے اچانک خلا میں معلق کر دیا ہو۔ مایوسی کے اس عالم میں ایک وقت ایسا بھی مجھ پر آیا جب میں نے پاکستان واپس جانے کا ارادہ کر لیا مگر اس کی نوبت نہ آئی۔

تنہائی کا احساس دور کرنے کے لیے میں نے اپنے آپ کو انگریزی تمدن میں گم کرنا چاہا۔ یہاں تک کہ میرے انگریز شناسا بھی مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے تو ہمارا کلچر یوں اپنا لیا ہے جیسے پیدا ہی یہیں ہوئے تھے۔ منتخب کردہ موضوع پر تحقیق بھی ایک کٹھن فکری سفر تھا کیونکہ رہبر قابل اعتماد نہیں تھے۔ میں کچھ عرصہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ رہبروں کو پیچھے چھوڑ کر اندھیرے میں اکیلا آگے نکل گیا۔ مجھے تحقیق نے چند باتیں سکھائیں۔ ”شبہہ سے ابتداء کرو، تحمل سے کام لو اور خود اعتماد بنو۔ تنہائی کے عالم میں شبہہ اور تحمل کے احساسات انسان کے دل میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز جو شخص اپنی غلطیوں سے سیکھتا ہے، وہ ہمیشہ خود اعتماد ہوتا ہے۔“

حکیم طاہر الدین کی وفات کے بعد کلامِ اقبال کی اشاعت سے متعلق آمدنی اور خرچ کا حساب چودھری صاحب مرحوم نے اپنے بااعتماد کلرک میاں محمد طفیل (مرحوم) کے سپرد کر دیا تھا اور وہی کیمبرج

میں ہر ماہ پچاس پاؤنڈ بھیجتے تھے جس کی اجازت اسٹیٹ بینک نے دے رکھی تھی۔ ان دنوں کوریا کی جنگ کے سبب پاؤنڈ نو روپے میں ملتا تھا۔ پھر جنگ کے بعد کئی برسوں تک تیرہ روپے فی پاؤنڈ تبادلہ کی رقم قرار پائی۔ اب جاوید منزل بھی خواجہ عبدالرحیم مرحوم نے اپنی رہائش کے لیے کرایہ پر لے لی۔ یوں آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

خواجہ صاحب کے ذکر سے مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ جن دنوں خواجہ صاحب جاوید منزل میں مقیم تھے، ان کے جناب سہروردی مرحوم (سابق وزیراعظم پاکستان) کے ساتھ گہرے سیاسی تعلقات قائم ہو گئے بلکہ سہروردی صاحب ان کے مہمان کے طور پر جاوید منزل ہی میں آ کر رہنے لگے۔ خواجہ صاحب نے ان کی عزت افزائی کرتے ہوئے انہیں علامہ اقبال کے ذاتی کمرے میں ٹھہرایا جو سہروردی صاحب کے لیے ایک اعزاز تھا مگر رات کو سوتے ہوئے سہروردی صاحب نے محسوس کیا کہ کوئی ان کی چھاتی پر بیٹھ کر ان کا گلا دبا رہا ہے۔ اس ڈراؤنے خواب سے سہروردی صاحب جاگ اٹھے اور اگلے روز خواجہ صاحب سے کہا کہ میری توبہ، میں اس کمرے میں نہیں سوؤں گا۔ یہاں تو رات کو علامہ اقبال نے میری گردن دبائی ہے۔ اس حادثہ کے بعد خواجہ صاحب کو ان کی رہائش کے لیے کوئی اور انتظام کرنا پڑا۔

انگلستان میں میری آمدنی میں مزید اضافہ اس طرح ہوا کہ بی بی سی نے اپنی مشرقی سروس میں دس منٹ کا ایک انگریزی پروگرام ''کیمبرج لیٹر'' کے نام سے جاری کیا جس کے لیے مشرقی سروس کے انچارج مسٹر رسل نے مجھے منتخب کیا۔ یہ پروگرام ہر ہفتہ نشر ہوتا تھا اور مجھے فی منٹ ایک گنی (ایک پاؤنڈ اور ایک شلنگ) کے حساب سے رائلٹی ادا کی جاتی۔ یوں ہر ماہ مجھے چالیس گنی کی اضافی آمدنی ہو جاتی۔ پروگرام میں میں ہر ہفتہ کیمبرج کے پاکستانی اور بھارتی طلباء کی سرگرمیوں کے متعلق مذاحیہ انداز میں تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اس زمانہ کے کیمبرج میں مہینہ میں سو پاؤنڈ خرچ کر سکنے کے قابل ہونا شہزادوں کی زندگی بسر کرنے کے برابر تھا۔ بھلے زمانوں میں کیمبرج یا آکسفورڈ جیسی یونیورسٹیوں میں آسودہ حال امیروں کے بچے پڑھنے کے لیے آتے تھے لیکن لیبر پارٹی کی حکومت کے دوران یہاں زیادہ تر محنت کشوں کے بچے داخل ہوئے جو اپنی تعلیم کا خرچ وظیفوں سے پورا کرتے تھے اور وظیفوں کی رقم اتنی قلیل ہوتی کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ کھا سکتے تھے۔

میں کالج کے کمرے کیوہم میں سال کے قیام کے بعد اب اپنی ''ڈگز'' ۵ پارک ٹیرس میں منتقل ہو گیا۔ کیمبرج میں میری روٹین اب کچھ اس طرح تھی۔ میں صبح دس بجے اپنے کمرے میں گیس کے چولہے پر کافی کی پیالی بنا کر کیک کے ٹکڑے کے ساتھ ناشتہ کر کے سائیکل پر یونیورسٹی لائبریری پہنچتا اور چار بجے شام تک متعلقہ کتب کا مطالعہ کرتا یا نوٹس لیتا۔ دوپہر کو وہیں ایک آدھ سینڈوچ کھا لیتا یا اگر جلد واپسی ہوتی تو

کالج کے ڈائننگ ہال میں لنچ کر لیتا۔ کالج کھلنے پر وہاں ناشتہ اور لنچ مل سکتے تھے۔ رات کا کھانا چھ بجے کالج ہال میں کھایا جاتا جس میں گاؤن پہن کر ہی شریک ہوا جا سکتا تھا۔ ان دنوں گوشت کی قلت یا مہنگائی کے سبب کالج میں روزانہ سوپ کے بعد ریبٹ پائی (خرگوش کا گوشت جو آسٹریلیا سے درآمد کیا جاتا تھا) ابلے ہوئے مٹروں یا گوبھی یا آلوؤں کے ساتھ کھانے کو ملتا۔ سویٹ ڈش چاولوں کی پھیکی کھیر ہوتی جس پر لال رنگ کا میٹھا شربت ڈال کر کھائی جاتی۔ آخر میں چائے یا کافی کی پیالی ملتی جس میں اپنے راشن کی کھانڈ استعمال کی جاتی تھی مگر مکھن، کھانڈ اور انڈوں کا جو ہفتہ بھر کے لیے راشن خریدا جا سکتا تھا، اتنا قلیل ہوتا کہ مجھ سے تو تین دن ہی میں ختم ہو جاتا۔ اکثر انگریز لڑکوں نے اس قلت کے سبب مکھن، انڈے یا کھانڈ استعمال کرنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ کھانا اتنا ''زود ہضم'' ہوتا کہ دو گھنٹے گزرنے کے بعد پیٹ میں گولے پھٹنے لگتے اور شدت کی بھوک لگتی۔ اس لیے میں عموماً ٹرنیٹی کالج کے سامنے بنگالی ریستوران ''کوہِ نور'' میں جا کر پراٹھے کے ساتھ مٹر قیمہ کھا کر اپنی بھوک ختم کرتا۔

ہفتہ میں ایک بار اپنا تحریر کردہ تحقیقی پیپر پروفیسر لیوی کے پاس لے جاتا اور اس پر گھنٹہ دو گھنٹے بحث ہوتی۔ خامیاں نوٹ کی جاتیں، ہدایات لی جاتیں اور اگر پیپر میں مزید اضافہ کرنے کی ضرورت ہوتی تو ایسا کر دیا جاتا۔ مہینہ میں ایک بار پروفیسر آربری سے ملاقات ہوتی اور انہیں مہینہ بھر کے کام کی تفصیل بیان کی جاتی۔

لندن میں بیرسٹری کے امتحان دو حصوں میں دیئے جا سکتے تھے۔ ہر سال میں چار مرتبہ پہلے حصہ کے چھ پرچوں کے امتحان علیحدہ علیحدہ بھی ہوتے تھے مگر دوسرے حصہ کے چھ پرچوں کے امتحان ایک ساتھ لینے پڑتے تھے۔ علاوہ اس کے تین سال کی مدت میں لنکن انز کے مخصوص تعداد میں ڈنرز میں شرکت بھی ضروری تھی۔ میں نے تین سال میں لندن جا کر موج کے ساتھ ڈنرز کی تعداد پوری کی اور اسی عرصہ میں ایک ایک کر کے بار کے پہلے حصہ کے چھ پرچوں کے امتحان بھی پاس کر لیے۔ جہاں تک بار کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے، میں نے طے کیا کہ پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کرنے کے بعد کیمبرج سے لندن منتقل ہونے پر اس سے بھی فراغت حاصل کروں گا۔

تین سال گزرنے پر موج بیرسٹری کے امتحان پاس کر کے واپس پاکستان چلے گئے بلکہ گوجرانوالہ میں باقاعدہ وکالت بھی شروع کر دی لیکن ان کی اچانک موت کی داستان نہایت عجیب و غریب ہے۔ موج اپنی والدہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ لندن میں قیام کے آخری سال ان کی والدہ شدید بیمار ہوئیں اور بیٹے کو آخری بار دیکھ سکنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ امتحانات کے سبب موج ان کا قرب حاصل کرنے کی خاطر واپس نہ جا سکتے تھے، اس لیے بے قراری اور پریشانی کے عالم میں اپنی استعمال شدہ قمیص جس میں ان کے

پسینہ کی خوشبو تھی، ماں کو بھیج دی۔ ماں نے مرتے دم تک قمیص اپنے سینہ سے لگا کر رکھی اور وفات پر ان کی خواہش کے مطابق وہ قمیص ان کے ساتھ دفنا دی گئی۔ واپس پہنچ کر موج کا معمول تھا کہ وہ صبح منہ اندھیرے اٹھتے۔ قبرستان جا کر ماں کی قبر پر حاضری دیتے اور پھر دفتر جا کر کام شروع کرتے۔ اسی طرح گرمیوں کی ایک تاریک رات زور کی بارش ہو رہی تھی۔ موج کی آنکھ کھلی تو گمان کیا کہ شاید صبح ہو گئی ہے۔ تیار ہو کر بمطابق معمول قبرستان پہنچے۔ ماں کی قبر کے قریب بقول ان کے والدہ کفن میں ملبوس ہاتھ پھیلائے کھڑی نظر آئیں۔ موج ڈر گئے اور موسلا دھار بارش میں گرتے پڑتے قبرستان سے دفتر پہنچے۔ وہاں چوکیدار سے پتہ چلا کہ ابھی تو رات کے صرف دو بجے تھے اور صبح کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ موج واپس گھر آ کر سو رہے اور دہشت کے سبب دن چڑھنے پر بھی دفتر نہ گئے بلکہ گوجرانوالہ سے لاہور آ گئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے دوستوں نے مری جانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ آپ بھی تیار ہو گئے۔ اگلے روز مری جاتے ہوئے ان کی کار حادثہ کا شکار ہو گئی۔ باقی سب احباب اور ڈرائیور تو صحیح سلامت رہے، صرف موج ہی کو شاید ان کی والدہ اپنے ساتھ لے گئیں۔

میں تقریباً پانچ برس تحقیق کے سفر پر گامزن رہا۔ سفر کی ابتدائی منازل میں تاریخ اسلام کا عمیق مطالعہ کیا۔ میرے سامنے ایک بیکراں سمندر تھا جس میں مسلم اقوام لہروں کی طرح ابھرتی، ڈوبتی اور پھر ابھرتی تھیں۔ میں نے مسلمانوں کی تاریخ کے پس منظر میں مسلم قومیت اور اسلامی ریاست کے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کے علاوہ ابن اسحاق، طبری اور الماوردی کی کتب کا مطالعہ کیا۔ مسلم سیاسی مفکروں کی تحریریں دیکھیں جو یونانی فکر سے متاثر ہوئے اور پھر اپنی طرف سے اس میں اضافے بھی کیے۔ ''مقالاتِ افلاطون'' دوبارہ پڑھے۔ نیز فارابی، غزالی، نصیرالدین طوسی، ابن خلدون وغیرہ کی تحریریں نگاہوں سے گزریں۔ یہ مطالعہ میرے تحقیقی مقالہ کے تعارفی باب کے سلسلہ میں تھا جسے تحریر کرنے میں مجھے تقریباً دو سال کا عرصہ لگا۔ اس مطالعہ نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کی کہ اسلام ایک متحرک ضابطۂ حیات تھا مگر تنزل کے طویل دور میں مسلمانوں نے خود ہی اسے گدلے پانی کی جھیل کی طرح جامد بنا دیا۔

میرے سفر کی دوسری منزل برصغیر ہند میں مسلم حکومت کے عروج وزوال کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ اس ضمن میں بلاذری کی فتوح البلدان سے لے کر مغلوں کے زوال تک جو بھی مسلم تاریخ یا اسلامی قوانین سے متعلق قابلِ ذکر کتب تھیں، میں نے پڑھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ کسی غیر مسلم تمدن میں جذب ہو جانا اسلام کی فطرت کے خلاف ہے۔ البتہ اسلام اپنے اندر کسی بھی غیر مسلم تمدن کی مثبت قدریں جذب کر کے انہیں اپنے مخصوص رنگ میں پیش کر سکنے کی اہلیت رکھتا ہے، بشرطیکہ مسلمانوں میں ایک بار پھر

اجتہادی فکر یا نظر پیدا کی جا سکے۔

میرے سفر کی تیسری منزل مسلمانان برصغیر میں احیاء اسلام کے لیے جستجو کے مطالعہ سے شروع ہوئی۔ یہ باب تحریر کرتے وقت میں شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریروں سے بے حد متاثر ہوا کیونکہ ان کا اصل مقصد برصغیر کے شمال مغربی خطے میں ''دارالاسلام'' قائم کر کے مسلمانوں پر واضح کرنا تھا کہ اسلام کا قوت، شوکت اور اقتدار کے ساتھ وہی تعلق ہے جو روح کا جسم کے ساتھ ہے۔ ان ہستیوں کا پیغام انقلابی تھا اور ہر مسلم کو فرسودگی کے خلاف بغاوت پر اکساتا تھا۔ ان کا جہاد غیر مسلم حاکموں کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ اپنی ناگفتہ بہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالت کے خلاف بھی تھا۔

چوتھی منزل برصغیر کے مسلمانوں پر نئے مغربی نظریات کے اثر کا جائزہ لینے سے شروع ہوئی۔ اس باب میں سرسید احمد خان کی شخصیت اور تحریروں کا میں نے گہرا مطالعہ کیا۔ میرے والد کی سید راس مسعود سے والہانہ محبت اور علی گڑھ سے وابستگی کا باعث یہی تھا کہ دونوں سرسید کی یادگاریں تھیں۔ سرسید برصغیر میں مسلم قومیت کے بانی تھے۔ انہوں نے پہلی بار مسلمانوں کو احساس دلایا کہ ماضی کی طرف منہ اور مستقبل کی طرف پیٹھ کر کے مت کھڑے رہیں بلکہ وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھیں اور اپنا زاویہ نگاہ بدلیں تاکہ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے قدم اٹھائے جا سکیں۔

میں اپنے سفر کی پانچویں منزل میں اتحاد اسلام (پین اسلام ازم) خلافت اور مسلم قوم پرستی کی تحریکوں کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ دو شخصیتیں جنہوں نے مجھے متاثر کیا، وہ سید جمال الدین افغانی اور مولانا شبلی تھے۔ شبلی کی توجہ کا مرکز مسلم کا شتکار تھے اور مجھے یوں دکھائی دیا جیسے ان کے ذہن میں اسلام کا تصور بحیثیت ایک فلاحی ریاست موجود تھا۔ جہاں تک جمال الدین افغانی کا تعلق ہے، میرے والد انہیں اسلام کے دور جدید کا مجدد سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلم اقوام کے وفاق کا تصور پیش کیا اور واضح کیا کہ جب تک مسلمان مغرب کے وسائل قوت کو نہ اپنا لیں، ان کے لیے یورپی امپیریلزم کو شکست دینا محال ہے۔

میرے سفر کی چھٹی منزل میں یہ تحقیق کرنا مقصود تھا کہ علامہ اقبال کے فلسفہ انفرادی خودی اور اجتماعی خودی کا برصغیر میں مسلم قوم پرستی کی تحریک پر کیا اثر پڑا۔ اس بات میں میں نے فکرِ اقبال کے سیاسی پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی اور واضح کیا کہ اس فلسفہ نے تحریک پاکستان کے لیے نظریاتی اساس فراہم کرنے میں کیا کردار ادا کیا۔ آخری منزل قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی اسٹریٹجی سے متعلق تھی جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی۔

اس فکری سفر کے دوران مجھ پر دو مزید راز کھلے۔ ایک تو یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں دو

روئیں ایک دوسری کے ساتھ متصادم ہوتی رہیں۔ پہلی روتو اس مکتبۂ فکر کی تھی جو ہندومت میں اسلام کا ادغام عمل میں لانا چاہتا تھا۔ دوسری رواس مکتبۂ فکر سے ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کی ملی تنظیم ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر اسلام کی بنیادوں پر عمل میں لانے کا خواہشمند تھا۔ قیامِ پاکستان سے ثابت ہے کہ اس تاریخی تصادم میں بالآخر کونسی رو غالب آئی۔

دوسرا راز جو مجھ پر افشا ہوا، وہ یہ تھا کہ جب سے اسلام برصغیر میں وارد ہوا، روحِ اسلام اپنی نمو کی خاطر راہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی رہی۔ گزشتہ کئی صدیوں میں کبھی تو اس نے مشاہدے کے ذریعے اور کبھی کشف کے ذریعے اسی کوشش کا اظہار کرنا چاہا۔ کبھی شہنشاہوں کے فرمان کی صورت اختیار کی۔ کبھی علماء کی وساطت سے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا، کبھی مجاہدین کی تلواروں کی راہ سے، کبھی جدید سیاست کے بھیس میں، کبھی اتحادِ اسلام کے داعی کی ہیئت میں، کبھی ادب اور کبھی فلسفہ کی شکل میں، غرضیکہ اس نے مختلف ذرائع اختیار کیے حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں جا کر اسے واضح زبان نصیب ہوئی۔ جب وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں ڈھل گئی اور بالآخر قائداعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں پاکستان کے قیام کی صورت میں اس نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد اس مقصد کو پالیا۔

لندن تو میں عموماً لنکنز ان کے ڈنرز میں شرکت کے لیے یا بی بی سی میں اپنے پروگرام ریکارڈ کرانے کی خاطر جایا کرتا مگر کیمبرج میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے علاوہ میری اور بھی بہت سی دلچسپیاں تھیں۔ قیام کے دوران انڈیا پاکستان سوسائٹی یہاں پہلے ہی سے موجود تھی اور اس کے کھانوں وغیرہ میں میں بھی دیگر پاکستانیوں کی طرح شریک ہوا کرتا۔ بعدازاں ڈاکٹر عبدالسلام، داؤد رہبر (جو عیسائی مذہب قبول کر کے امریکہ جا آباد ہوئے) اور میں نے مل کر پاکستان سوسائٹی قائم کی اور اس کے اجلاس ہونے لگے۔ ہم تینوں تو پوسٹ گریجوایٹس ریسرچ اسکالرز تھے لیکن انڈر گریجوایٹس میں لیلیٰ اصفہانی، جی معین الدین کے فرزند بوبی، جمیل نشتر، اسلم اظہر، محمد خان خاکوانی وغیرہ اور شاید سی ایس پی کے چند نوجوان تھے۔ ہندو طالبعلموں میں سے ایک پنجاب کے رمیش بھنڈاری تھے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھے ہوئے تھے۔ (بعد میں اقوام متحدہ میں میری ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ جب وہ کرشنا مینن کے سیکرٹری کے طور پر وہاں آیا کرتے تھے۔ پھر ہندوستان کے فارن سیکرٹری کے عہدہ پر فائز رہے۔ دہلی کے گورنر بھی مقرر ہوئے۔ ان کی بیگم مہاراجہ پٹیالہ کی بیٹی تھیں۔ جب لاہور تشریف لائے تو مجھے تحفہ سے نوازا۔ اب علم نہیں کہاں ہیں) پروفیسر آربری کی زیرِصدارت ایک اسلامک سوسائٹی بھی قائم تھی جس کی روحِ رواں پرنس دینا عبدالحمید تھیں۔ (دینا کی بعد میں اردن کے شاہ حسین سے شادی ہوئی اور ان سے ایک بیٹی عالیہ پیدا ہوئیں۔ شاہ حسین سے طلاق کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں انگریزی کی پروفیسر رہیں۔ پھر ایک فلسطینی کمانڈر سے شادی کی جسے

اسرائیلیوں نے گرفتار کر لیا مگر رمیش بھنڈاری کے توسط سے انہیں رہائی ملی۔ لاہور بھی تشریف لائیں اور ایک مدت کے بعد بیگم عابدہ فخر امام کے ہاں کھانے پر ان سے ملاقات ہوئی۔ اب شاید مستقل طور پر لندن میں رہائش پذیر ہیں۔)

ڈرامہ نویسی کے شوق کے سبب مجھے کیمبرج کے تھیٹر سے متعلق لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ میں چونکہ بچپن میں شیکسپیئر کے ڈرامے جولیس سیزر میں مارک اینتھونی کی معروف تقریر ڈرامائی انداز میں ادا کرنے پر دھنی رام کپ حاصل کر چکا تھا، اس لیے یہاں بھی پرائیویٹ محفلوں میں دیگر اداکاروں اور اداکاراؤں کے ساتھ ایسی مشقوں میں شریک ہوا مگر مجھے یہ جان کر تعجب ہوا کہ ان میں زیادہ تر لوگ ہم جنس پرستی کی عادت میں مبتلا تھے۔ میں بحیثیت پاکستانی یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ ایک مسلم معاشرہ میں مردوں، عورتوں کی علیحدگی کے باعث وہاں ان میں ہم جنس پرستی مقبول ہو سکتی ہے لیکن انگلستان جیسے ملک مین جہاں علیحدگی کا ایسا کوئی معاشرتی تصور موجود نہیں بلکہ مرد اور عورتیں باہم گھل مل سکتے ہیں اور شادی کے بغیر جنسی تعلقات بھی پیدا کر سکتے ہیں، وہاں ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک واقف اداکار نے مجھے بتایا کہ ڈرامے کی ادبی صنف کا تعلق یونان سے ہے اور یونانیوں کے نزدیک ایک مرد کا رفیقِ حیات مرد ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے تھیٹر کا صحیح معنوں میں اداکار وہی ہو گا جو ہم جنس پرست ہو۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے یہ گروہ کیمبرج کے ایک پب میں جمع ہوا کرتے جس کا نام باتھ تھا۔ باتھ کا ایک مے خانہ تو مرد ہم جنس پرستوں کے لیے مختص تھا اور دوسرا عورت ہم جنس پرستوں کے لیے۔ میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب مغربی دنیا یورپ اور امریکہ میں ہم جنس پرستی اتنی عام نہ ہوئی تھی جتنی اب ہے بلکہ انگلستان کے قانون کے تحت تو لواطت کو ایک نہات قبیح جرم سمجھ کر اس کی سزا مقرر تھی۔ بہر حال کچھ مدت تک ان ہم جنس پرست لڑکوں اور لڑکیوں سے میری دوستی رہی مگر چونکہ مجھے لواطت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ڈاکٹر عبدالسلام اور داؤد رہبر تو میرے ڈھب کے لوگ نہ تھے۔ ویسے بھی کیمبرج میں پاکستانی طلباء سے میرا ملنا جلنا پاکستان سوسائٹی کے اجلاسوں میں یا انڈیا پاکستان سوسائٹی کے کھانوں پر ہی ہوتا تھا۔ پیمبروک کالج میں رہائش پذیر جو میرے دوست بنے وہ تھے: گلن جونز اور جان ایون (دونوں ویلش تھے) باب باٹسفورڈ (امریکن تھے اب فوت ہو چکے ہیں) ٹیڈ گلپن (کینڈین تھے۔ بعد ازاں پاکستان میں کینڈین ہائی کمشنر کے طور پر کچھ عرصہ تک اسلام آباد میں بھی مقیم رہے۔ اب فوت ہو چکے ہیں) اور لارنس (لندن کے ایک امیر یہودی خاندان سے تعلق رکھتے تھے) ان کے علاوہ کلیئر کالج کے ایک قبرصی ترک ٹیڈی منیر (علی ارگن منیر) جان کریسول (لارڈ لیک کے خاندان سے تھے اور کیمبرج میں انوسمنٹ بیرو کے کمشنر

کی حیثیت سے مامور تھے) اور برنارڈ (جرمن یہودی تھے اور کیمبرج میں ملازمت کرتے تھے) چند انگریزوں کے خاندان بھی تھے جن کے گھروں میں میرا اکثر آنا جانا تھا۔ ان میں ایک سر ولیم بارٹن تھے جنہوں نے ہندوستان میں خدمات انجام دی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد کیمبرج میں اپنی جنگی بیوہ بیٹی پامیلا ٹاؤنز انڈ کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ دوسرے سر مائیکو بٹلر تھے جو ہندوستان میں اونچے عہدوں پر فائز رہے۔ پیمبروک کالج کے ماسٹر بنے اور برطانیہ کی ٹوری پارٹی کے وزیر اعظم راب بٹلر کے والد تھے۔ تیسری مسز کلگ تھیں جن کے شوہر سری لنکا میں کسی اہم عہدہ پر فائز رہ چکے تھے اور انہوں نے میرے تحقیقی مقالے کے ڈرافٹ کی بلا معاوضہ ایڈیٹنگ کی تھی۔

پامیلا ٹاؤنز انڈ دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس لیے انہیں دیسی کھانے بے حد پسند تھے۔ میں انہیں عموماً ''کوہ نور'' ریستوران میں کھانا کھلانے لے جایا کرتا۔ مسز کلگ عجیب وغریب مذہبی خیالات کی مالک تھیں۔ مثلاً ان کی خوبصورت بیٹی کوئینلڈا نے دو مرتبہ شادی کی غرض سے دو بوائے فرینڈز بنائے۔ پہلی مرتبہ لڑکا یہودی نکلا اور دوسری مرتبہ کیتھولک مگر دونوں مرتبہ ماں نے بیٹی کی پسند کو رد کر دیا۔ تیسری مرتبہ بیٹی نے جو بوائے فرینڈ بنایا، اس کی تصویر ان کے گلے کے لاکٹ میں آویزاں تھی۔ ایک دن وہ تصویر دیکھ کر میں نے ان سے پوچھا کہ یہ علی بابا کون ہیں۔ فرمایا کہ انڈین نیوی کے ایک سکھ افسر ہیں جو تربیت کے لیے کیمبرج آئے تھے۔ مسز کلگ کو ان کا کسی یہودی یا کیتھولک لڑکے سے شادی کرنا تو منظور نہ تھا مگر ایک سکھ داماد قبول تھا۔

ایک مرتبہ جمیل نشتر سے ''کوہ نور'' ریستوران میں ملاقات ہوئی تو وہ بہت دبلے پتلے اور بیمار لگ رہے تھے۔ میں نے خیریت پوچھی تو فرمایا کہ کیا کروں، والد (سردار عبدالرب نشتر) نے ہر قسم کے گوشت اور مرغی کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ اس لیے صرف سبزیاں یا انڈے کھاتا ہوں جس کے سبب بیمار ہو گیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ گائے یا بھیڑ بکری کے معاملہ میں یہودیوں کا ذبیحہ مسلمانوں کی طرح کیا جاتا ہے اور علامہ اقبال کیمبرج یا لندن میں قیام کے دوران وہی استعمال کرتے تھے۔ نیز مولانا شبلی کی تحریروں کے مطابق مسیحیوں کی گردن مروڑی ہوئی مرغی بھی اہل کتاب کا ذبیحہ سمجھ کر مسلمان کھا سکتے ہیں۔ جمیل نے گزارش کی کہ اس بارے میں پوزیشن صاف کرنے کی خاطر میں ان کے والد کو ایک خط تحریر کروں۔ چنانچہ میں نے سردار صاحب کو خط تحریر کیا جس میں ''مقالاتِ شبلی'' اور ''حیاتِ اقبال'' کے حوالے دیئے۔ سردار صاحب نے اپنی تسلی کر لینے کے بعد جمیل کو گوشت یا مرغی کھانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

انہی ایام میں منیرہ، میاں صلی اور آنٹی ڈورس لندن پہنچے۔ تب منیرہ کے پہلے بیٹے اسد کی عمر تقریباً

دو سال تھی۔ آنٹی ڈورس تو دس بارہ روز کے لیے اپنی والدہ اور عزیزوں سے ملنے جرمنی چلی گئیں مگر منیرہ، میاں صلی اور اسد نے ہفتہ بھر میرے ساتھ کیمبرج میں گزارا اور خوب سیر کی۔ وہ سب کوئی مہینہ بھر لندن میں ٹھہرنے کے بعد لاہور واپس چلے گئے۔

مغربی معاشرہ میں ڈانس (رقص) کی ایک مخصوص کلچرل حیثیت ہے۔ کیمبرج میں ڈوروتھی کیفے مشہور مقام تھا جس کے ہال میں روز تین بجے سے لے کر پانچ بجے شام تک ٹی (چائے) ڈانس ہوا کرتا تھا۔ کئی اور ہال بھی اسی مقصد کے لیے مختص تھے جن میں ڈانس کے ذریعے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے دوست بننے کے مواقع ملتے تھے اور بعض اوقات یہی دوستی شادی کی صورت بھی اختیار کر سکتی تھی۔ ایسے ڈانس ہالوں سے علیحدہ کیمبرج میں ایک انٹرنیشنل کلب بھی تھی جو ہر ہفتے اپنے ہال میں ڈانس کا اہتمام کرتی۔ اس کلب کا مقصد فارن یعنی یورپین لڑکیوں کو یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکوں سے ملانا تھا۔ کلب ایک جرمن یہودی خاتون مس ارسل چلاتی تھیں جنہیں ٹینگو ڈانس بے حد پسند تھا اور مجھ سے عموماً ٹینگو کے مشکل سٹیپ سیکھا کرتیں۔

انگریزی یونیورسٹیوں میں پڑھائی کے ساتھ کھیل کود، پارٹیاں یا جشن منانے کا بھی بڑے زور شور سے اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی طرح کیمبرج میں بھی ہر سال امتحانوں کے نتائج نکلنے کے بعد جون کے پہلے ہفتہ میں ہر کالج ''مے بال'' مناتا۔ بال میں ڈریس سوٹ پہننا لازمی ہوتا۔ ہر لڑکا گرل فرینڈ لاتا اور ساری رات ڈانس کرتے گزرتی۔ صبح ناشتہ عموماً کیمبرج سے باہر ایک گاؤں گرانچسٹر کے ریستوران میں کیا جاتا۔ میں ایسے سب مشاغل میں بڑے شوق سے شریک ہوتا۔ ہر سال ''مے بال'' میں اپنے کالج کے دوستوں کے ہمراہ رقص کرتے ہوئے ساری رات گزارتا۔ البتہ جہاز کے ہفتہ وار ڈانس میں مجھے مسز پامیلا تھامس نے واضح کر دیا تھا کہ پولائٹ سوسائٹی میں پروفیشنل طریقے سے ڈانس کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

جون کے ماہ ہی سے موسم گرما کی تعطیلات شروع ہو جاتی تھیں جو ستمبر کے اختتام تک رہتیں۔ پہلے سال تو میں نے گرمیوں کی چھٹیاں کیمبرج یا لندن ہی میں گزاریں یا چند دنوں کے لیے ایڈنبرا دیکھنے گیا مگر بعد کے سالوں میں موج یا لارنس اور اس کے بھائی الفرڈ کے ساتھ کار میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے گزریں۔ میں نے فرانس، مغربی جرمنی، ڈنمارک، اٹلی، آسٹریا، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، بلجیم وغیرہ کے بڑے شہر خوب دیکھے لیکن جس شے نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ جرمنی میں جنگ کی تباہی کے بعد انتہائی سرعت کے ساتھ اس کی تعمیر نو تھی۔ جرمنی کے کسی بھی تباہ شدہ شہر میں رات کو سو سکنا ناممکن تھا۔ چونکہ عمارتوں کی تعمیر کا شور دن تو کیا راتوں کی نیند بھی حرام کرتا تھا۔ سردیوں میں کرسمس کی تعطیلات کے دوران زندگی بالکل مفلوج ہو جاتی کیونکہ یہ تہوار خصوصی طور پر گھروں کی پرائیویسی میں منایا جاتا تھا۔ اس لیے میں یا

تو یہ چھٹیاں کیمبرج میں اپنی طرح کے تنہا لوگوں مثلاً برنارڈ کے ساتھ اپنے کمرے میں خاموشی سے گزارتا یا ایک دو مرتبہ باب باٹسفورڈ کے ساتھ لنکا شائر میں ایک فیملی کے ساتھ گزارنے کا اتفاق ہوا۔

کیمبرج میں میری چند مزید دلچسپیوں میں سے ایک سائیکک ریسرچ سوسائٹی کا ممبر بننا تھا۔ اس سوسائٹی کے سربراہ برطانیہ کے معروف نفسیات کے ماہر پروفیسر براڈ تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری اپنی ڈرامہ نویسی میں نیچرل عنصر کے ساتھ سوپر نیچرل عنصر (روحانی نہ سہی) کا بڑا عمل دخل تھا۔ میرے نزدیک انسانی زندگی حرکت کے عمل میں نیچرل اور سوپر نیچرل دونوں عناصر سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ڈرامے کے کرداروں میں جب تک سوپر نیچرل عنصر کی پراسراریت شامل نہ کی جائے تو بات نہیں بنتی مگر پروفیسر براڈ کسی اور ہی طرح کے تجربات کے ذریعہ کچھ اور ہی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً وہ تجربات کے ذریعہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ''پری کاگنیشن'' (کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس سے آگاہ ہونا) کی صلاحیت پر اگر ہمارا کنٹرول ہو جائے تو سائنسی طور پر آنے والے واقعات کا علم ان کے وقوع پذیر ہونے سے قبل ہو سکتا ہے۔ بعض اشخاص میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اگر وہ ارادہ کر کے ڈائس پھینکیں تو جس ہندسہ کا ارادہ کیا ہو، وہی پھینکنے پر آئے گا اور غلطی کا امکان ایک ہزار دفعہ پھینکنے میں صرف ایک دفعہ ہو گا۔ براڈ کا خیال تھا کہ ایسی صلاحیت کے ممکنہ عمل کی نوعیت کو مشینی طور پر قابو میں لایا جا سکے تو ہم مرضی کے مطابق اسے جنریٹ کر کے اسے آپریٹ کرنے کے قابل ہو سکیں گے لیکن جتنے برس میں اس سوسائٹی کا ممبر رہا وہاں سادھو سنت لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو جاری رہا تجربات کے ذریعہ اس مخصوص صلاحیت پر کنٹرول حاصل نہ ہو سکا۔

میں آرٹ کی کلاسوں میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوتا تھا کیونکہ مصوری اور مجسمہ سازی میرے پرانے مشغلے تھے۔ لڑکیاں جو کیمبرج میں میری واقف بنیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق مصوری، مجسمہ سازی یا سازسنگیت ہی سے تھا۔ ان میں بعض تو بے حد خوبصورت تھیں، گویا ہاتھ لگانے سے ان کے میلے ہو جانے کا امکان تھا مگر بقول علامہ اقبال۔

چوں نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروے
تپدآں زماں دلِ من پے خوبتر نگارے
زشرر ستارہ جویم، زستارہ آفتابے
سر منزلے نہ دارم، کہ بمیرم از قرارے

(پیام مشرق)

(میری نگاہ جب کسی ماہ جبین کے حسن پر پڑتی ہے تو اسی لحہ میرا دل اس سے بھی خوب تر کسی حسینہ

کے لیے دیوانہ وار خواہش کرنے لگتا ہے۔ میں چنگاری میں ستارہ ڈھونڈتا ہوں اور ستارے میں آفتاب۔ میرے سفر کی کوئی منزل نہیں کیونکہ کسی مقام پر ٹھہر جانا میرے لیے موت ہے۔)

میں نے لاہور میں رہتے ہوئے اس بازار میں کسی سے روابط پیدا کرنے سے گریز کیا۔ حالانکہ احباب کسی نہ کسی منزل پر قیام کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان میں بھی جذبات کے سفر میں میں قیام کا قائل نہ ہو سکا کیونکہ ایک تو سرد ممالک کے پھول اپنے حسن و جمال کے باوجود خوشبو سے عاری تھے اور دوسرے میں اپنی رفیقۂ حیات، اپنے نوزائیدہ وطن کی خاک میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات ضرور تھی۔ میری ''ڈگز'' میں پارٹیوں کی جان یا مغربی رقص و سرود کی محفلوں کی رونق انہی کے سبب تھی۔ میں نے پاکستان سے سونے اور چاندی کے ورق بھی کثیر تعداد میں منگوار کھے تھے جوان پارٹیوں میں موچنے سے پکڑ کر مشروبات میں ڈال کر یا کھانے کی اشیاء پر لگا کر پیش کیے جاتے۔ اس زمانے میں جب جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ابھی تک بنیادی اشیائے خورد و نوش نایاب تھیں، لوگ اس نئی طرز کی جدّت یا بدعت انگیز مہمان نوازی سے بے حد مسرور ہوتے بلکہ مجھے جاوڈ کہہ کر بلانے کی بجائے پرنس ڈیوڈ کہتے۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتا چلوں۔ ''بلیوبور'' ہوٹل کی ضعیف العمر بارمیڈ ایتھل جو پیمبروک کی فٹبال ٹیم اچھی ہونے کے سبب کالج کے سارے طلباء سے پیار کرتی تھیں، کو کولہے میں گنٹھیا کا عارضہ لاحق ہوا۔ انگلستان کی نیشنل ہیلتھ اسکیم کے تحت ہر شخص کا علاج معالجہ مفت ہوتا اور ادویات بھی مفت ملتی تھیں مگر ایتھل کے آئرش ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی تکلیف دور کرنے کے لیے کلیسم آف گولڈ کے ٹیکے لگیں گے جو نیشنل ہیلتھ اسکیم میں شامل نہیں اور انہیں اپنی گرہ سے خرید کرنے پڑیں گے۔ ایتھل اسکاٹ نسل سے ہونے کے سبب بہت کنجوس تھیں، اس لیے ٹیکے خریدنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک دن مجھ سے پوچھا: ''پرنس ڈیوڈ! میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کو گولڈ کھلواتے ہو۔ میں اپنے علاج کے لیے کلیسم آف گولڈ کے مہنگے ٹیکے خریدنے کو تیار نہیں۔'' سو ایتھل کی فرمائش پر میں نے انہیں تین چار سونے کے ورق جیب سے نکال کر دیئے جو وہ چپس کے ساتھ نگل گئیں۔ اگلے روز جب اپنے ڈاکٹر کے پاس مزید ٹیسٹ کے لیے گئیں تو بیماری کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ ایتھل سے میرا ذکر سن کر ڈاکٹر نے مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ہماری ملاقات ''بلیوبور'' ہی میں ہوئی۔ ایتھل کا نوجوان آئرش ڈاکٹر غالباً ابھی اپرنٹس تھا۔ آئرش لوگ عموماً بڑے توہم پرست، جادو ٹونے یا جنوں بھوتوں کے قائل اور سادہ لوح سمجھے جاتے ہیں۔ مجھ سے نہایت مودبانہ انداز میں کہنے لگے۔ ''یور ہائی نس! میں آپ کو ''گرو'' مانتا ہوں اور آپ کا ''چیلا'' بننا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ میں سونے کے ورقے کے تجزیے سے گنٹھیا کے مرض کا کوئی نیا فوری

علاج دریافت کر سکوں۔'' میں نے اسے کچھ ورق تھماتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر! میں یور ہائی نس نہیں ہوں۔ نہ ہی میں ''گرو'' ہوں۔ ہمارے یہاں ''گرو'' کے بجائے ''پیر'' ہوتے ہیں اور ''چیلوں'' کی بجائے ''مرید'' ہوتے ہیں مگر میں ''پیر'' بھی نہیں ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو ایک ''درویش'' سمجھتا ہوں۔'' وہ بڑا متعجب ہو کر بولا۔ ''درویش'' کیا ہوتا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ ''درویش'' وہ ہوتا ہے جو عقاب کی خصوصیات رکھتا ہو۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''عقاب کی خصوصیات کیا ہیں؟'' مجھے اسی وقت علامہ اقبال کے ایک خط میں تحریر کردہ عقاب کی خصوصیات یاد آ گئیں۔ میں نے فوراً کہا۔ ''بلند پرواز ہے۔ تیز نگاہ ہے، خلوت پسند ہے، آشیانہ نہیں بناتا۔ کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔'' آئرش ڈاکٹر مجھ سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ بار بار کہتا۔ ''میں نے آج تک کبھی ایسی علمی باتیں نہیں سنیں۔ کیا آپ کے ملک میں سب سونا چاندی کھاتے ہیں؟'' میں نے رازدارانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔ ''سونا چاندی ہی نہیں بلکہ ہیرے، جواہرات، زمرد، یاقوت سب کھا جاتے ہیں۔ تبھی تو ہمارا ملک قلاش ہے۔''

۱۹۵۴ء کے وسط میں میرا تحقیقی مقالہ مکمل ہوا اور میں نے قاعدے کے مطابق اس کی دو جلدیں یونیورسٹی کے دفتر میں داخل کرا دیں۔ تیسری جلد اپنے پاس رکھی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد غالباً اکتوبر میں میں اورینٹل فیکلٹی میں اس موضوع کے ماہر دو پروفیسروں کے سامنے پیش ہوا جنہوں نے مقالہ پڑھا ہوا تھا اور اس کے ہر باب سے متعلق تقریباً دو گھنٹوں کی بحث کے بعد زبانی امتحان ختم ہوا۔

کیمبرج میں اب مزید قیام کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ کیمبرج سے رخصت ہونے سے پیشتر میری بائیسکل (تالے سمیت) اور گاؤن دونوں چوری ہو گئے۔ چوری کرنے والے ضرور کوئی قلاش طالب علم ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے پولیس میں رپٹ نہ لکھوائی کیونکہ میری اشیاء کسی ضرورت مند انگریز کے کام ہی آئی ہوں گی۔ میں نے اپنے بہت سے کپڑے اور چیزیں اپنی لینڈ لیڈی مسز ریمزی کو دے دیں۔ وہ انہیں پا کر بہت خوش ہوئیں۔ ۱۹۵۴ء کے آخر میں میں اپنے دونوں کیبن ٹرنکوں سمیت لندن پہنچ کر لندن ہاؤس میں جا مقیم ہوا۔ انگلستان میں میری تعلیمی سرگرمیاں اب قریب قریب اختتام تک پہنچ چکی تھیں۔ بار کے امتحانات کا صرف دوسرا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ ڈنرز مکمل ہو چکے تھے۔ بار کے دوسرے پارٹ کی تیاری کے لیے میں نے پرائیویٹ لاء کالج میں کلاسیں لینی شروع کر دیں۔ لندن ہاؤس کامن ویلتھ کے ممبر ملکوں کے طلباء کے لیے وقف تھا اور اس میں رہنے کا فائدہ یہ تھا کہ رسل اسکوائر کے علاقے میں واقع ہونے کے سبب وہ لندن یونیورسٹی، برٹش میوزیم اور انز آف کورٹ کے بہت قریب تھا۔

مجھے لندن کبھی پسند نہ آیا۔ یہاں ہمیشہ دھند رہتی اور پیدل چلتے وقت چہرے پر بارش کی مسلسل پھوار سے طبیعت سخت بیزار ہوتی۔ علاوہ اس کے فضا میں سیاہی کے سبب قمیصوں کے کالر، ناک منہ سب

کالے ہو جایا کرتے۔ لندن میں میرے قیام کے دوران جن پاکستانی دوستوں سے ملاقاتیں رہیں ان میں اعجاز بٹالوی، ان کے برادر عاشق بٹالوی اور مجید نظامی تھے۔ غلام مجدّد بھی بار کے امتحان پاس کرنے کی خاطر لندن آ پہنچے۔ عیدین کی نمازیں ریجنٹ پارک کے اسلامی سنٹر میں پڑھی جاتیں۔ ۱۴۔ اگست کو یوم آزادی عموماً پاکستانی ہائی کمیشن کے لان میں منایا جاتا۔ یہیں مراد کے ساتھ میری پہلی بار ملاقات ذوالفقار علی بھٹو سے ہوئی جو آکسفورڈ سے اُس میں شرکت کے لیے لندن آئے ہوئے تھے۔ دو تین بار بعد میں بھی لندن میں اُن کی معیت میں وقت گزرا مگر وہ مجھ سے پیشتر انگلستان چھوڑ کر شاید امریکہ چلے گئے۔ کیمبرج کے بعض دوست بھی اب لندن آ گئے تھے۔ ان میں گہرے دوست تو ٹیڈی منیر اور باب باٹسفورڈ ہی تھے۔

باب باٹسفورڈ کے ذریعہ لندن میں ایک ادبی گروہ سے وابستگی پیدا ہو گئی۔ ان لوگوں کا مشن گیلک زبانوں (یعنی ویلش، آئرش، اسکاٹ) اور کلچر کا فروغ تھا۔ ڈلن تھامس جیسے جدید شاعر اور ہمیش ہملٹن جیسے ادیب ان میں شامل تھے۔ یہ سب دانشور دراصل نسلاً ویلش، آئرش یا اسکاٹ تھے اور انگریزوں (جن کو نسلاً اینگلو سیکسن کہا جاتا ہے) سے اپنے آپ کو گیلک ہونے کے ناطے سے مختلف سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کی جدید تحریریں رسالہ انکاؤنٹر میں شائع ہوتی تھیں جس کے ایڈیٹر اس زمانہ کے معروف نقاد اسٹیفن اسپنڈر تھے۔ یہ لوگ عقیدتاً سوشلسٹ تھے اور ان کا سیاسی موقف یہ تھا کہ برطانیہ میں کراؤن یا بادشاہت کا خاتمہ کر کے اسے امریکی طرز کی وفاقی جمہوریت یعنی چار اٹانومس ریاستوں (ویلز، اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور انگلینڈ) پر مشتمل ریاست ہائے متحدہ برطانیہ (یو۔ ایس۔ بی) کی شکل دے دی جائے۔ خیال تو اُچھوتا تھا اور اس سے پرانے آئرش مسئلہ کا حل بھی ممکن تھا مگر پامیلا تھامس جو کیمبرج یونیورسٹی دیکھنے کی خاطر ایک بار وہاں آ چکی تھیں اور اب دوسری شادی کے بعد پامیلا ٹیلر کہلاتی تھیں، اس سوسائٹی کو غداروں کا ٹولہ سمجھتی تھیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ لندن میں ان لوگوں سے میرا رابطہ ہے تو بہت ناراض ہوئیں۔

میں نے لندن میں قیام کے دوران دو مرتبہ بار فائنل کا امتحان دیا۔ پہلی بار فیل ہوا لیکن دوسری بار کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران کیمبرج یونیورسٹی نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ میرا تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور ہو گیا ہے اور ڈگری کی وصولی کے لیے میں یونیورسٹی کی تقریب میں شریک ہو سکتا ہوں مگر میں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کی اور استدعا کی کہ ڈگری بذریعہ ڈاک مجھے ارسال کر دی جائے، لہٰذا ایسا کر دیا گیا۔ انز آف کورٹ سے بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کر لی گئی اور میں نے لندن سے واپس پاکستان روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی۔ بی بی سی کے مسٹر رسل کا خیال تھا کہ میں لندن ہی میں قیام کروں اور بی بی سی کے لیے لکھتا رہوں۔ نیز لندن میں ٹیلی ویژن بھی شروع ہونے والا تھا اور میرے ڈرامے انگریزی میں منتقل کر کے پیش کیے جا سکتے تھے لیکن لندن مجھے پسند نہ تھا۔ ویسے بھی اب

انگلستان سے میں نے دل اٹھالیا تھا۔

واپسی کا انتظام بھی میں نے اینکر لائن کے بحری جہاز ''سیسلیہ'' کے ذریعے کیا۔ دو کیبن ٹرنکوں کے ساتھ جیسے میں لورپول سے لندن آیا تھا۔ اسی طرح اگست ۱۹۵۶ء کی آخری تاریخوں میں میں لندن سے لورپول پہنچا مگر جانے کا سفر ویسے نہیں تھا جیسے آنے کا تھا۔ جہاز کی روانگی کے وقت میں بے حد اداس، تنہا اور اپنے مستقبل کے بارے میں نہایت مایوس اور خوفزدہ تھا۔ جہاز اسی سمندری رستہ سے واپس گیا جس رستے سے آیا تھا مگر دوران سفر جہاز کے عرشہ پر بیٹھ کر متلاطم سمندر کی طرف طویل مدت تک میرا گھور گھور کر دیکھتے رہنا معمول بن گیا تھا۔ رشیدہ اخوند (یواین او میں پاکستان کے سفیر اقبال اخوند کی ہمشیرہ) میری ہمسفر تھیں جو لندن یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس کراچی جا رہی تھیں۔ ان کے علاوہ چند بنگالی طلباء تھے جنہوں نے کراچی سے بالآخر ڈھاکہ پہنچنا تھا۔

کراچی بندرگاہ پہنچنے پر منیرہ اور میاں صلی میرا استقبال کرنے اسی طرح آئے ہوئے تھے جیسے مجھے الوداع کہنے آئے تھے اور انہیں دیکھ کر نہ صرف میری ڈھارس بندھی بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے سات برس کا عرصہ ایک لمحہ میں گزر گیا۔ میں روتے ہوئے ان دونوں سے بغلگیر ہو گیا۔ ایک روز کراچی میں ٹھہرنے کے بعد ہم بذریعہ ریل لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر عزیز واقارب، دوست احباب سب موجود تھے مگر میرے دل میں ایک خلش سی تھی۔ میں نے چودھری محمد حسین مرحوم کے صاحبزادوں کو مجھے ان کی تربت پر لے جانے کے لیے کہا۔ ہم میاں امیر الدین کے ہمراہ اسٹیشن سے اقبال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کی تاریکی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور ہم سب موٹر کار میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا کیونکہ مجھے ایک بار پھر اس خوف نے آلیا تھا جس کی موجودگی کا احساس کئی بار مجھے کیمبرج اور لندن کی سرد اور تاریک راتوں کی تنہائی میں ہو چکا تھا۔ میں رہ رہ کر سوچتا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اب میرا کیا بنے گا؟

اسی عالم میں ہم اقبال پارک پہنچ گئے اور چودھری صاحب کی لحد کی طرف پیدل چلنے لگے۔ چودھری صاحب کے تینوں صاحبزادے میرے آگے آگے تھے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صاحبزادے ایک مقام پر پہنچ کر رک گئے۔ مجھے اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، اس لیے میں نے نفیس سے پوچھا: ''کہاں ہیں چودھری صاحب؟'' وہ بولا۔ ''یہ ہیں۔'' میں نے تاریکی میں فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے لیکن فاتحہ پوری نہ ہوئی۔ تاریکی نے مجھے رلایا، بہت رلایا۔

واپسی پر میاں امیر الدین کہنے لگے۔ ''یہاں تک آئے ہو تو اپنے والد کے مزار پر بھی ہوتے چلو۔ مزار کی تکمیل وہ آخری کام تھا جو چودھری صاحب نے انجام دیا۔'' مگر میرے لیے تو چودھری صاحب

کی لحد پر حاضر ہونا ہی والد کے مزار کی زیارت کے برابر تھا لیکن چلتے چلتے معاً مجھے محسوس ہوا جیسے رات کی خاموش تاریکی میں چودھری صاحب میرے ساتھ آ ملے ہیں اور مجھے مزار اقبال کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ گویا انہیں میرے احساسِ زیاں کی پروا نہیں، گویا ان کا انتقال تو ایک فطری امر تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ زندہ لوگوں کے انجام دینے کے لیے بہت سے ایسے اہم فرض ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور جو اہم فرائض انجام دیتے ہیں، وہ نہیں مرتے۔

باب ۶

پاؤں میں چکر

میرے لاہور پہنچنے سے پیشتر خواجہ عبدالرحیم جاوید منزل خالی کر کے جیل روڈ پر ایک کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے۔ جاوید منزل میں آنٹی ڈورس اور علی بخش موجود تھے۔ آنٹی ڈورس اب ایک جرمن کمپنی میں ملازم تھیں مگر رہتی جاوید منزل ہی میں تھیں۔ باورچی کی خدمات انجام دینے کے لیے عبدالغنی کو رکھ لیا گیا تھا۔ جاوید منزل دوبارہ آباد کرنے کی خاطر منیرہ اور میاں صلی مع اپنے بچوں اسد اور یوسف و ذاتی ملازمین بھی میرے ساتھ رہنے لگے۔ دو ایک سال بعد منیرہ کا تیسرا بیٹا جاوید منزل ہی میں پیدا ہوا۔ اس لیے اس کا نام منیرہ نے اقبال رکھا۔

میرے پرانے احباب درویشوں کا گروہ بشیر، بخاری، بھائی مختار، بھائی رفیع، شفیق، عزیز، لغاری (اب ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں) بھی باقاعدہ ہر ہفتہ کی شب یہیں گزارنے لگے اور پرانے وقتوں کی رونقیں واپس آ گئیں۔ سات برس کے وقفہ کا اثر میرے دیسی کھانوں کے ذوق پر تو قطعی نہ پڑا، البتہ اب میں زیادہ تر سیاہ یا سلیٹی رنگ کے سوٹ پہنتا، سفید قمیض پر ہارڈ کالر لگاتا اور نکٹائیوں کا رنگ بھی شوخ ہونے کی بجائے بلیک یا گرے ہو گیا۔ علاوہ اس کے انگلستان کا وہ موسم جس سے مجھے نفرت ہوا کرتی تھی یعنی ہر وقت دھند یا نیم تاریکی کے عالم میں زندگی گزارنا، اب مجھے اچھا لگنے لگا، لہٰذا میری کوشش یہی ہوتی کہ جاوید منزل میں دن کی دھوپ میں بھی اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے کھینچ کر نیم تاریکی کا ماحول پیدا کیا جا سکے اور بتیاں جلا کر کام ہو۔

لاہور واپس پہنچنے پر میرے لیے ایک اہم مسئلہ اپنی وکالت کا کاروبار شروع کرنا تھا۔ اس کے لیے چند اقدام نہایت ضروری تھے۔ مثلاً ہائیکورٹ کے قریب مناسب دفتر کی تلاش، منشی کا تقرر، اہم کتب کی فراہمی اور ٹرانسپورٹ کے لیے موٹر کار کا انتظام۔ میاں طفیل کے مطابق والد کی چند کتب کی اشاعت کی رائلٹی ابھی وصول کرنا باقی تھی۔ اس لیے جتنے سرمایہ کی مجھے ضرورت تھی، موجود نہ تھا۔ علی بخش نے اپنے بچائے ہوئے روپوں میں سے میری مدد کرنا چاہی مگر میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیش کش قبول

نہ کی۔ البتہ میاں صلی سے پانچ ہزار روپے ادھار لے کر ایک سیکنڈ ہینڈ مورس مائینر موٹر کار خریدی۔ بشیر احمد نے ملک خدا بخش بچہ کی وساطت سے مال روڈ پر ہائی کورٹ کے سامنے ''پلومر'' دکان کے اوپر میرے لیے نہ صرف ایک دفتر کا بندوبست کر دیا بلکہ اپنے کسی جاننے والے تجربہ کار منشی کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ فیروز سنز کے ذریعہ چند ضروری کتب بھارت سے خریدی گئیں اور یوں میں نے وکالت کا کام شروع کیا۔

چونکہ ابھی ابتدائی زمانہ تھا، اس لیے خواجہ عبدالرحیم کے دفتر میں کچھ مدت تک بیٹھتا رہا۔ پھر انہی کے کہنے پر ملک محمد اکرم مرحوم (جو بعد میں ہائیکورٹ اور پھر سپریم کورٹ کے جج کے منصب پر فائز رہے) کے دفتر میں کام سیکھنے کی کوشش کی اور ان کے جونیئر خواجہ طفیل مرحوم کے ساتھ نچلی عدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ وکالت کا کام نہایت مشکل کام ہے۔ نچلی عدالتوں سے واپس آتے وقت میرے بوٹ، کپڑے، بال اور چہرہ گرد و غبار سے لت پت ہو جایا کرتے مگر میں نے نہ تو خواجہ عبدالرحیم سے کچھ سیکھا، نہ ملک محمد اکرم سے اور میرے سال دو سال یونہی ضائع ہو گئے۔ یا تو مجھ میں ایک اچھا وکیل بن سکنے کی صلاحیت نہ تھی یا میرے اساتذہ میں کسی دوسرے کو کام سکھا سکنے کی اہلیت نہ تھی۔

ہمارے ہاں وکالت کے پیشے میں رقابت بہت پائی جاتی ہے۔ جس کسی کا کام چل نکلے، دوسرے اس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ البتہ اس کے سامنے اس کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ سو اس پیشہ میں رقابت اور منافقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ عام طور پر کسی نامور وکیل کا شاگرد بننے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ہر نامور وکیل اپنے کاموں میں اتنا مصروف ہوتا ہے کہ وہ کسی شاگرد کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ علاوہ اس کے زیادہ تر وکیل جن سے بار روم میں ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے، عموماً کام کے بغیر ہوتے ہیں۔ زیادہ مصروف وکیل تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور وہ بار روم میں شاذ و نادر ہی آتے ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ منظور قادر مرحوم کے چیمبر میں بھی گزارا۔ ایک مرتبہ کہنے لگے: ''تم شروع ہی سے میرے پاس کیوں نہ آئے؟'' میں نے جواب دیا: ''تین باتوں کی وجہ سے۔ ایک یہ کہ آپ دہریے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ پاکستان کے قیام کے خلاف تھے اور تیسرے یہ کہ آپ نے جمہوریت کی بجائے آمریت کا ساتھ دیا۔'' فرمایا۔ ''جو کچھ تم نے کہا، تھوڑی ترمیم کے ساتھ درست ہے۔ میں دہریا نہیں، ایگناسٹک ہوں۔ میں پاکستان کے قیام کے خلاف ضرور تھا مگر جب اکثریت نے اس کے قیام کی حمایت کی تو میں نے بھی اسے قبول کر لیا۔ باقی میں نے کسی آمریت کا ساتھ نہیں دیا۔ مجھ سے بنیادی جمہوریتوں اور نئے آئین کے بارے میں قانونی مشورہ لیا گیا اور بحیثیت وکیل میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔'' یہ منظور قادر کی اپنی طرز کی دیانتداری تھی۔ جب لندن کے کسی ہسپتال میں قریب المرگ تھے تو علامہ اقبال کا فارسی و اردو کلام مجھ سے منگوا بھیجا۔ بقول ان کے کلامِ اقبال پڑھنے سے موت کا خوف انہیں پریشان نہیں کرتا تھا۔

نامور وکلاء میں سے صرف سردار محمد اقبال ایڈووکیٹ (بعد میں چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) کا چیمبر تھا۔ جہاں سردار صاحب کی ذاتی توجہ کے سبب ان کے جونیئر بھی نامور وکیل بنے یا ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ میری بدقسمتی تھی کہ پیشہ وارانہ رقابت کے سبب مجھے خواجہ عبدالرحیم نے ان کے چیمبر میں کام کرنے کی اجازت نہ دی۔ اسی دوران ملک محمد اقبال مرحوم کلرک آف کورٹ بورڈ آف ریونیو لاہور (جو علامہ اقبال کے شیدائی ہونے کے ناطے سے میری وکالت کو بڑھانا اپنا عقیدہ سمجھتے تھے) کی مدد سے بورڈ آف ریونیو سے متعلق کیس آنا شروع ہو گئے۔ یہ کیس زیادہ تر اشتمال، اراضی کے انتقال، نمبرداروں کی تقرریوں اور ٹرانسپورٹ کے بارے میں ممبر بورڈ آف ریونیو کے روبرو پیش کئے جاتے تھے۔ اسی طرح جسٹس جان جوان دنوں کسٹوڈین کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے، نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ ہائیکورٹ کے جج صاحبان عام طور پر اور جسٹس عبدالعزیز خان، خصوصی طور پر بڑے مہربان تھے۔ میرے ابتدائی زمانہ میں جسٹس ایس اے رحمان مغربی پاکستان، ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے۔

ان ایام میں بیشتر نامور وکیل پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں جزوقتی لیکچرار تھے۔ میں بھی پرنسپل امتیاز علی کی مہربانی سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر جزوقتی لیکچرار مقرر کر دیا گیا۔ میں کالج میں ''ایکووٹی'' پڑھاتا تھا اور میرے لیکچر سننے کے لیے دوسری کلاسوں کے طلباء بڑے شوق سے آیا کرتے تھے۔ اس پرچہ کا نتیجہ بھی اکثر بہت اچھا نکلا کرتا۔ یہ سلسلہ چودہ برس (یعنی ۱۹۷۰ء) تک جاری رہا۔ آخری چند سالوں میں میں نے ریڈر کے طور پر بھی پڑھایا۔ کالج میں میری موجودگی کے سبب ڈرامیٹک سوسائٹی قائم کی گئی جس میں سردار اقبال موکل نے بڑی دلچسپی لی۔ ہم ہر سال کوئی نہ کوئی ڈرامہ اسٹیج کرتے تھے مگر بالآخر میرے ایک ڈرامہ سے ''مرتا کیا نہ کرتا'' کو فیلڈ مارشل ایوب خان اور پیر صاحب دیول شریف کے خلاف ہجو سمجھتے ہوئے پرنسپل نے بین کر دیا۔ ایم انور بیرسٹر نے پرنسپل لاء کالج کے خلاف ہائیکورٹ میں رٹ کرنا چاہی مگر میں نے انہیں منع کر دیا۔ بہرحال ڈرامہ پروڈکشن میں میری عدم دلچسپی کے سبب ڈرامیٹک سوسائٹی ختم ہو گئی اور پھر کبھی کوئی ڈرامہ اسٹیج نہ کیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۷ء میں اقبال اکادمی (جس کا مرکزی دفتر تب کراچی میں ہوا کرتا تھا) نے یوم اقبال کی تقریب میں شرکت کے لیے مجھے کراچی مدعو کیا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد یہ پہلا یوم اقبال تھا جس میں میں شریک ہوا۔ جلسہ کا اہتمام میٹروپول ہوٹل کے ہال میں کیا گیا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر، میاں افتخار الدین اور قدرت اللہ شہاب سمیت کراچی کی بعض اہم شخصیات جلسہ میں موجود تھیں۔ کئی اقبال شناسوں نے فکر اقبال کی مختلف جہتوں پر تقریریں کیں۔ علی بخش کو بھی بلایا گیا تھا۔ سو اس نے بھی تقریر کی۔ میں نے اس

موقع پر انگریزی میں ایک مقالہ پڑھا جس کا موضوع تھا: ''جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال'' مختصراً مقالہ میں میرا موقف یہ تھا کہ اسلام میں ''لبرل ازم'' کی تحریک ہی پاکستان کی نظریاتی اساس فراہم کرتی ہے۔ سردار عبدالرب نشتر کو اصطلاح ''لبرل ازم'' کے معانی سمجھنے میں دقت پیش آئی اور اس غرض کے لیے شام کو مجھے اپنی رہائش گاہ پر بلایا۔ ملاقات پر میں نے عرض کیا کہ اصطلاح سے مراد وسیع النظری، رواداری اور کسی مخصوص فرقہ یا فقہی مکتبہ فکر کے نظریات سے بالاتر ہو کر سوچنا اور بذریعہ اجتہاد وقت کی ضروریات کے مطابق شریعت اسلامی کی تعبیر کرتے ہوئے قانون سازی میں نئے رستے تلاش کرنا ہے۔ پھر میں نے انہیں کیمبرج میں جمیل نشتر پر گوشت اور مرغی کھانے پر ان کی عائد کردہ پابندی کا حوالہ دیا جو بعدازاں ہٹا دی گئی۔ وہ میری بات کو سمجھ تو گئے مگر فرمایا کہ اس تحریک کو ''لبرل ازم'' کے نام سے منسوب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی تو اصل اسلام ہے۔

میں کراچی میں بھائی اعجاز احمد کے ہاں مقیم تھا۔ قدرت اللہ شہاب کا فون آیا کہ صدر پاکستان سکندر مرزا نے مجھے لنچ پر مدعو کیا ہے اور میں ساڑھے بارہ بجے دوپہر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ سات ماہ پیشتر جب میں انگلستان سے کراچی پہنچا تھا تو چودھری محمد علی وزیراعظم پاکستان کے فرائض انجام دے رہے تھے اور انہی کی انتھک کوششوں سے ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ ہوا تھا۔ ان کی جگہ اب شاید ملک فیروز خان نون وزیراعظم تھے۔ بہرحال میں ساڑھے بارہ بجے شہاب کے دفتر پہنچ گیا جو ایوان صدر میں واقع تھا۔ شہاب نے سکندر مرزا کو کراچی میں میری آمد کی اطلاع دی تھی۔ اس سے پیشتر شہاب ہی کی وساطت سے سکندر مرزا نے علی بخش کی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے فیصل آباد کے علاقے میں دو مربع اراضی عطا کرنے کا حکم صادر کیا تھا اور وہ اس اراضی پر قبضہ بھی حاصل کر چکا تھا۔

لنچ بڑا سادہ اور دلچسپ تھا۔ سکندر مرزا اور بیگم ناہید کے علاوہ کیبٹ لاج، پرنس علی خان، امریکی سفیر اور ان کی بیگم، اصفہانی اور ان کی بیگم موجود تھے۔ سکندر مرزا بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے اور بذات خود ہر مہمان سے میرا تعارف کرایا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ آئین کے باوجود تمام اختیارات سکندر مرزا ہی کے ہاتھ میں تھے مگر کھانے پر ایک بات جو مجھے کھٹکی وہ یہ تھی کہ گفتگو صرف دو زبانوں میں ہو رہی تھی۔ انگریزی یا فارسی۔ اور مجھے سارا وقت یونہی محسوس ہوتا رہا گویا میرے ملک کے حاکم سب کے سب پاکستانی نہیں غیرملکی ہیں۔ کھانے کے اختتام پر رخصت ہونے سے پہلے سکندر مرزا نے اگلے روز پھر مجھے صبح گیارہ بجے ملنے کے لیے کہا۔

میں مقررہ وقت پر شہاب کے دفتر پہنچ گیا۔ سکندر مرزا خود وہاں تشریف لائے اور مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ انہوں نے نہایت خلوص سے ارشاد فرمایا: ''تمہیں میں ملک کی خاطر استعمال کرنا چاہتا

ہوں۔ کیا تم معاہدہ بغداد کے سیکرٹریٹ کے ساتھ ایڈیشنل سیکرٹری کے طور پر منسلک ہو کر بغداد جانا پسند کرو گے؟'' میں نے جواب دیا: ''سر، میں سات برس وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آیا ہوں۔ اس لیے فی الحال میرا ارادہ پاکستان سے باہر جانے کا نہیں۔'' ''اگر تمہیں بغداد جانا منظور نہیں تو پھر تم کیا کرنا پسند کرو گے؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے عرض کیا: ''۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت حال ہی میں آپ نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں سفارشات کے لیے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا ہے جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج محمد شریف مقرر کیئے گئے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے ان کے ساتھ منسلک کر دیجئے۔ ممکن ہے میں اس ضمن میں کوئی کارآمد خدمت انجام دے سکوں۔'' یہ سن کر سکندر مرزا ہنس دیئے، کہنے لگے۔ ''مگر وہ کمیشن تو آئین کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے، اسے نہ تو کوئی کام کرنا ہے، نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔ البتہ اگر تمہاری خواہش یہی ہے تو میں ابھی تمہیں اس کے ساتھ منسلک کیئے دیتا ہوں۔'' انہوں نے گھنٹی بجائی۔ شہاب اپنی نوٹ بک کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ سکندر مرزا نے لمحہ بھر میں بڑبڑاتے ہوئے انہیں کچھ لکھوایا اور وہ چلے گئے۔ سکندر مرزا پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: ''ایک شرط ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لو گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''سر، میرے پاس اس کے لیے وسائل موجود نہیں۔'' وہ بولے۔ ''اس کا بندوبست ہو جائے گا بلکہ تم جس سیاسی جماعت کا ٹکٹ چاہو، اس کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔'' مختصراً مطلب یہ تھا کہ میں جس پارٹی سے بھی وابستہ ہوں، اپنے محسن سکندر مرزا کا فرمانبردار رہوں۔ اس زمانہ میں سکندر مرزا پاکستان بھر میں الیکشن کرانے کا سوچ رہے تھے اور انہوں نے مسلم لیگ کے مقابلے کی خاطر اپنی زیر نگرانی ری پبلکن پارٹی بھی قائم کر رکھی تھی مگر کچھ مدت کے بعد جب خان عبدالقیوم خان نے پنجاب میں بتیس میل لمبا مسلم لیگ کا جلوس نکالا تو سکندر مرزا کے ارادے بدل گئے۔

بہرحال میں ان کے دفتر سے اٹھ کر شہاب کے پاس آیا۔ یہ شہاب سے میری شناسائی کا آغاز تھا۔ میں نے انہیں نہایت ہی سادہ، شریف، قابلِ اعتماد اور مخلص دوست پایا۔ میری ان کے ساتھ دوستی ان کی وفات تک قائم رہی۔ اس دوران ان کی شادی ہوئی۔ بھابی اور اپنے بیٹے ثاقب کے ساتھ لاہور جاوید منزل میں بھی مجھ سے ملنے آتے رہے۔ ان کی اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے متعلق ''شہاب نامہ'' پڑھ کر تو مجھ پر ان کی حیات کے کئی نئے پہلوؤں کا انکشاف ہوا۔ شہاب نے مجھے بتایا کہ لاہور پہنچ کر جسٹس شریف سے ملوں۔ ہوسکتا ہے وہ خود ہی مجھ کو بلائیں۔

کراچی میں چند روز قیام کے دوران میں مس جناح کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ بعدازاں جب وہ لاہور آئیں تو ان کے استقبال کے لیے میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وہ ہمارے گھر بھی

منیرہ سے ملنے کی خاطر تشریف لائیں۔ ان کا صرف ایک ہی اصرار تھا جسے بار بار منیرہ کے سامنے دہراتیں کہ میں چونتیس برس کا ہو گیا ہوں اور مجھے جلد اپنا گھر بسانا چاہیے۔

لاہور پہنچ کر میں نے جسٹس شریف سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کمیشن کا دفتر سپریم کورٹ ہی کے ایک چیمبر میں قائم کر رکھا تھا۔ ابھی تک دفتر میں عملہ تو کوئی نہ تھا۔ البتہ ایک تنخواہ دار چپڑاسی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جسٹس شریف مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے: ''میں نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ کمیشن کے قاہرہ جانے کے لیے فنڈز کا انتظام کیا جائے تا کہ ہم جائزہ لے سکیں کہ مصریوں نے اپنے ملک میں کون کون سے اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہیں اور اس بارے میں رپورٹ کے ساتھ سفارشات بھی حکومت کو پیش کی جا سکیں گی۔ اگر حکومت نے منظوری دے دی تو آپ بھی میرے ساتھ چلیئے گا۔'' میں نے پوچھا۔ ''کیا حکومت پاکستان یہاں اسلامی قوانین کے نفاذ کے متعلق واقعی سنجیدہ ہے؟'' ہنس پڑے۔ بولے۔ ''پانچ سال کے عرصہ میں انہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ قائداعظم کی وفات کے بعد قراردادِ مقاصد تو لیاقت علی خان اور ان کے چند ساتھیوں نے مولویوں کا منہ بند کرنے کی خاطر منظور کروالی مگر چودھری محمد علی نے اس کا پھندا آئین میں ڈال دیا ہے اور اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ سوائے اس کے کہ آئین کو ختم کیا جائے۔ کمیشن کا تقرر ایک آئینی ضرورت تھی جو بہ امر مجبوری پوری کر دی گئی۔ فی الحال اس کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں۔ مجھے تو تقرر کے ماہ سے باقاعدہ تنخواہ مل رہی ہے۔ آپ بھی ایسے ہی کیجئے۔ جب حکومت کی طرف سے کوئی پیش رفت ہوئی تو دیکھ لیں گے۔'' میں نے ان سے کہا: ''سر، جب تک کمیشن اپنا کام شروع نہ کرے، میں تنخواہ نہیں لوں گا۔ میں اپنی وکالت چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے بھی میرا ارادہ تو کمیشن میں پارٹ ٹائم کام کرنے کا تھا لیکن اب تک ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔'' ہماری میٹنگ اختتام پر پہنچی اور میں ان سے ہاتھ ملا کر چلا آیا۔

آخر میں وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ ۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا نے آئین ختم کر دیا۔ اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں۔ ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور جنرل ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ جو وجوہات سکندر مرزا نے پیش کیں، وہ یہ تھیں: ''ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاستدانوں میں تباہ کن جنگ جاری تھی۔ بدعنوانی عام تھی۔ عوام کا استحصال ہو رہا تھا اور اسلام کو سیاسی مقاصد کی خاطر بطور ''طوائف'' استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایسے غیر یقینی اندرونی حالات انتخابات سے بھی درست ہو سکنے کا امکان نہ تھا۔'' بعد ازاں چیف جسٹس منیر کی زیر قیادت سپریم کورٹ نے اپنے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے فیصلہ میں اس کرتوت کو قانونی طور پر جائز قرار دے دیا مگر بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ سکندر مرزا

سے فوج نے استعفا لیا اور ان کی جگہ جنرل ایوب خان صدر پاکستان بن گئے۔

چند ماہ بعد مجھے شہاب کا فون آیا کہ وہ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کا ایک اجلاس کراچی میں بلوا رہے ہیں تا کہ پاکستان میں رائٹرز گلڈ قائم کیا جا سکے اور اس گلڈ کا افتتاح جنرل ایوب خان کریں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بھی اجلاس میں شریک ہوں بلکہ خطاب بھی کروں۔ پس ان کی دعوت پر میں پھر کراچی پہنچا اور شہاب سے طویل ملاقات ہوئی۔ شہاب کی شخصیت کا ایک پہلو جو میرے لیے نہایت عجیب و غریب تھا، وہ ''روحانیات'' (یا سوپر نیچرل) پر ان کا اعتماد تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک خاتون کا ذکر کیا جو مرکزی سیکرٹریٹ کے کسی سپرنٹنڈنٹ کی بیوی تھیں اور ''سائیکک'' تھیں یعنی وہ خود طاری کردہ بے ہوشی کے عالم میں بتا سکتی تھیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس خاتون کے ہاں خفیہ طور پر سکندر مرزا بھی جایا کرتے تھے۔ شہاب نے مجھے بتایا کہ جب مارشل لاء لگا تو سکندر مرزا کا مستقبل معلوم کرنے کی خاطر وہ اس خاتون کے پاس گئے اور ان سے سوال کیا کہ سکندر مرزا کا کیا بنے گا؟ خاتون بے ہوشی کے عالم میں چلی گئیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے آنے والے واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے۔ وہ بولتی گئیں: ''جیپ میں چند فوجی افسر بیٹھے، ایوان صدر میں داخل ہوئے۔ (وقفہ) ان میں ایک جرنیل ہے جس کے ماتھے پر سرخ رنگ کی لاٹ ہے۔ (وقفہ) وہ ہال کے اندر کھڑا ہے۔ (وقفہ) ایک معتبر شخص ڈریسنگ گاؤن پہنے سیڑھیوں سے اتر رہا ہے۔ (وقفہ) اس کی جیب میں پستول ہے۔ (وقفہ) وہ آدمی اور ایک خاتون فوجی گاڑی میں سوار ہو کر رخصت ہو گئے...... '' شہاب نے ساری کہانی ایسے موثر انداز میں بیان کی کہ میری نگاہوں کے سامنے بھی فلم چل گئی۔ شہاب نے مجھ سے کہا کہ اگر میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق اس خاتون سے کچھ معلوم کرنا چاہوں تو ہم ابھی اس کے ہاں جا سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں تو اپنے مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس خاتون سے ملنا ضرور چاہوں گا۔'' سو شہاب مجھے ان کے گھر لے گئے۔ وہ ایک عام سی خاتون تھیں۔ معمولی سے سرکاری فلیٹ میں رہتی تھیں۔ تین چار بجے تھے۔ ہم لوگ ان کے شوہر سے بھی ملے۔ چونکہ کوئی سوال کرنے کو نہ تھا، اس لیے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر ہم وہاں سے چلے آئے مگر میرے لیے یہ بات بڑے اچنبے کا باعث تھی کہ شہاب نے اس خاتون کو کیسے دریافت کیا؟ سکندر مرزا کیوں اس خاتون سے اپنے مستقبل کے بارے میں پوچھنے آتے تھے؟ اور اب شاید جنرل ایوب خان بھی ان کے ہاں شہاب کے ساتھ جاتے ہوں۔ ہمارے حاکم اس قدر ضعیف الاعتقاد کیوں ہیں؟

رائٹرز گلڈ کے اجلاس میں مغربی پاکستان کے اکثر ادیب، شاعر اور دانشور موجود تھے۔ شاید چند لوگ مشرقی پاکستان سے بھی آئے ہوں۔ جنرل ایوب خان نے اجلاس کی صدارت کی۔ ان کی موجودگی میں شہاب کے کہنے کے مطابق میں نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا۔ موضوع ''حب الوطنی کے تقاضے اور ادیب''

تھا۔ جنرل ایوب خان نے میری تقریر بہت پسند کی بلکہ اپنے صدارتی خطبہ میں اس کا ذکر بھی کیا۔ یہ مقالہ میرے ریکارڈ میں موجود نہیں۔ غالباً تلف ہو گیا۔ جمیل الدین عالی نے ایک بار کہا تھا کہ ان کے ریکارڈ میں ہے اور اس کی نقل مجھے ارسال کریں گے مگر کہہ دینا اور کر دینا دو علیحدہ عمل ہیں۔ ممکن ہے گلڈ کے ریکارڈ میں ہو، اگر کوئی ایسا ریکارڈ گلڈ والوں نے محفوظ کر رکھا ہو۔

بعد ازاں لاہور میں گلڈ کے ارباب بست وکشاد کے تقرر کے لیے الیکشن بھی ہوئے۔ میں بھی کھڑا ہوا لیکن ادیبوں نے میری بجائے اعجاز بٹالوی کو منتخب کیا۔ میرے خلاف جو بات گئی، وہ یہ تھی کہ میں اسلام پسندوں کے زمرے میں آتا ہوں اور سوشلسٹ نہیں ہوں۔ میرے ساتھ زندگی میں ہمیشہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ ''اصلی اور خالص'' اسلام پسند تو مجھے ملحد سمجھتے ہیں اور ملحد، دہریے اور سوشلسٹ دانشور مجھے اسلام پسندوں میں شمار کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے جو شعر اپنے بارے میں ارشاد کر رکھا ہے، اس کا اطلاق مجھ پر بھی ویسے ہی ہوتا رہا ہے ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

گلڈ کی وساطت سے مجھے مغربی پاکستان کے دانشوروں کے قافلے کے ساتھ حکومت کے خرچ پر مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں سے جو لوگ ہوائی جہاز کے ذریعے ڈھاکہ گئے۔ ان میں قرۃ العین (عینی) تجمل حسین، احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور وغیرہ کے نام یاد ہیں۔ ڈھاکہ میں جسیم الدین اور دیگر شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ جسیم الدین کے ساتھ خاندانی منصوبہ بندی پر بات چیت ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ مشرقی پاکستان کے غریبوں کے لیے ایسی کوئی منصوبہ بندی قابل قبول نہیں کیونکہ زیادہ اولاد پیدا کر کے وہ اپنے خاندانوں کی معاشی حالت بہتر بنا سکتے ہیں، لہٰذا افزائشِ نسل ان کے لیے سرمایہ دار مغربی پاکستان کے استحصال کے خلاف ایک طرح کی دیوار چین ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے مجھے احساس ہوا کہ بنگالیوں کی سوچ ہم سے مختلف ہے اور وہ اپنے آپ کو ہمارے استحصال کا شکار سمجھتے ہیں۔

سردیوں میں ڈھاکہ کا موسم لاہور کے مقابلے میں سرد نہیں بلکہ بے حد خوشگوار ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہاں کے مکین سوئٹر، مفلر اور گرم کپڑے استعمال کرتے ہیں۔ میں زندگی میں پہلی بار ڈھاکہ گیا تھا۔ یہاں مغربی پاکستان کے دانشور دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ نے سندر بن کی سیر کرنا پسند کیا اور دوسرے گروہ نے (جس میں میں، تجمل حسین، عینی اور دیگر لوگ شامل تھے) کوکس بازار جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پس ہم لوگ کاکس بازار پہنچے جو خلیج بنگال کی ساحل پر واقع نہایت دلکش بندرگاہ ہے۔ یہاں ہم لوگوں نے خوب وقت گزارا۔ سیر کے دوران عینی کسی مندر میں پجاریوں کے ساتھ ایک ٹورسٹ کی مانند

''شیولنگ'' کی پوجا میں شریک ہوگئیں۔ اس پر میں نے ان پر پھبتی کسی اور وہ ناراض ہوگئیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ عینی ہندو کلچر پسند کرتی تھیں اور ان کے خیال میں یہ کوئی بری بات نہ تھی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے دیگر عزیزوں کے ساتھ پاکستان آ گئیں۔ میرے انگلستان میں قیام کے زمانہ میں وہ پاکستان ہائی کمیشن میں کام کرتی تھیں۔ پاکستان میں اپنے رشتہ داروں کے آنے کے سبب وہ بھی آ تو گئی تھیں لیکن ان کا دل بھارت ہی میں اٹکا رہا۔ جوانی بغیر شادی کے گزار دی۔ میری ان کے ساتھ معصومانہ بے تکلفی تھی۔ وہ علامہ اقبال کا ذکر بھی ''جاوید کے ابا'' کے طور پر کیا کرتیں۔ میری پھبتی پر ان کے ناراض ہونے کی بظاہر تو کوئی وجہ نہ تھی۔ بہرحال تجمل حسین نے ہماری صلح کرا دی اور بات ختم ہوگئی۔ بعدازاں جب ان کا ناول ''آگ کا دریا'' چھپا تو پاکستان میں اس کے خلاف بہت سے تبصرے شائع ہوئے۔ شامتِ اعمال سے ان تبصرہ نگاروں میں ایک میں بھی تھا۔ وہ ان تبصروں سے اس قدر خفا ہوئیں کہ بالآخر پاکستان چھوڑ کر واپس بھارت چلی گئیں۔ چند برس ہوئے وارث میر مرحوم نے مجھ سے منسوب کر کے پھر ان کے خلاف ایک مضمون داغ دیا جس پر عینی نے مجھ سے گلہ کیا۔ خدا کا شکر ہے اب انہیں میرے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ بھارت میں ایک عظیم ادیبہ کی حیثیت سے ان کی جو توقیر ہوئی ہے، وہ کسی پاکستانی ادیب کو آج تک یہاں نصیب نہیں ہوئی۔ میں ان کی دوستی پر جتنا بھی فخر کروں، کم ہے۔

کئی برس بعد مجھے دوسری مرتبہ مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ اس بار شاید راجشاہی یونیورسٹی میں فلسفہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا ہوا۔ ڈھاکہ میں مختصر قیام کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ مغربی پاکستان کے مکینوں کے خلاف بنگالیوں کی نفرت مزید بڑھ گئی ہے۔ وجہ صاف ظاہر تھی۔ مغربی پاکستان کے مغرور افسر، بنگالیوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے جیسے انگریز حاکم ہم سب کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ کانفرنس تو علمی اور بین الاقوامی تھی، اس لیے اچھے ماحول میں ہوئی مگر یونیورسٹی سے کچھ فاصلہ پر کسی ایئرفورس کے اسکول میں میرے ایک جاننے والے سلیمان انسٹرکٹر تھے۔ ان کی دعوت پر اسکول دیکھنے کے لیے گئے اور شام کے وقت پولیس کی جیپ میں میں اور بنگالی ایس پی پولیس واپس آ رہے تھے کہ رستہ میں ڈرائیور کو اُونگھ آ گئی اور جیپ ایک بیل گاڑی کے بیل سے ٹکرا گئی۔ بیل سڑک پر گر گیا لیکن گاڑی بان بجلی ایسی سرعت کے ساتھ جیپ کے پیچھے بھاگا۔ میں نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کے لیے کہا مگر ایس پی نے اسے جیپ تیزی سے چلا کر وہاں سے بھاگ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم گاڑی بان کے جیپ کے قریب پہنچنے سے پیشتر آگے نکل گئے۔ میرے پوچھنے پر ایس پی نے بتایا کہ اگر ہم رک جاتے تو گاڑی بان کے شور پر چند لمحوں میں اردگرد کے لوگ اکٹھے ہو جاتے اور خصوصی طور پر آپ کو دیکھ کر ہمیں جیپ سے باہر نکلنے نہ دیتے بلکہ اندر بند کر کے جیپ کو آگ لگا دیتے۔

ان برسوں میں لاہور میں دو اہم شخصیات سے میری ملاقات ہوئی جس نے بعد میں عمر بھر کی دوستی کی صورت اختیار کر لی۔ ان میں سے ایک تو پروفیسر این میری شمل تھیں جو اقبال اسکالر کی حیثیت سے پہلی بار جرمنی سے غالباً ۱۹۵۸ء میں پاکستان تشریف لائی تھیں۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں ''اقبال اور تصوف'' کے موضوع پر لیکچر دیا اور پھر مرکزیہ مجلس اقبال کی یوم اقبال کی تقریب میں شریک ہوئیں۔ میرا یہ بھی معمول بن گیا تھا کہ ہر سال ۲۱۔ اپریل کو علامہ اقبال کے یوم وفات کے موقع پر لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر مقالہ پڑھتا۔ مقالات کا یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ (کتابی شکل میں یہ مقالات ''مئے لالہ فام'' کے نام سے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکے ہیں) اس زمانہ میں مرکزیہ مجلس اقبال کے صدر خواجہ عبدالرحیم تھے اور جلسوں کے روح رواں آغا شورش کاشمیری، مجید نظامی اور چودھری مشتاق ہوا کرتے تھے۔ اجلاس عموماً یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا کرتے۔ ۱۹۷۲ء کے بعد مقالات کی بجائے میں زبانی تقریریں کرنے لگا۔ پھر یوم اقبال صرف ۲۱۔ اپریل کو ہی نہیں بلکہ علامہ اقبال کے نئے دریافت شدہ ۱۸۷۷ء کے یوم ولادت کے حوالے سے ۹ نومبر کے دن بھی منایا جانے لگا۔

دوسری شخصیت شیلا میکڈونا تھیں۔ انہوں نے میکگل یونیورسٹی (کینیڈا) میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کی خاطر مواد اکٹھا کرنے کی غرض سے لاہور کے کنیرڈ کالج فار ویمن میں انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تھا۔ شیلا میکڈونا کا موضوع دراصل ادیان کا تقابلی مطالعہ تھا لیکن وہ مابعد اقبال پاکستان میں مذہبی رہنماؤں پر اقبال کے اثرات پر تحقیق کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس بارے میں تین حضرات چن رکھے تھے: مولانا مودودی، خلیفہ عبدالحکیم اور غلام احمد پرویز۔ اپنے یہاں قیام کے دوران انہوں نے ایک انگریزی کتاب ''پاکستان اور مغرب جدید'' کے موضوع پر بھی تحریر کی جو جنرل ایوب خان سے ملاقات پر انہیں پیش کی گئی۔

۱۹۵۸ء میں ہی غالباً شہاب کی ترغیب پر جنرل ایوب خان نے ایک سوالنامہ انگریزی میں جاری کیا جو پاکستان کے اکثر دانشوروں کو بھیجا گیا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ کن کن دانشوروں کو سوالنامہ ملا۔ البتہ ان لوگوں میں بروہی مرحوم اور جسیم الدین کے نام سننے میں آئے۔ سوالنامہ مجھے بھی ملا اور عجیب وغریب سا تھا۔ مثلاً نظریہ پاکستان کی تعریف کیا ہے؟ اسلام کی نظر میں حقوق بشر کی کیا حیثیت ہے؟ مومن کی پہچان کیسے ممکن ہے؟ اسلام عملی طور پر آئین کے ذریعے کیسے نافذ کیا جائے؟ ہندوستان سے تعلقات کیسے بہتر بنائے جا سکتے ہیں؟ وغیرہ۔ میں نے جنرل ایوب خان کے ہر سوال کا جواب علیحدہ باب کی صورت میں تحریر کیا اور اس طرح تقریباً سات آٹھ ابواب پر مشتمل ایک اچھا خاصا تھیسس بن گیا جسے مجلد کرا کے انہیں بھجوا دیا گیا۔ اسے تحریر کرتے وقت شیلا میکڈونا نے میری بڑی مدد کی۔

سوالنامے کے بہت سے جواب جنرل ایوب خان کو موصول ہوئے مگر انہوں نے ان میں سب سے زیادہ میرا تھیسس پسند کیا۔ مجھے تحریر کیا کہ میں اسے کتابی شکل میں شائع کرا دوں اور وہ کتاب کا دیباچہ تحریر کریں گے۔ چنانچہ شہاب کی مدد سے کتاب ''نظریہ پاکستان اور اس کا نفاذ'' (انگریزی) کا پہلا ایڈیشن مع دیباچہ جنرل ایوب خان ۱۹۵۹ء میں ''پاکستان ٹائمز'' پریس لاہور سے شائع کیا گیا۔ میں نے کتاب دنیا بھر کے اسلامی اسکالرز مثلاً این میری شمل (جرمنی) روبن لیوی (انگلستان) آربری (انگلستان) فری لینڈ ایبٹ (امریکہ) بوسانی (اٹلی) میسنیون (فرانس) نیز پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا مودودی اور کئی قومی و بین الاقوامی اسلامی رسالوں کو ارسال کی۔ بہت سی اہم شخصیات نے اپنے اپنے تبصرے اور تجاویز خطوں کی صورت میں مجھے بھیجے جو کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں ایک اضافی باب کی شکل میں شائع کر دیئے گئے۔ کتاب میں نظریۂ پاکستان کے عملی نفاذ کے ضمن میں اور تجاویز کے علاوہ ایک اہم تجویز یہ تھی کہ وزارت مذہبی امور قائم کی جائے جو پاکستان بھر کی نہ صرف مساجد کو کنٹرول کرے بلکہ مستند یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات کے سند یافتہ آئمہ مساجد کا تقرر بھی کرے۔ اس تجویز پر اگر عمل کیا جاتا تو علامہ اقبال کے تصور کے مطابق دین ملکی سیاست سے جدا ہونے کی بجائے اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا اور عین ممکن ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کے فروغ کے سبب: ''دینِ مِلاّ فی سبیل اللہ فساد'' والی کیفیت پیدا نہ ہوتی۔

اپنی زندگی میں پہلی بار ایک اہم آئینی کیس میں مجھے سپریم کورٹ میں سردار عبدالرب نشتر کے جونیئر کے طور پر پیش ہونے کا موقع ملا۔ کیس مری میں سنا گیا۔ تب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر تھے اور دوسری طرف سے معروف وکلاء بروہی اور منظور قادر تھے۔ سردار عبدالرب نشتر غالباً مسلم لیگ کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ مقدمہ کئی دن چلا لیکن فیصلہ ہمارے خلاف ہی ہوا۔

انہی ایام میں انگلستان سے مجھے جاننے والے پروفیسر ویب آسٹریلیا جاتے ہوئے لاہور میں رکے اور مجھے کینبرا میں اگست ۱۹۶۰ء میں ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ کانفرنس کا موضوع ''ایشیا میں جمہوریت کا مستقبل'' تھا اور اس میں جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے آئینی ماہرین شرکت کر رہے تھے۔ میں نے ان کی دعوت قبول کر لی اور کانفرنس کے لیے ''پاکستان میں اسلامی ریاست کی تلاش'' کے موضوع پر مقالہ لکھا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد میرے لیے وطن سے باہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ اس کے بعد میں مسلسل تین چار برس اسی طرح پاکستان سے باہر اندر ہی ہوتا رہوں گا۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز کینبرا پہنچا۔ کانفرنس کینبرا یونیورسٹی میں منعقد کی گئی تھی اور شریک ہونے والوں کو طلباء کے کمروں میں ٹھہرایا گیا کیونکہ ان دنوں سردیوں کی تعطیلات تھیں۔ کانفرنس میں مجھے آسٹریلوی آئینی ماہرین کے علاوہ

انڈونیشیا، ملیشیا، جاپان، فلپائن، تھائی لینڈ، سری لنکا، بھارت وغیرہ کے ماہرین سے ملاقاتوں کا موقع ملا اور ان کے ملکوں کے دساتیر پر بحث مباحثے ہوتے رہے۔

کینبرا محض ایک دارالحکومت ہونے کی حیثیت سے خالصتاً سرکاری عمارتوں پر مشتمل نہایت صاف ستھرا اور خاموش شہر ہے۔ سڑکوں پر پیدل چلتا کوئی نظر نہیں آتا۔ صرف موٹر کاریں ہی دوڑتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کانفرنس کا افتتاح آسٹریلیا کے چیف جسٹس نے کیا۔ بعدازاں کانفرنس کی کارروائی اور اس میں پڑھے جانے والے مقالے کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے۔ پروفیسر ویب کانفرنس کے روحِ رواں تھے لیکن افسوس ہے کہ دو برس بعد پروفیسر ویب اور مسز ویب بریبین سے سڈنی آتے ہوئے کار کے حادثے میں چل بسے۔ (ان کی بیٹی کیتھرین فرانسیسی نیوز ایجنسی کے نمائندے کی حیثیت سے پاکستان بھی آئیں اور میرے گھر چند روز قیام کیا)

میں کینبرا سے سڈنی پہنچا۔ اس زمانہ میں وہاں کی عظیم الشان اوپرا بلڈنگ زیرِ تعمیر تھی۔ سڈنی یونیورسٹی میں میں نے ایک لیکچر پاکستان پر دیا اور ٹی وی پر میرا انٹرویو بھی دکھایا گیا۔ میرا موقف یہ تھا کہ پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ جو ہمیں میراث میں ملا، وہ اس کا دو حصوں میں منقسم ہونا ہے۔ اسی سبب آئین بنانے میں اتنا وقت لگا۔ پھر پیریٹی (برابری) کا اصول منوانے کی خاطر مغربی حصہ کو ایک صوبہ بنا دیا گیا اور یوں مغربی پاکستان میں چار ''یونٹوں'' کے وفاقی نظام میں اٹانومی کے حقوق پامال ہوئے۔ ادھر مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کا پیریٹی کے اصول کے تحت ختم کر دیا جانا بنگالیوں کو قبول نہ تھا۔ پس ۱۹۵۶ء کا آئین ناقابل عمل ہو گیا۔ اب یا تو تقسیم ہند کے موقع پر ہی مشرقی بنگال کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا جاتا اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پاکستان کے لیے ایک نیا جمہوری آئین بنانا لازم ہے جس کے لیے کوشش کی جا رہی ہے۔ دراصل آسٹریلیا کے وزیراعظم کے چیف سیکرٹری مسٹر ہیم ''پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل'' کے موضوع پر میلبورن اور دو ایک اور یونیورسٹیوں میں میرے لیکچر کروانا چاہتے تھے اور میں نے حامی بھی بھر لی تھی لیکن کینبرا میں مقیم پاکستانی ہائی کمشنر مسٹر خراس نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ فارن منسٹر مسٹر منظور قادر نے مجھے پاکستانی وفد کے ساتھ یو این جانے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس لیے ۱۵ ستمبر تک یا تو سڈنی سے سیدھا نیویارک پہنچ جاؤں یا پاکستان واپس جا کر اس تاریخ تک وہاں پہنچنے کا انتظام کروں۔

میں نے کراچی پہنچ کر فارن سیکرٹری اکرام اللہ (مرحوم) سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وفد کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو ہوں گے۔ چونکہ بھابھی شائستہ (مرحومہ) کے ذریعے اکرام اللہ سے پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے نصیحت کی کہ بھٹو سے میں دور ہی رہوں تو بہتر ہوگا۔ جب اکرام اللہ نے یو این جانے کے بارے میں میری رضامندی کا اظہار مجھ سے تحریری طور پر کروانا چاہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ ایسا کیوں

کر رہے ہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ چھ ماہ پیشتر لاہور کی ''موری'' ممبری میں منتخب ارکان کے ساتھ گورنر نواب کالاباغ (مرحوم) نے مجھ سے پوچھے بغیر مجھے نامزد ممبر بنا دیا تھا اور میں نے اخباری بیان کے ذریعہ یہ اعزاز قبول نہ کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ کسی منتخب ادارے میں نامزدگی قبول کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ (نتیجہ میں میاں صلی مرحوم لاہور کے میئر کے انتخاب میں ایک ووٹ سے ہار گئے اور چودھری محمد حسین مرحوم میئر لاہور بن گئے۔)

لاہور پہنچا تو شہاب نے فون پر بتایا کہ جنرل ایوب خان نے یاد کیا ہے۔ چنانچہ میں اسلام آباد گیا اور جنرل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ بھٹو صاحب کے ہاتھ وہ ترکی کی عسکری حکومت کے صدر جنرل گرسل کو خیر سگالی کا پیغام بھیج رہے ہیں۔ اس لیے ہم دونوں نیو یارک جانے سے پیشتر ترکی جائیں گے اور اگر ممکن ہو سکے تو میں وہاں ٹھہر کر ترکی اور پاکستان کے پرانے تعلقات پر لیکچر بھی دوں۔ جنرل ایوب خان کو خدشہ تھا کہ ترکی کی انقلابی کونسل نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو ترکی آنے کی دعوت دے رکھی ہے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ترکی اور پاکستان کے دیرینہ قریبی تعلقات میں مخل ہوں، لہٰذا بھٹو صاحب کا کام جنرل ایوب خان کے لیے ترکی کا سرکاری طور پر دورہ کرنے کی خاطر دعوت نامہ حاصل کرنا تھا۔ (یہ وہ زمانہ ہے جب ترکی میں عسکری انقلاب کے بعد صدر بایار اور وزیر اعظم میندریس کو معزول کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا جس کے نتیجے میں بوڑھے صدر بایار کو تو عمر قید کی سزا دی گئی اور وزیر اعظم عدنان میندریس کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ کہتے ہیں کہ فوجی حکومت نے وزیر اعظم کو پھانسی چڑھانے کے اخراجات یعنی رسے وغیرہ کی خرید کا بل بھی اس کے گھر والوں سے وصول کیا تھا۔)

میں امریکہ کے سفر کے لیے لاہور سے کراچی پہنچا۔ اس زمانہ میں قائداعظم ایئرپورٹ ابھی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ پان امریکن فلائیٹ صبح سویرے کراچی کے پرانے ہوائی اڈے سے بیرون ملک پرواز کرتی تھی۔ میں ایئرپورٹ پر بھٹو صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کسی مجرا پارٹی میں ساری رات بیدار رہنے کے سبب ''جاگو میٹی'' کیفیت میں آئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ فارن آفس کے نمائندے نے ہمیں جہاز میں سوار کرایا۔ ہم دونوں جہاز کی فرسٹ کلاس میں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ جہاز کی روانگی کے ساتھ ہی وہ اپنی نشست پر گہری نیند میں خراٹے بھرنے لگے۔ ایئر ہوسٹس نے مجھے ناشتہ دیا اور میں رسالے پڑھتے وقت گزارنے لگا۔ استنبول پہنچے تو پاکستانی قونصل نے ہمارا استقبال کیا۔ گھنٹہ بھر توقف کے بعد ہم انقرہ پہنچے جہاں سفیر صاحب نے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔

چند گھنٹے آرام کے بعد ہم دونوں سفارت خانہ میں سفیر صاحب کی دی گئی ضیافت میں شریک ہوئے۔ اس ضیافت میں ترک وزارت خارجہ کے افسروں کے علاوہ انہوں نے انقلابی کونسل کے سب ممبر

فوجیوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا لیکن ان میں سے صرف الپ ارسلان ترکیش ہی تشریف لائے اور کوئی نہ آیا۔ (الپ ارسلان ترکیش علامہ اقبال سے نسبت کے سبب مجھ سے خصوصی شفقت کے ساتھ ملے اور پوچھا کہ مجھے ترکی کیسا لگا۔ میں نے ازراہ مذاق کہا کہ اگر یہاں قید بھی کر دیا جاؤں تو مجھے قبول ہوگا۔ الپ ارسلان ترکیش بعدازاں بھارت میں ترکی کے سفیر بھی رہے۔ پھر اپنی سیاسی جماعت کے صدر بن گئے لیکن عملی سیاست میں نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اب وفات پا چکے ہیں) بہرحال دعوت بڑی پر تکلف تھی اور رات کو سفارتخانہ سے انقرہ کی روشنیوں کا نظارہ نہایت دلکش تھا۔

اگلی صبح میں اور بھٹو صاحب نے اتاترک کے مزار پر حاضری دی۔ بعدازاں بھٹو صاحب تو سفیر پاکستان کے ساتھ جنرل گرسل سے ملاقات کی خاطر قصرِ صدارت چلے گئے اور میں پاکستانی کلچرل اتاشی کے ساتھ انقرہ یونیورسٹی میں ''پاکستان اور ترکی'' کے موضوع پر لیکچر دینے کے لیے شعبۂ ترکیات پہنچ گیا۔ لیکچر کے بعد شعبہ ترکیات کے ڈین نے مجھے نہ صرف یونیورسٹی کی سیر کرائی بلکہ چانسلر اور دیگر پروفیسروں سے بھی بڑی پر تکلف چائے پر ملوایا۔ علامہ اقبال سے نسبت کے سبب یہاں بھی ہر کوئی مجھ سے نہایت خلوص اور محبت سے ملا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ترکی کے علمی حلقوں میں علامہ اقبال کی قدر و منزلت کا کیا عالم ہے۔

شب کو سفیر صاحب کے ہاں بھٹو صاحب اور میں نے پھر کھانا کھایا۔ معلوم ہوا کہ بھٹو صاحب سے جنرل گرسل کی ملاقات نہایت خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ (اس ملاقات کے نتیجہ میں جنرل ایوب خان نے ترکی کا سرکاری دورہ کیا اور پھر یوگوسلاویہ کے سرکاری دورہ کے بعد یو این کی جنرل اسمبلی میں خطاب کرنے کے لیے نیویارک پہنچے) اگلے روز بھٹو صاحب تو انقرہ سے پیرس پرواز کر گئے اور مجھ سے یہی طے ہوا کہ دو روز بعد ان سے لندن میں آملوں تاکہ اکٹھے نیویارک روانہ ہو سکیں۔

میں انقرہ سے استنبول واپس پہنچا اور پاکستانی قونصل کیساتھ استنبول یونیورسٹی کے چانسلر اور دیگر پروفیسروں سے ملا۔ ان میں بعض ایسی شخصیات بھی تھیں جنہوں نے علامہ اقبال کے فارسی کلام خصوصی طور پر ''جاوید نامہ'' کے بعض حصوں کا ترکی میں ترجمہ کر رکھا تھا۔ استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ ترکیات میں بھی میں نے ''اقبال اور ترکی'' کے موضوع پر لیکچر دیا جو بے حد پسند کیا گیا۔

استنبول عجیب و غریب شہر ہے جس نے استنبول نہیں دیکھا، اس کا جہان فانی سے گزر ہی نہیں ہوا۔ اس سے پیشتر میں پیرس کے پرانے حصے جہاں نوترے دام کلیسا واقع ہے اور دریائے سین کے جنوب میں شہر کی چھوٹی چھوٹی تنگ و تاریک گلیوں میں جہاں انقلاب فرانس کی تیاریاں کی گئی تھیں، سے بے حد متاثر ہوا تھا لیکن استنبول کی بات ہی اور ہے۔ رات کے سناٹے میں اگر آپ تنہا آیہ صوفیہ توپکاپی یا سلیمانی مسجد

کے قریب سے گزریں تو یہ عمارتیں آپ سے مخاطب ہوتی محسوس ہوں گی۔ اس شہر نے بہت سے تمدنوں کا عروج وزوال دیکھا ہے۔ بہت کچھ جانتا ہے۔ آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کیونکہ یہاں کے ہر پتھر کی اپنی تاریخ ہے۔ اس کے قبرستانوں میں مردوزن میں تمیز بھی لاجواب ہے۔ مرد کی تربت کی پہچان اس کے کتبہ پر نصب پتھر کا تراشا ہوا عمامہ (بعد کے عہد کی تربتوں پر رومی ٹوپی) اور عورت کی قبر کے کتبہ پر گلاب کا پھول۔ میں اپنی بعد کی زندگی میں بیسیوں دفعہ استنبول گیا ہوں لیکن ہر بار اس شہر کی پر اسراریت نے مجھے حیرت زدہ کیا ہے بلکہ شاید خوفزدہ۔ یہ خوف زدگی اس کی تاریخ کے سبب دل میں پیدا ہوتی ہے۔

دو یوم بعد میں استنبول سے لندن پہنچا اور پیکاڈلی کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ ہائی کمیشن والوں نے بھٹو صاحب کو بھی یہیں ٹھہرایا ہوا تھا۔ میں نے لندن میں طالب علمی کے زمانہ میں دو برس گزارے تھے اور اب چار برس بعد پھر لندن پہنچا تھا لیکن میں نے یہاں سے ایسا دل اٹھایا تھا کہ سوائے کپڑوں، قمیضوں، کالروں اور نکٹائیوں کی خرید کے اس شہر سے کوئی وابستگی نہ رہی تھی۔ رات کی ضیافت پاکستانی ہائی کمشنر جنرل جو (جنرل یوسف خان آفریدی مرحوم) نے بھٹو صاحب کے اعزاز میں دے رکھی تھی۔ بڑی رونق تھی اور ہم جنرل صاحب کی مہمان نوازی سے خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ اگلی شب میں بھٹو صاحب کے ہمراہ لندن سے نیویارک پہنچ گیا۔

ہمیں ایئرپورٹ سے پاکستانی مشن کی کاروں میں اپنے اپنے ہوٹلوں میں پہنچا دیا گیا۔ بھٹو صاحب تو شیری ندرلینڈ کے نسبتاً بہتر ہوٹل میں ٹھہرے جو گرینڈ سنٹرل پارک کے سامنے ہے لیکن میرا قیام اس کی پشت پر ہوٹل فورٹین میں تھا جہاں وفد کے دیگر ارکان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہوٹل کی لابی میں میری ملاقات بنگالی رکن اے ٹی ایم مصطفٰے (مرحوم) سے ہوئی جس نے بعدازاں گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی۔ مصطفٰے علی گڑھ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے۔ نہایت شستہ اردو بولتے تھے۔ پیشہ وکالت تھا۔ نہایت شدید قسم کے پاکستانی نیشنلسٹ تھے۔ صبح میں اور مصطفٰے ہوٹل سے باہر ایک چھوٹے سے ریستوران میں ناشتے کے لیے نکلے تو عمارتوں کی اونچائی دیکھ کر ہمارے سر چکرا گئے۔ یہ نیویارک کے اس اہم حصے مین ہیٹن کی خصوصیت ہے اور اس کے بارے میں سوویٹ سیکرٹری جنرل خروشوف نے درست کہا تھا کہ نیویارک کنکریٹ کا وسیع جنگل ہے۔ گویا یہاں سیمنٹ کی عمارتیں کسی جنگل میں درختوں کی طرح ایک دوسری سے سبقت لینے کی خاطر اونچی سے اونچی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آپ جتنے امیر ہوں گے۔ اتنی اونچی منزل پر آپ کا قیام ہوگا۔ ہم ویک اینڈ پر نیویارک پہنچے تھے۔ اس لیے ہفتہ اور اتوار میں اور مصطفٰے نے ادھر ادھر پھرتے گزارا۔

پیر کے روز صبح ہم سب پاکستانی مشن کے دفتر بریفنگ کے لیے پہنچے۔ مشن کے سفیر تو دراصل

پرنس علی خان تھے لیکن چند ماہ پیشتر وہ اپنی گرل فرینڈ بٹینہ کے ساتھ فرانس میں ایک کار کے حادثہ میں جاں بحق ہو گئے۔ ان کی جگہ سر ظفر اللہ خان مشن کے سفیر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آغا شاہی منسٹر تھے۔ اقبال اخوند فرسٹ سیکرٹری تھے۔ تھرڈ سیکرٹری کوئی بنگالی صاحب تھے اور اسی طرح انفرمیشن آفیسر کا تعلق بھی مشرقی پاکستان سے تھا۔

مجھے سر ظفر اللہ خان صاحب نے اپنا متبادل نمائندہ بنایا۔ اس لیے میں فرسٹ پولیٹیکل کمیٹی اور سپیشل پولیٹیکل کمیٹی دونوں میں ان کے ساتھ جایا کرتا تھا اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی سیٹ سنبھالنی پڑتی تھی۔ مصطفےٰ لیگل کمیٹی (چھٹی کمیٹی) کے نمائندے بنے۔ اسی طرح دیگر ارکان بھی کمیٹیوں میں بٹ گئے۔

۱۹۶۰ء یو این کی تاریخ میں ایک مشہور سال تھا کیونکہ دنیا بھر کی اقوام کے سربراہ یہاں جمع تھے۔ امریکہ کے صدر جان کینڈی نے جنرل اسمبلی سے خطاب کر کے اجلاس کا آغاز کیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی پاکستان کے خیر سگالی کے دورے کے بعد نیو یارک پہنچے تھے۔ اسی طرح جنرل ایوب خان بھی جنرل اسمبلی سے خطاب کرنے کی خاطر آنے والے تھے۔ یہ وہی مشہور سال ہے جب جنرل اسمبلی کے اجلاس میں روس کے خروشوف نے اپنا جوتا اتار کر ڈیسک پر بجایا تھا۔

جنرل اسمبلی میں جانا تو روز کا معمول بن گیا۔ قابلِ ذکر بات تو پنڈت جواہر لعل نہرو کا ہمارے مشن میں چائے پر آنا تھا۔ پنڈت جی بغیر کسی سے بات کئے ہال میں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئے۔ سر ظفر اللہ خان دعوت میں موجود نہ تھے۔ البتہ بھٹو صاحب وفد کے سربراہ کی حیثیت سے موجود تھے۔ اسی طرح وفد کے ارکان مشن کے مستقل افسر بھی موجود تھے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ پنڈت جی سے جا کر پوچھے کہ کیا پسند فرمائیں گے؟ بھٹو صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تم پنڈت جی سے کبھی ملے ہو؟'' میں نے جواب دیا۔ ''بچپن میں ایک مرتبہ ان سے ملا تھا۔ پتہ نہیں اب مجھے پہچان سکیں گے یا نہیں۔'' بھٹو بولے۔ ''تم ان سے بات کرو، اگر پہچان جاتے ہیں تو میرا تعارف بھی کراؤ۔'' میں جرأت کر کے پنڈت جی کے پاس گیا اور اپنا تعارف کرایا کہ جب وہ لاہور میں میرے والد سے ملنے آئے تھے تو میں نے گھر کے برآمدے میں ان کا استقبال کیا تھا۔ بعد ازاں جب میں نے اپنی انگریزی کتاب ''نظریہ پاکستان اور اس کا اطلاق'' انہیں ارسال کی تو جواب میں انہوں نے ایک خلوص بھرا خط مجھے تحریر کیا تھا۔ پنڈت جی جو پہلے مادھو کے بت کی طرح خاموش، بے حس و حرکت بیٹھے تھے، یکدم ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی۔ مجھے پہچان کر بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے ان کی خواہش کے مطابق انہیں چائے کی پیالی لا کر پیش کی۔ پھر میرے والد سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے رہے کہ وہ انہیں کس قدر شفقت سے ملا کرتے تھے۔ میں نے بھٹو

صاحب کا پنڈت جی سے تعارف کرایا کہ ہمارے وفد کے لیڈر ہیں اور یوں یہ برف کی سل تھوڑی سی کوشش سے ٹوٹ گئی لیکن وہ بھٹو سے نہایت سرسری طور پر ملے۔ کوئی بات چیت نہ کی۔

جنرل اسمبلی میں جنرل ایوب خان خطاب کرنے کے بعد واپس پاکستان چلے گئے۔ بھٹو نے دس پندرہ دن نیویارک میں قیام کیا اور یو این کی چند اہم کمیٹیوں سے خطاب بھی کیا۔ ان کے قیام کے دوران سکندر مرزا مع خانم ناہید شاید لندن سے یو این تشریف لائے۔ میں نے انہیں وفد لاؤنج میں دیکھا اور ان کا استقبال کیا۔ دونوں کی کافی کی پیالیوں سے تواضع کی۔ تھوڑی دیر بعد بھٹو وہاں سے گزرے مگر آنکھیں چرا کر دوسری طرف نکل گئے۔ عجیب بات ہے میری شنید کے مطابق بھٹو نے بڑی کوششوں اور کاوشوں سے سکندر مرزا کی صدارت کے زمانے میں ان تک رسائی حاصل کی تھی۔ خالص جاگیردارانہ انداز میں کئی ہفتے انہیں سردار عبدالرشید (مرحوم) کے ذریعے ایوان صدارت کے باورچی خانہ میں پکنے کے لیے مرغیاں بھجواتے رہے۔ پھر جب ملاقات ہوگئی تو سکندر مرزا کے اعزاز میں کراچی میں اپنے عالیشان گھر میں پرتکلف شیمپئن پارٹی دی۔ بالآخر سکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کا آئین ختم کر کے انہیں اپنی کیبنٹ میں شامل کر ہی لیا۔ بعدازاں جب جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کو نکال باہر کیا تو بھٹو ان کی کیبنٹ میں موجود رہے یعنی جنرل ایوب خان ان کے قبلہ و کعبہ بن گئے لیکن کیا ان کا سکندر مرزا اور خانم ناہید کو یوں نظرانداز کرنا سیاست سمجھنا چاہیے یا طوطا چشمی؟ آخر طوطا چشمی سے کیا مراد ہے؟ کیا پرندوں میں صرف طوطا ہی اپنے مربیوں سے آنکھیں پھیر لیتا ہے؟ جب میں نے بھٹو سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ان کا جواب صرف یہی تھا کہ کہیں جنرل ایوب خان برا نہ مان جائیں۔ سو ظاہر ہوا کہ ہمارے یہاں سیاسی مصلحت عام اخلاق کی ''ساس'' ہے۔

اس زمانے میں فرسٹ پولیٹیکل کمیٹی کے ایجنڈے پر بیشتر موضوعات نو آبادیاتی علاقوں کی آزادی سے متعلق زیرِ بحث تھے۔ ان میں اکثر ممالک مسلم تھے۔ مثلاً مراکو، الجیریا، تونیسیہ اور سر ظفر اللہ خان نہایت عمدگی سے ان کا کیس پیش کیا کرتے۔ ان کی عدم موجودگی میں میں ان کی کرسی سنبھالتا تھا۔ سپیشل پولیٹیکل کمیٹی میں فلسطین، جنوبی افریقہ اور اسی طرز کے معاملات پر بحث ہوا کرتی تھی۔ بسا اوقات مجھے بھی اسمبلی کی نشستوں پر بولنا پڑ جاتا۔ ہر شام کسی نہ کسی ڈپلومیٹک پارٹی یا کھانے پر جانا پڑتا اور خوب وقت گزرتا کیونکہ یہ زندگی بھی ایک اپنی نوع کی عیاشی کی زندگی تھی۔ اس میں سفیر اور دیگر حضرات کام کے بعد شراب و شباب کے کھیل میں مشغول ہو جاتے۔ سر ظفر اللہ خان واحد شخصیت تھے جو ایسی محفلوں میں نظر نہ آتے بلکہ یو این کے میڈی ٹیشن روم کو اپنی عبادت کے لیے استعمال کرتے۔ شاید اس عبادت کے کمرے کو ان کے سوا کوئی استعمال نہ کرتا تھا۔

بھٹو ہمارے مشن کے بنگالی انفرمیشن آفیسر سے سخت ناراض تھے۔ میرے سامنے بھٹو نے ان کی اتنی بے عزتی کی کہ وہ رو پڑے۔ بات دراصل یہ تھی کہ بھٹو چاہتے تھے نیویارک ٹائمز کے پہلے صفحے پر ان کی تصویر چھپے مگر ہمارے انفرمیشن آفیسر سے یہ اہم کام نہ ہو سکا۔ سو بھٹو نے انہیں ڈانٹ پلائی کہ تم سارا دن بار پر بیٹھے شراب پیتے رہتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایک انقلابی حکومت کا وزیر ہوں اور تمہیں ابھی ابھی نوکری سے فارغ کر سکتا ہوں۔ جب بھٹو وہاں سے چلے گئے تو انہوں نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ہم آپ پنجابیوں کے ساتھ کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ مشن میں ہم صرف دو بنگالی ہیں اور وہ بھی نچلے عہدوں پر۔ اعلیٰ عہدے آپ لوگوں نے سنبھال رکھے ہیں، حالانکہ ملک میں ہماری اکثریت ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بھٹو تو پنجابی نہیں، سندھی ہیں۔'' وہ کہنے لگے۔ ''ہمارے لیے تو آپ سب پنجابی ہیں۔'' مجھے بھٹو کے رویہ پر سخت افسوس تھا مگر ساتھ ہی مجھے یقین ہو گیا کہ مشرقی پاکستان کبھی نہ کبھی مغربی پاکستان سے علیحدہ ہو جائے گا۔

فارغ شاموں اور اختتام ہفتہ پر دو چیزیں میری دلچسپی کا باعث بنیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے معلوم ہوا کولمبیا یونیورسٹی میں پال تلوچ اور رائن ہولڈ نیوبر تقابلی مذاہب پر لیکچر دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات تھے۔ وحی کی عقل کے ساتھ تطبیق اور جدید انسان کے لیے مذاہب کی تعبیر کی خاطر لبرل ازم کی ضرورت۔ چونکہ ان لیکچروں میں ہر کوئی شریک ہو سکتا تھا۔ اسی لیے میں بھی شرکت کرنے لگا۔ دوسرا شوق نیویارک کے مشہور بیسمنٹ تھیٹروں کی پرفارمنس دیکھنا تھا۔ ''پاکستان ٹائمز'' اخبار کی نمائندہ ایک یہودی خاتون نے مجھے ان تھیٹر کلبوں کا رکن بنوا دیا اور مجھے بہت سے ایسے جدید ڈراموں کو اسٹیج پر دیکھنے کے مواقع ملے جو میں نے صرف پڑھ رکھے تھے۔

ایک عجیب اتفاق ہوا۔ آغا شاہی نے کچھ سفیروں، یو این سیکرٹریٹ کے چند اراکین اور نیویارک کی بعض اہم شخصیتوں کو اپنے فلیٹ میں پارٹی پر بلا رکھا تھا۔ میں ایک نوجوان جوڑے کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا اور انہیں بتا رہا تھا کہ فارغ اوقات میں میں تقابلی مذاہب پر لیکچر سننے کولمبیا یونیورسٹی جایا کرتا ہوں۔ خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ کس کے لیکچر سنتا ہوں؟ میں نے پال تلوچ کا نام لیا۔ کہنے لگیں کہ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ میں مذاہب کے بارے میں ان کی لبرل تعلیمات سے بہت متاثر ہوا ہوں کیونکہ اس قسم کی رواداری کی آج کے انسان کو اشد ضرورت ہے۔ وہ ہنس کر کہنے لگیں کہ لبرل ازم کی تعلیم دوسروں کو دینا اور اس کا اطلاق اپنی ذات پر بھی کرنا دو بالکل الگ الگ باتیں ہیں۔ میں نے کہا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟'' جواب دیا۔ ''میں پال تلوچ کی بیٹی ہوں۔ میں نے اپنی مرضی

سے ہنگری کے ایک مہاجر آرکیٹیکٹ سے شادی کی ہے جو مذہب کے یہودی ہیں اور آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس جرم کی سزا کے طور پر میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے اور میری صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں۔ سو میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پروفیسر پال تلوچ کی جو شبیہہ آپ نے دیکھی ہے، وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔''

انہی ایام میں یو این کی ایک دعوت پر میری ملاقات میکسیکو کے سفیر فرانسسکو کیووسکینو اور ان کی بیگم اینا سے ہوئی۔ اینا دراصل انگریز تھیں اور انگریزی ادب کے رومانی عہد کے ایک کم معروف شاعر کاوڈر کی پڑپوتی تھیں۔ انہیں فارسی شعراء خصوصاً حافظ کے کلام میں بڑی دلچسپی تھی اور انگلستان میں کسی پاکستانی ہائی کمشنر نے انہیں علامہ اقبال کے کلام سے بھی متعارف کرا دیا تھا بلکہ ''جاوید نامہ'' کے اصل فارسی متن کے ساتھ آربری کا انگریزی ترجمہ بھی تحفتاً دے رکھا تھا۔ اینا خود بھی انگریزی میں شعر کہتی تھیں۔ گو شوہر اور بچوں کے ساتھ ہسپانوی زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ فرانسسکو اور اینا کو بیس منٹ تھیٹر میں غیر معمولی قسم کے ڈرامے دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ چونکہ ہماری کئی دلچسپیاں مشترک تھیں، اس لیے چند ہی دنوں میں ہم آپس میں گہرے بے تکلف دوست بن گئے۔ اکٹھے تھیٹر جاتے یا پارٹیوں میں شریک ہوتے۔ ویسے یو این کی کمیٹیوں میں زیر بحث مختلف موضوعات پر بھی میکسیکو اور پاکستان کے نقطہ ہائے نگاہ میں عموماً اتفاق ہی ہوتا تھا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، بھٹو تقریباً دو ہفتے نیویارک ٹھہرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ انہوں نے یو این کی چند کمیٹیوں میں شرکت کی۔ مسلم اور افرو ایشین ممالک کے سفیروں کے ساتھ کشمیر کے مسئلہ پر بات چیت کی لیکن اس موضوع پر اصلی معرکہ تو سر ظفر اللہ خان اور کرشنا مینن کے درمیان ہوتا تھا۔ گھنٹوں لمبی منہ زبانی تقریریں ہوا کرتیں کیونکہ اس زمانہ میں یو این کے ممبر ملکوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ کرشنا مینن کے سیکرٹری رمیش بھنڈاری ان کے پیچھے پیچھے چلتے نظر آتے۔ انہیں میں کیمبرج کے دنوں سے جانتا تھا۔

چند ماہ میں میں نیویارک کی زندگی سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ یہ ڈپلومیٹک زندگی بھی خوب تھی۔ دن بھر نئے نئے سوٹ پہن کر یو این کی کمیٹیوں میں بیٹھتا اور تقریریں کرتا۔ شب کو کاک ٹیل پارٹیوں میں شرکت کرتا۔ اگر فارغ ہوتا تو تھیٹر دیکھنے یا تقابلی مذاہب پر لیکچر سننے کے لیے نکل جاتا' طرح طرح کے ملکوں کے باشندوں سے دوستی استوار کرنا۔ طرح طرح کے ریستورانوں میں جا کر کھانے کھانا۔ رات کے دو یا تین بجے واپسی پر اگر ٹیکسی نہ بھی ملے تو بڑے اطمینان اور سکون سے پیدل ہوٹل پہنچنا۔ مجھے نیویارک بہت اچھا لگنے لگا تھا مگر نومبر کا مہینہ ختم ہوتے ہی ایسی تیز اور ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں کہ اوورکوٹ پہننے کے باوجود وہ آپ کی ہڈیوں کی گہرائی تک پہنچ جاتی تھیں۔ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں نیویارک نے

برف کا کمبل اوڑھ لیا۔ یو این کے اجلاس ۲۴ دسمبر کو ختم ہو گئے۔ باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ واپس جانے لگے۔ نیویارک خالی ہوتا چلا گیا مگر میں نے کرسمس کی تعطیلات نیویارک ہی میں گزاریں۔

جنوری ۱۹۶۱ء میں میں نیویارک سے پھر لندن پہنچا۔ کیمبرج بھی گیا اور اپنی لینڈ لیڈی کے علاوہ پرانے اساتذہ آربری اور روبن لیوی سے ملا۔ لندن سے ہارڈ کالر، سفید قمیصیں، نکٹائیاں چند سوٹ اور بوٹ خرید کیے۔ بالآخر کراچی سے ہوتا ہوا لاہور آ گیا۔

لاہور پہنچ کر میں نے معمول کے مطابق وکالت شروع کر دی اور اس کے ساتھ لاء کالج میں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ اب میرا کام کچھ کچھ چل نکلا تھا۔ (چند برس میں سردار عبدالرب نشتر کی وفات کے بعد میں نے جمیل نشتر سے سردار صاحب کی قانون کی کتب کی لائبریری بھی خرید لی تھی) منیرہ اور صلی کا قیام جاوید منزل ہی میں تھا۔ آنٹی ڈورس نوکری کے ساتھ گھر کی دیکھ بھال بھی کرتی تھیں۔ میرا دن تو عموماً عدالتوں میں گزرتا اور شام منیرہ، صلی، ان کے بچوں اور آنٹی ڈورس کے ساتھ ہنسی مذاق میں گزر جاتی۔ ہفتے کی شب ''درویشوں'' کا اکٹھ میرے یہاں ہوتا۔ منیرہ اور آنٹی ڈورس کا خیال یہی تھا کہ میں اپنے ''درویش'' دوستوں کے سبب شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اکثر یوں بھی سوچتیں کہ آنٹی ڈورس چند ماہ بعد پاکستان چھوڑ کر برلن چلی جائیں گی اور منیرہ اور صلی بچوں سمیت گلبرگ میں اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔ تب میں اکیلا رہ جاؤں گا اور ممکن ہے تنہائی دور کرنے کی خاطر شادی پر آمادہ ہو جاؤں۔

افسوس یہ ہے کہ ہمارا کلچر ہونے والے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے ملنے اور سمجھنے کے حسبِ ضرورت مواقع فراہم نہیں کرتا۔ پرانے زمانہ میں ہماری مائیں، دادیاں اور نانیاں تو ان دیکھے اشخاص کو شوہروں کے طور پر قبول کر کے ساری عمر گھر کی چار دیواری میں بیٹھے گزار دیتی تھیں یا اگر کوئی شوہر ایک سے زائد بیویاں گھر میں ڈال لیتا، مارتا پیٹتا یا بے عزت کرتا تو اسے بھی عام طور پر برداشت کر لیا جاتا لیکن اب شاید حالات قدرے بدل گئے ہیں۔ اتنی بڑی آبادی مین کچھ لڑکیاں پڑھ لکھ گئی ہیں۔ اگر ان کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہے مثلاً ڈاکٹر ہیں، ٹیچر ہیں، وکیل ہیں تو پھر معاشی طور پر آزاد بھی محسوس کرنے لگی ہیں اور برصغیر میں عورت کے عام تصور کہ وہ خاوند کو اپنا مجازی خدا سمجھتی ہے، کی قائل نہیں رہیں۔

دراصل میں شادی کرنے سے ڈرتا تھا اور میرے خوف کی ایک وجہ یہ تھی کہ طبیعتوں میں یکجہتی نہ ہونے کے سبب کہیں طلاق تک معاملہ نہ جا پہنچے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں یورپی خواتین سے ملنے جلنے میں تو کوئی دقت محسوس نہ کرتا لیکن مجھے پاکستانی لڑکیوں سے گفتگو کرنے کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ ایک تو ان کی غیر ضروری شرم و حیا بات چیت میں حائل ہوتی تھی اور دوسرا یہ کہ اگر وہ باپردہ نہ بھی ہوں تو مخلوط محفلوں میں مردوں سے عادتاً الگ بیٹھتی تھیں۔ جب میں انگلستان سے واپس آیا تو اس زمانہ میں رواجاً لاہور کی مخلوط

پارٹیوں میں یورپین یا امریکی مرد اور عورتیں بھی مدعو کی جاتی تھیں۔ سو ایسی محفلوں میں بھی میں نے ایک طرح کا انگلستان ہی بنا رکھا تھا۔ یعنی میری واقفیت زیادہ تر یورپین یا امریکی خواتین سے تھی اور میں کسی مجرد یا بن بیاہی پاکستانی خاتون کو نہ جانتا تھا۔ جن ایسی خواتین سے اگر کبھی میری بہن یا ان کی سہیلیاں مجھے متعارف کراتیں بھی تو وہ شرماتی اتنا تھیں کہ بات چیت کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ ان کے نزدیک تو کھلکھلا کر ہنسنا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ یوں دانت دکھائی دینے لگتے جو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ سو کسی بات پر ہنسی آ بھی جاتی تو انہیں اخلاقی طور پر منہ بھینچ کر یا چہرہ چھپا کر ہنسنا پڑتا۔ عورت میں جس خصوصیت کو خود اعتمادی سمجھا جانا چاہیے۔ اسے ہمارے معاشرے میں بے باکی سمجھ کر رد کر دیا جاتا تھا۔

سیاسی طور پر لاہور میں میرے تعلقات میاں ممتاز دولتانہ سے تھے اور وہ اور ان کی بیگم مجھے اکثر اپنے گھر بلاتے رہتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں اگر کراچی جانے کا اتفاق ہوتا تو مس جناح کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنرل ایوب خان کے حکم پر میاں منظور قادر خفیہ طور پر ۱۹۶۲ء کا آئین تیار کر رہے تھے جس کے تحت صدر کے عہدے کا چناؤ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی ادارے نے کرنا تھا لیکن بظاہر جنرل ایوب خان نے جسٹس شہاب الدین سے فرمائش کر رکھی تھی کہ وہ پاکستان کے مستقبل کا آئین ترتیب دیں۔ جسٹس شہاب الدین چند روز پاکستان کے چیف جسٹس رہنے کے بعد سپریم کورٹ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ مجھ سے نہایت شفقت سے پیش آیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کے ہاں بھی میرا آنا جانا رہتا تھا۔ (افسوس ہے جنرل ایوب خان نے انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے بڑی محنت سے پاکستان کے لیے صحیح معنوں میں ایک صدارتی طرز کے جمہوری آئین کا ڈرافٹ بنایا لیکن جنرل ایوب خان نے میاں منظور قادر کا بنایا ہوا آئین ہی نافذ کیا۔ اس بات کا جسٹس شہاب الدین کو بہت رنج تھا بلکہ صدمہ بالآخر ان کی موت کا باعث بنا۔ عجیب اتفاق ہے، ان کی بیگم بھی ان کی وفات کے چند گھنٹوں بعد فوت ہو گئیں۔ دونوں کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی)۔

۱۹۶۱ء میں راولپنڈی میں (ابھی اسلام آباد پاکستان کا دارالحکومت بن رہا تھا) جنرل ایوب خان سے ملاقات پر جو اہم بات زیر بحث آئی، وہ یہ تھی کہ فقۂ اسلام کی تعبیرِ نو (جو علامہ اقبال کے نزدیک اشد ضروری تھی) کی خاطر کن علماء یا دانشوروں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ ان کے خیال کے مطابق پاکستانی علماء اس معاملہ میں زیادہ تر روایتی نقطہ نظر کے پابند تھے اور وقت کے جدید تقاضوں کی روشنی میں شریعت کی تعبیر میں ان سے کسی نئے رستہ کی تلاش میں رہبری کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ میں نے جنرل ایوب خان کو خصوصی طور پر اس مقصد کے لیے کینیڈا میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور فرانس میں پروفیسر حمید اللہ کے نام پیش کیے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان دونوں برگزیدہ ہستیوں سے رابطہ قائم کروں اور اگر ہو سکے تو انہیں

پاکستان آنے پر آمادہ کروں۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں میں دوسری بار اقوام متحدہ گیا۔ اس سال بھی پاکستانی وفد کی قیادت بھٹو کر رہے تھے۔ نیویارک کے پاکستان مشن میں خاصی گہما گہمی تھی کیونکہ سر ظفر اللہ خان اس سال جنرل اسمبلی کی صدارت کے امیدوار تھے اور وہ انتخابات میں کامیاب بھی ہو گئے۔ ان کی جگہ شاید خواجہ سعید حسن نے سال بھر کے لیے مشن کی سربراہی کے فرائض انجام دیئے۔ پاکستان نے اگر کبھی بین الاقوامی فورموں میں کوئی کامیابی حاصل کی تو اس میں سر ظفر اللہ خان کی شخصیت کا بڑا دخل تھا۔ وہ نہ صرف سال بھر کے لیے یو این کی جنرل اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے بلکہ دو مرتبہ یو این کے تحت بین الاقوامی عدالت میں جج کی حیثیت سے بھی چنے گئے۔

اس مرتبہ فرسٹ پولیٹیکل کمیٹی میں تو بھٹو یا خواجہ سعید حسن ہی بیٹھتے رہے۔ میں زیادہ تر سپیشل پولیٹیکل کمیٹی کے معاملات کو سنبھالتا رہا۔ اے ٹی ایم مصطفےٰ بدستور لیگل کمیٹی سے منسلک رہے۔ تقابلی مذاہب پر لیکچر سننے یا بیسمنٹ تھیٹروں میں ڈرامے دیکھنے میں میری دلچسپی بدستور قائم رہی۔ اینا اور فرانسسکو کے علاوہ یو این کے سیکرٹریٹ میں حقوق انسانی سے متعلقہ کمیشن کی ممبر خواتین جوڈی بنگھم تھرڈ، باربرا کراؤس اور ماڈی ڈیوس سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ یہ خواتین پرنس علی خان مرحوم کو جاننے والی تھیں اور پاکستان مشن میں ان کی بعض پارٹیوں میں بھی شریک ہو چکی تھیں۔ اسی طرح بیرن فان براؤن (امریکہ میں راکٹ اور میزائل کے موجد جرمن سائنسدان براؤن کے بھائی) سے بھی دوستی ہوئی۔

جوڈی بنگھم تھرڈ کے کوائف نیویارک کی کتاب ''یہاں کون کون ہے'' میں درج تھے۔ وہ بنگھم تھرڈ کی مطلقہ تھیں اور ان کا تعلق ریاست ٹکساس کے ایک نہایت مالدار گھرانے سے تھا۔ ففتھ ایونیو میں ان کے عالیشان فلیٹ میں میری ملاقات معروف ہسپانوی آرٹسٹ سلواڈور ڈالی اور آئرش ناولسٹ جیمز جوئس کے پوتے ولیم سے ہوئی۔ دراصل جیمز جوئس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ البتہ اس کا ایک حرامی بیٹا تھا جس کا ولیم فرزند تھا لیکن ولیم انگریزی بولتا تھا نہ آئرلینڈ میں رہتا تھا۔ وہ فرانسیسی بولتا تھا اور اپنی فرنچ بیوی کے ساتھ پیرس میں مقیم تھا۔

ماڈی ڈیوس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ جیکی کینڈی کی قریبی عزیز ہونے کے سبب اپنے فلیٹ سے جیکی کو فون کیا کرتیں۔ وہ ڈیموکریٹ پارٹی سے منسلک تھیں اور ان کے دل میں بھارت کے لیے ''سافٹ کارنر'' تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں قیام پاکستان کی وجوہات کا قائل کیا۔ میں نے ان کا تعارف سر ظفر اللہ خان سے کرایا۔ وہ جیکی کینڈی سے ان کی نسبت کے سبب غیر معمولی تپاک سے انہیں ملا کرتے۔

باربرا کراؤس ایک نہایت خوبصورت اور مدبر خاتون تھیں جو مختلف ممالک میں حقوق انسانی کے

تحفظ کی خاطر بڑی جانفشانی سے کام کرتی تھیں۔ بیرن فان براؤن کا تعلق جرمن طبقہ اشرافیہ سے تھا۔ وہ دوسری جنگ عظیم میں کینیڈا میں جنگی قیدی رہ چکے تھے۔ نظریاتی طور پر وہ ابھی تک نازی تھے اور یہودیوں سے بہت نفرت کرتے تھے۔ وہ حکومت مغربی جرمنی کی وزارت خارجہ سے تعلق رکھتے تھے اور مغربی جرمنی کے نمائندہ کے طور پر اقوام متحدہ کی کمیٹیوں میں مبصر کی حیثیت سے حصہ لیتے تھے کیونکہ جرمنی کے دو حصوں میں منقسم ہونے کے سبب (متحدہ) جرمنی یواین کا ممبر نہ تھا۔ میری اور ان کی دوستی دیوارِ برلن کی وجہ سے ہوئی۔ اس دیوار کو ہٹانے اور مغربی اور مشرقی جرمنی کو ایک بنانے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خاطر سپیشل پولیٹیکل کمیٹی نے رپورٹ پیش کرنے کے لیے جو ذیلی کمیٹی ترتیب دی، اس میں ہم دونوں شریک تھے۔

فرانسسکو نے مجھے اگلے سال (۱۹۶۲ء میں) میکسیکو آنے کی دعوت دی۔ بات یوں تھی کہ لاطینی امریکہ میں میکسیکو کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ملک امریکہ کی جنوبی سرحد پر واقع ہے اور ماضی میں دیگر تنازعوں کے علاوہ اس کی یہی کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرز پر ریاست ہائے متحدہ لاطینی امریکہ وجود میں لائی جائے۔ اس سیاسی فلسفہ کا محرک میکسیکی سیاسی مدبر بولیوار تھا مگر جنوبی امریکہ کی ریاستوں کے اتحاد کو امریکہ اپنے مفادات کے خلاف سمجھتا تھا۔ اسی سبب میکسیکو سے امریکہ کے تعلقات ہمیشہ خراب ہی رہے بلکہ وسطی امریکہ (یعنی میکسیکو، گوئٹے مالا، پانامہ، نکاراگوا) میں شمالی امریکہ کی ''بھی موئی''، ظلم وستم اور ریاستی دہشت گردی کے سبب امریکنوں کے خلاف شدید نفرت اور حقارت کے جذبات آج بھی وہاں موجود ہیں۔

یواین نے میکسیکو کے لیے ایک خصوصی فنڈ مختص کر رکھا تھا جس کے تحت میکسیکو شہر میں ایک کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج میں تمام لاطینی امریکہ کی ریاستوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تحصیل کے لیے منتخب طلباء اور طالبات کی خاطر تین ماہ کا کورس متعین کیا گیا جو مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے مطالعہ کے بارے میں تھا۔ لیکچروں کے لیے طالبعلموں کو دو زبانیں یعنی انگریزی اور فرانسیسی جاننا ضروری تھا۔ جن اہم شخصیات کو اپنے اپنے کلچر پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا، ان میں گھانا کے معزول صدر نکروما، سوڈان کے معزول وزیراعظم صادق المہدی، بھارت کے اشوکا مہتہ اور اسی طرح سوویٹ روس، یورپ اور برطانیہ کی بعض علمی شخصیات تھیں۔ تنخواہ بڑی معقول تھی اور ڈالروں میں ادا کی جاتی تھی۔ کورس جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۶۲ء کے تین ماہ پر مشتمل تھا۔ مجھے ''اسلامی تمدن'' کے موضوع پر لیکچر دینے کی ذمہ داری سونپی گئی جو میں نے قبول کرلی۔

دسمبر میں یواین اسمبلی کے اجلاس کے خاتمہ پر میں ریل گاڑی کے ذریعہ نیویارک سے مانٹریال

پہنچا۔ کینیڈا میں بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ پیدل چلنے والے رستوں پر چھ چھ فٹ اونچی برف کے درمیان میں سے چلنے کے لیے رستہ بنایا گیا تھا۔ میں میکگل یونیورسٹی گیا اور ڈاکٹر شیلا میکڈونا کو ساتھ لے کر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے گھر پہنچا۔ فضل الرحمٰن سے شیلا میکڈونا نے میرا تعارف کرایا اور میں نے انہیں جنرل ایوب خان کی طرف سے پاکستان واپس آنے کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ میری نگاہ میں علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمٰن ہی ایک ایسے عملی اسلامی اسکالر تھے جن کے علمی مشوروں سے پارلیمنٹ کے لیے فقہ اسلام کی تعبیر نو ممکن تھی۔ (جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کا سربراہ مقرر کیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے پاکستان میں مستقل طور پر قیام کی غرض سے سندھ میں چند مربع اراضی بھی خرید لی لیکن پاکستان میں ہمیشہ یہ روایت رہی ہے، باہر سے آنے والے کسی پاکستانی عالم کو مقامی عالم ٹکنے نہیں دیتے۔ اسی طرح سب سے پہلے تو فضل الرحمٰن کی مخالفت (علامہ) علاء الدین صدیقی نے کی۔ بعدازاں بنگال کے نظام اسلام پارٹی کے مولوی فرید احمد نے نیشنل اسمبلی میں اسلام کے موضوع پر ان کی تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے ان پر سراسر غلط اور جھوٹے الزام لگائے۔ بالآخر جنرل ایوب خان کے سیاسی زوال کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ وہ واپس امریکہ جا کر شکاگو یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔)

میں امریکہ سے واپسی پر ایک بار پھر کپڑے خریدنے کے لیے لندن رکا۔ لندن سے پیرس پہنچا۔ وہاں علامہ اقبال کے پرانے دوست معروف مستشرق پروفیسر مینسینیون کو صدر ڈیگال نے الجیریا کے مسلمانوں کی آزادی کے حق میں بھوک ہڑتال اور احتجاج کرنے کے الزام میں قید کر رکھا تھا۔ یہ وہی پروفیسر مینسینیون ہیں جو علامہ اقبال کی برگساں سے ملاقات کے موقع پر موجود تھے اور جنہوں نے ان کی گفتگو کے شاید نوٹس بھی لیے تھے۔ میں پاکستانی سفارت خانہ کی وساطت سے بیاسی سالہ پروفیسر مینسینیون کو جیل میں ملنے گیا اور ان کی خیریت پوچھی۔ (وہ ۱۹۶۲ء میں جیل سے رہائی کے بعد انتقال کر گئے) اسی طرح سفارت خانہ کی وساطت سے پروفیسر حمید اللہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ وہ ایک نہایت ہی چھوٹے سے کمرے میں (جو کہ دراصل ایک گھر کی "ایٹک" تھا) مقیم تھے۔ میں نے انہیں بھی جنرل ایوب خان کا پیغام پہنچایا لیکن انہوں نے پاکستان آنے سے صاف انکار کر دیا۔ فرمایا: "میں جب حیدرآباد (دکن) سے نکلا تو پہلے پاکستان ہی آیا تھا مگر یہاں کی یونیورسٹیوں کے باسیوں نے مجھے آباد ہونے نہیں دیا۔ میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا گیا جیسا ڈاکٹر عبدالسلام سے کیا گیا تھا۔ اب پیرس میں ہر روز چند فرانسیسی میری دعوت پر اسلام قبول کرتے ہیں۔ مجھے پاکستان آنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں پیرس سے بون پہنچا اور چند روز ڈاکٹر این میری شمل کے ساتھ گزارنے کے بعد جنوری ۱۹۶۲ء کے آخر میں لاہور پہنچ گیا۔

لاہور میں حسب معمول میں وکالت اور یونیورسٹی لا کالج میں لیکچر دینے میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً پانچ ماہ بعد پھر لاہور سے میکسیکو کے سفر پر روانہ ہوا۔ پاکستان میں میکسیکو کا سفارت خانہ موجود نہ تھا۔اس لیے وہاں کا ویزا لندن سے حاصل کیا گیا۔ چند روز لندن میں قیام کے بعد میں براستہ نیویارک میکسیکو سٹی پہنچا۔ ایئرپورٹ پر فرانسسکو اور میکسیکو کی وزارت خارجہ کے پروٹوکال آفیسر نے استقبال کیا۔ فرانسسکو نے اپنی رہائش گاہ کے قریب میرے لیے اپارٹمنٹ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ مجھے اسی میں ٹھہرایا گیا۔ دو ایک روز تو رات کا کھانا میں فرانسسکو کے گھر ہی کھاتا رہا۔ بعدازاں میں نے اپنا انتظام کر لیا بلکہ ناشتہ اور رات کا کھانا خود بنا لیتا تھا۔

پہلی چیز جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، وہ میکسیکو میں آم کھانے کا طریقہ تھا۔ پاکستان کی طرح میکسیکو میں بھی آم پیدا ہوتے ہیں اور کھائے جاتے ہیں مگر ان کا ذائقہ ہمارے آموں کی طرح عمدہ نہیں ہوتا۔ البتہ آم کھانے کا طریقہ وہاں کی اپنی اختراع ہے۔ امراء کے طبقہ میں اس مقصد کے لیے علیحدہ قسم کی چھری، کرچ یا تلوار نما کانٹا اور چھوٹا سا چمچہ استعمال کیا جاتا ہے۔ نوکیلی کرچ نما چاندی کی تلوار پلیٹ پر رکھے آم کی گٹھلی میں اس طرح گھونپ دی جاتی ہے جیسے بل فائٹر کی تلوار بیل کے سر میں گھونپی جاتی ہے۔ پھر الٹے ہاتھ سے آم کو سیدھا تھام کر چاندی کی چھری سے آم کی کاشیں کاٹ لی جاتی ہیں۔ بعد میں چاندی کے چمچہ کے ساتھ آم کا گودا چھلکے سے نکال کر کھایا جاتا ہے اور آخر میں تلوار میں پھنسی گٹھلی کو منہ کے قریب لے جا کر اس کا گودا بھی دونوں طرف سے نوش کر لیا جاتا ہے۔ یوں نہ تو ہاتھ آم کے رس سے لت پت ہوتے ہیں اور نہ منہ۔

میکسیکن لوگ چاول، سالن اور روٹی بھی ہماری طرح ہی پکاتے ہیں۔ گو ان کے سالن مصالحہ نہ ہونے کے سبب ہمارے سالن کی طرح مزیدار نہیں ہوتے۔ البتہ مرچ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ مکئی کی روٹی پھلکے کی طرح بنائی جاتی ہے۔ اسے تورتیہ کہتے ہیں اور بڑے شوق سے عوام و خواص کھاتے ہیں۔ بعض کھانے کی اشیاء انہوں نے شاید اپنے ریڈ انڈین یا ''ایزٹک'' پیشرووں سے میراث میں حاصل کی ہیں۔ مثلاً مکڑی یا تتلیوں کو فرائی کر کے کھایا جاتا ہے۔ ''قبروں'' کے خشک کئے ہوئے کالے مکوڑے مکھن میں فرائی کر کے ٹوس پر رکھ کر اس طرح کھاتے ہیں جیسے روسی لوگ کیوی یار (مچھلی کے انڈے) کھاتے ہیں۔ اکثر ریستورانوں میں اگر چپس جیسی ڈش آپ کے سامنے رکھی جائے تو ضروری نہیں کہ وہ آلو، چاول یا مچھلی کے چپس ہوں بلکہ سور کی چربی سے بنے چپس ہوں گے۔ ایک چھوٹی سی مچھلی جو بحرالکاہل کے ساحلوں پر پکڑی جاتی ہے، ناشتہ پر اس کے اپنے ہی تیل میں تل کر کھائی جاتی ہے لیکن اس کا سب سے پسندیدہ حصہ اس کی آنکھیں سمجھی جاتی ہیں جن کے کھانے سے بقول ان کے عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔

امراء طبقہ کی رہائش گاہیں اور ملکیتی اراضی بھی قابل ذکر ہیں۔ امراء عموماً زمیندار ہیں اور ان میں سے اکثریت کی اراضی ''رینچو'' کہلاتی ہے یعنی ''رینچ'' یا شہر سے باہر دس یا بیس مربعوں پر مشتمل اراضی کا ٹکڑا۔ ''رینچو'' میں پھلوں کے باغات، سبزیوں، گیہوں، مکئی وغیرہ کے کھیت، بھیڑ بکریوں، گائے بھینسوں یا سوروں کے ریوڑ پالے جاتے ہیں۔ ویک اینڈ گزارنے کے لیے نہایت چھوٹے چھوٹے نفیس گھر، نہانے کے لیے تالاب اور دیگر تعیش کی اشیاء موجود ہوتی ہیں۔ اکثر امراء اپنی پارٹیاں یا شادی بیاہ کی تقاریب ''رینچو'' پر ہی منعقد کرتے ہیں۔ یہاں سیاسی اقتدار بھی دراصل امراء کے ہاتھ ہی میں ہے۔ امراء اپنے علاقوں سے سینیٹر منتخب ہو کر آتے ہیں اور چھ سال کی ٹرم پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ میکسیکن آئین کے تحت ایک مرتبہ منتخب ہونے والا سینیٹر دوسری بار امیدوار کے طور پر کھڑا نہیں ہو سکتا، لہٰذا اپنے چھ سال کی ٹرم میں وہ زمیندار جتنی کرپشن کر سکتا ہے، کر لیتا ہے۔ اگر کوئی معمولی شخص اپنے سیاسی کیریئر کی ابتداء غریبوں کے ہمدرد یا سوشلسٹ کی حیثیت سے کرے تو اقتدار میں آ کر وہ بھی اتنا امیر ہو جاتا ہے کہ ''رینچو'' کے علاوہ میکسیکو شہر میں عالیشان مینشن اور مہنگی اطالوی موٹر کاروں کا فلیٹ رکھ سکتا ہے۔ میں جس زمانہ کی بات کر رہا ہوں۔ تب میکسیکو کے صدر لوپز ماتھیسز تھے۔ انہوں نے ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے سوشلسٹ ایجنڈے کے تحت اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز کیا۔ جب غریبوں میں مقبول ہو گئے تو امراء طبقہ کے سینیٹروں نے جن کے لیڈر تب سینیٹر موریونا سکانو تھے، انہیں صدر کے عہدے پر فائز کروا دیا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے میکسیکو میں غربت کے خاتمہ یا فلاح عامہ کے لیے کون کون سے کام انجام دیئے مگر جب میں ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ان کا شمار میکسیکو کے نہایت دولت مند افراد میں ہوتا تھا۔

میکسیکو میں امراء کی مینشنز یا رہائش گاہیں بھی نہایت عالیشان اور فنِ تعمیر کے اعتبار سے نہایت عجیب و غریب ڈیزائنوں کی ہیں۔ مثلاً ہسپانوی طرز کی عمارت سازی یا مورش محرابوں کے ساتھ بعض گھروں میں نئے ڈیزائن کے صوفے، کرسیوں اور قالینوں کے علاوہ ڈرائنگ روم میں مخصوص قسم کے پودے، یہاں تک کہ درخت بھی لگا دیئے گئے ہیں یا انواع و اقسام کے پرندوں اور رنگ برنگے طویل قامت اور قوی ہیکل طوطوں کے بڑے بڑے پنجرے نصب کیے گئے ہیں۔ گمان یوں ہوتا ہے گویا آپ کو کسی گھنے جنگل میں درختوں اور چہچہاتے پرندوں کے درمیان قالین بچھا کر صوفہ پر میز سامنے رکھ کر بٹھا دیا گیا ہے۔

میکسیکو شہر ایک مردہ آتش فشاں پہاڑ کے منہ میں قائم ہے اور کہتے ہیں کہ ہر صدی ایک یا دو فٹ نیچے زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ شہر ہسپانوی یورپی طرز کا ہے اور یہ ملک امریکہ سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں غربت کی انتہا ہے مگر عام لوگ بڑے ملنسار، خوش اخلاق اور مخلص ہیں۔ میکسیکن قوم دراصل ہسپانوی

اور ریڈ انڈین اقوام کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ یہاں کی ہسپانوی زبان میں کئی الفاظ اور تراکیب ریڈ انڈین ہیں۔ اس لیے اسے میکسیکن کہا جاتا ہے۔ ان کے پرانے مذہب کے عجیب وغریب مندر اب بھی موجود ہیں جہاں سینکڑوں سیڑھیاں چڑھ کر قربان گاہ پر انسانی قربانی دی جاتی تھی۔ ملک ایزٹک ایمپائر کا حصہ تھا۔ آخری ایزٹک بادشاہ کے پیروں میں آگ جلا کر ہسپانویوں نے اسے مار ڈالا تھا۔ اب لوگوں کا مذہب کیتھولک ہے جو ہسپانوی ایمپائر کے زمانہ میں ان پر زبردستی ٹھونسا گیا۔ طویل مدت تک میکسیکو ہسپانیہ کی نوآبادیات میں شامل رہا۔ کچھ عرصہ تک یہاں یورپی بادشاہت بھی قائم ہوئی۔ اس سلسلہ میں شاہ میکسملین کا نام مشہور ہے جسے پہلے انڈین میکسیکن صدر واریز نے ملک بدر کیا تھا۔ میکسیکو کی آزادی کی جنگ میں زیپاٹا سمیت بہت سی اہم شخصیات کے نام شامل ہیں۔ اگر شہر کی معروف آرٹ گیلری میں ڈی ویلرا کی تصاویر کی نمائش دیکھیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں امریکنوں نے کس کس نوع کے ظلم ڈھائے اور انہیں کس قدر نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ غربت کے سبب یہاں لاطینی امریکہ کے دیگر غریب ملکوں کی طرح آئے دن انقلابات آتے رہتے ہیں۔ اکثریت دیہاتی لوگوں کی ہے۔ مرد محنت مزدوری کرتے ہیں یا گا بجا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں یا جاگیرداروں کے مفلوک الحال مزارع ہیں۔ لاوارث عورتیں اور بچیاں مافیا کے جال میں پھنس کر نائٹ کلبوں کی زینت بنتی ہیں یا پیشہ کرتی ہیں۔

کورس شروع کرنے سے پیشتر سب مہمان پروفیسروں کے لیے الکی ہوڈی میہکو یعنی ''میکسیکو کے خصوصی کالج'' کی طرف سے چائے کی پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں نہ صرف انہیں آپس میں ملوایا گیا بلکہ میکسیکو یونیورسٹی کے ریکٹر اور مختلف شعبوں کے چیئرمینوں سے بھی متعارف کرایا گیا۔

میری کلاس میں کوئی تیس پینتیس طلباء وطالبات تھے۔ یہ لوگ (کیوبا کے علاوہ) مختلف لاطینی امریکہ کے ملکوں کے بارسوخ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً کارمن مورینو ٹاسکانو میکسیکو میں سب سے بااثر سینیٹر کی بیٹی تھیں (آج کل یو این کے میکسیکو مشن میں سفیر ہیں) پے پے میکسیکو کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے پریذیڈنٹ کا بیٹا تھا، تھلماس اکون سالارزا نونکاراگوا کے صدر سموزا کی بہن کی بیٹی تھیں، مارکوس منیڈا السلوا ڈور کے کسی وزیر کا بیٹا تھا۔ اسی طرح گوئٹے مالا، ایکوے ڈور، کولمبیا، پیرو، پانامہ، پیراگوئے، یوراگوئے، چلی، بولیویا، ہانڈورس، برازیل اور ارجنٹینا سے جو بھی طلباء وطالبات اس کورس کا حصہ تھے، زیادہ تر بارسوخ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چند طلباء عام لوگوں میں سے تھے۔ مثلاً گوئٹے مالا سے جو طالب علم تھا، وہ اپنے ملک کی کسی انقلابی تحریک میں حصہ لے چکا تھا اور اس کے جسم پر گولیوں کے نشانات تھے۔ (ان لوگوں میں سے بعض سے میرے اب تک روابط قائم ہیں۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ملک میں سفیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں یا اپنے اپنے ملکوں میں یا یو این کے سیکرٹریٹ میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔)

اپنے تین ماہ کے ''اسلامی تمدن'' کے کورس میں جو موضوع میں نے شامل کیے۔ وہ یہ تھے۔ ''دین اسلام کے پانچ ارکان، عبادات اور معاملات میں تمیز (پہلا پرچہ) قانونِ شریعت (کریمینل اور سول) جہاد اور قتال، اجتہاد (قرآن، سنت، اجماع و قیاس) کے استعمال کا مقصد (دوسرا پرچہ) تاریخِ اسلام (میثاقِ مدینہ سے لے کر ۱۹۲۴ء یعنی خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ تک) (تیسرا پرچہ) جدید دنیائے اسلام (چوتھا پرچہ) اسلام کا سیاسی فلسفہ، اخلاقیات، مابعد الطبیعات، فلسفہ و تصوف آرٹ، فن تعمیر، ادب، موسیقی (پانچواں پرچہ) اور اسلامی تمدن کے خصوصی اوصاف پر مضمون (چھٹا پرچہ)۔

میرا لیکچر دو گھنٹہ کا ہوتا تھا جس کے درمیان پندرہ منٹ کا وقفہ دیا جاتا۔ چھٹی صرف اتوار کو ہوتی تھی۔ ہر ہفتہ کی کارگزاری پر طلباء و طالبات کو سوالات دیئے جاتے اور ہر پیر کو ان کے جوابات وصول کر کے انہیں نمبر دیئے جاتے۔ گروپ کی سمجھ بوجھ کا معیار خاصا بلند تھا۔ اس لیے کوئی بات انہیں سمجھانے میں مجھے زیادہ دقت پیش نہ آتی۔ میرے پڑھانے کا انداز بڑا عام فہم، سادہ اور مزاحیہ تھا۔ کسی نکتہ کی وضاحت کے لیے کوئی کہانی سنانے یا کوئی شعر پڑھ کر اس کا مطلب سمجھانے کا طریقہ بھی اختیار کیا کرتا۔ گروپ کے لیے میرا اپارٹمنٹ ایک طرح کا اوپن ہاؤس تھا۔ طلباء و طالبات جب بھی چاہیں جس وقت چاہیں میرے یہاں آ سکتے تھے بلکہ تقریباً ہر شب نہ سہی ہر دوسری یا تیسری شب میرے یہاں وہ سب پارٹی پر مدعو ہوتے تھے۔ میرے کچن میں لڑکیاں خود کھانا پکاتیں اور سب مل کر کھاتے۔ اسی سبب میں ان سب میں بے حد مقبول پروفیسر سمجھا جانے لگا۔ میکسیکو شہر اور اہم مقامات کی سیر بھی مجھے طلباء نے ہی کرائی۔

میں نے اپنی نقل و حرکت کے لیے ایک چھوٹی موٹر کار فوکس ویگن ماہوار کرایہ پر رکھ لی۔ (میکسیکو میں زیادہ تر موٹر کاریں فرنچ، اطالوی یا جرمن ہیں) البتہ رستے سمجھانے کے لیے میں کسی نہ کسی طالبعلم کو اپنے ساتھ ضرور بٹھا لیا کرتا۔ ایک مرتبہ غلط طرف مڑ جانے کے سبب کانسٹیبل نے میرا چالان کرنا چاہا مگر ساتھ بیٹھے طالبعلم نے سودا کرا دیا اور دس روپے مالیت کے قریب ''پیسوس'' دے کر چھٹکارا ہو گیا۔ (اس زمانہ میں ڈالر پانچ روپے کا تھا اور ایک ڈالر میں بارہ سو ''پیسوس'' ملتے تھے۔)

میں نے تین ماہ سے کچھ پیشتر ہی اپنا کورس مکمل کر کے گروپ کے آخری امتحانات کرا دیئے تھے۔ گروپ میں تقریباً اٹھانوے فیصد طلباء و طالبات کامیاب ہوئے اور صرف چند ہی کے نتائج غیر تسلی بخش تھے۔ طلباء میں ایک طالبعلم ایتھوپیا (ایبے سینیا) کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو میکسیکو کا شہری بن چکا تھا۔ اسے سب پرنس سلاسی کہتے تھے۔ پرنس بڑا شوقین مزاج اور دولتمند شخص تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ میکسیکو میں تھیٹر کا بانی ایک جاپانی شخص تھا۔ یہ تھیٹر پہلے چند برس یورپی ڈراموں کے ہسپانوی تراجم پیش کرتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ میکسیکو کے اس نیشنل تھیٹر میں میکسیکن ڈرامے ہونے لگے۔

پرنس کے پاس ایک مہنگی امریکن سپورٹس کار تھنڈر برڈ تھی۔ وہ اور گروپ کے چند دیگر لڑکے مجھے میکسیکو شہر سے باہر ٹاسکو لے گئے۔ میکسیکو شہر سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ بلندی پر ہے لیکن پہاڑ سے نیچے دامن میں ٹاسکو شہر واقع ہے جو اپنی چاندی کی کانوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ چاندی کی کانوں کا انچارج ایک امریکی تھا جو بیوی بچوں کے ساتھ اپنی عالیشان مینشن میں مقیم تھا۔ میرے پاس اس کا پتا موجود تھا۔ سو میں اسے جا کر ملا۔ اس نے بڑا اصرار کیا کہ میں اور میرے شاگرد اسکے ساتھ لنچ میں شریک ہوں لیکن طلباء نے صاف انکار کر دیا کہ ہم کسی امریکی کی دعوت قبول نہ کریں گے، لہٰذا میں بھی وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور طلباء کے ساتھ ڈرائیو کرتے ہوئے ٹاسکو سے بحر الکاہل کے کنارے واقع سیرگاہ (ریزورٹ) اکاپلکو پہنچ گیا۔ یہاں ہم سب نے رات سمندر کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں آویزاں جھولوں میں لیٹ کر گزاری۔ رات بھر سمندر کی لہروں کے شور میں چمگادڑوں کی چیخ و پکار نے سونے نہ دیا۔ صبح اٹھ کر ہم نے بحر الکاہل کے پانیوں میں ڈبکیاں لگائیں اور مچھلی فروشوں کے اسٹال پر کافی کے ساتھ وہ مچھلی کھائی جس کی آنکھیں کھانے سے عقل بڑھتی ہے۔ وہ رات مجھے آج تک نہیں بھولی، طلباء نے مجھے بتایا کہ غریب میکسیکن لوگ اسی طرح اپنی چھٹیاں مناتے ہیں۔ چند گھنٹے اکاپلکو کی سیر کے بعد ہم چھ سات گھنٹوں کا سفر کار میں طے کرتے ہوئے رات گئے میکسیکو پہنچے۔

طلباء مجھ سے خاصے مانوس اور بے تکلف ہو گئے تھے۔ ایک روز ان میں سے چند مجھے کہنے لگے۔ ''پروفیسور رے! جب تک آپ میکسیکو کا ریڈ لائٹ ایریا نہ دیکھیں گے، ہم آپ کو واپس نہ جانے دیں گے۔'' میں چلنے کو تیار ہو گیا۔ پس ایک رات پرنس سلاسی کی کار میں چند طلباء مجھے ریڈ لائٹ ایریا میں لے گئے۔ یہاں بہت سی بارین تھیں بلکہ مے نوش کرتے ہوئے گاہکوں کے روبرو بار کے اوپر نیم برہنہ لڑکیاں نہایت شوریلی موسیقی کے ساتھ محوِ رقص تھیں۔ کارلوس نے مجھے بتایا۔ ''سر! یہ میکسیکو کے غریب عوام کی بہو بیٹیاں ہیں۔'' ہم ایک بار پر کھڑے تھے کہ اچانک کسی گاہک نے شراب کے نشہ میں چور ہو کر ساتھ کھڑی ایک خوبصورت لڑکی کے گریبان میں شراب کا پورا گلاس انڈیل دیا۔ لڑکی اس کی حرکت پر رونے لگی اور شرابی قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور کچھ کہے سنے بغیر اس شرابی کو گریبان سے پکڑ کر میں نے اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ وہ گر پڑا اور لڑکی میرا بازو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ طلباء حیران پریشان ہو کر دیکھتے رہ گئے۔ پھر ان سب نے فوراً مجھے پکڑا، تیزی سے وہاں سے نکلے اور موٹر کار میں مجھے بٹھا کر یہ جا وہ جا۔ پرنس سلاسی کہنے لگا۔ ''سر! آپ نے یہ کیا کیا؟ ابھی ابھی یہاں پستولیں چل سکتی تھیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھ سے لڑکی سے ہوتی ناانصافی دیکھی نہیں گئی۔ میں شرمندہ ہوں۔'' مارکوس بولا۔ ''شرابی نے آپ کے سفید رنگ کے سبب آپ کو امریکن سمجھا، اس لیے جوابی کارروائی کی اسے جرأت نہ ہوئی۔ میکسیکن لوگ

امریکنوں سے نفرت کرتے ہیں اوران سے ڈرتے بھی بہت ہیں۔آپ نے اس لڑکی سے ہمدردی کے طور پر اتنا شدید ردِ عمل دکھایا۔یہ لڑکی تو کل بھی یہیں ہوگی اور کوئی نہ کوئی اس کے گریبان میں اسی طرح شراب کا گلاس انڈیل رہا ہوگا۔"

میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ نہ تھا۔اس سے پیشتر ایک بار لاہور میں بھی میں آپے سے باہر ہوگیا تھا۔بہرحال مجھے احساس تھا کہ لڑکوں نے باقی طلباء وطالبات کو گزشتہ رات کے واقعہ کے بارے میں بتادیا ہوگا۔میں اپنی خفت اور شرمندگی کے باعث کلاس میں جانے سے گھبراتا تھا لیکن جب میں کلاس روم میں داخل ہوا تو سب لڑکے لڑکیاں مسکراتے ہوئے یکدم اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور میرا استقبال یوں کیا جیسے میں کوئی معرکہ سر کر کے آیا ہوں۔پے پے کہنے لگا۔"سر! آپ نے ہم سب کے دل موہ لیے ہیں،ہمیں آپ کے شاگرد ہونے پر فخر ہے۔میں تو اپنے آپ کو آپ کا بیٹا سمجھتا ہوں۔" گوئٹے مالا کا لڑکا جس کے جسم پر گولیوں کے نشان تھے،سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔"پروفیسور ے! آپ یہاں ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟ ہم دیہات میں جا کر کسانوں کو منظم کر سکتے ہیں۔ہتھیار حاصل کرنے کے لیے رقوم بھی جمع کی جا سکتی ہیں۔آپ اس بات کو مذاق نہ سمجھیں بلکہ یقین کیجئے ہم آپ کی رہبری میں یہاں انقلاب لا سکتے ہیں۔" (یہ وہ زمانہ تھا جب شمالی امریکہ اور لاطینی امریکہ کی بیشتر یونیورسٹیوں میں طلباء نے ہنگامہ آرائی شروع کر رکھی تھی۔احتجاج کو ختم کرنے کے لیے گولیاں چلانی پڑیں اور کئی طلباء ان گولیوں کی نذر ہوگئے۔) میں نے اس طالبعلم پر واضح کیا کہ میں انقلابی نہیں ہوں،مار دھاڑ میرا مستقل شیوہ نہیں ہے۔میں تو پروفیسر ہوں جو تمہاری معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر یہاں آیا ہوں۔لیکچر کے اختتام پر پے پے میرے پیچھے پیچھے میرے کمرے تک آیا۔کہنے لگا۔"سر! میں آپ سے بے حد متاثر ہوں۔کیا یہ ممکن ہے کہ میں خفیہ طور پر مسلمان ہو جاؤں؟" میں نے جواب دیا۔"پے پے دیکھو! میں کوئی مبلغ یا مشنری نہیں ہوں۔نہ میں خود کوئی اچھا مسلمان ہوں۔علاوہ اس کے مجھے ایسے لوگ بھی پسند نہیں جو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔میں ایسے لوگوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

مجھے دیگر پروفیسروں کے متعلق تو علم نہیں کیونکہ ایک دوسرے کے ساتھ ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں لیکن میں اکثر امراء کے گھروں میں پارٹیوں یا کھانوں پر بلایا جاتا شاید اس کا سبب اینا اور فرانسسکو کے ساتھ میری قربت تھی۔ایک شام سنیٹر مارینوٹاسکانو کے رینچو پر کارمن کی چھوٹی بہن وِتوریہ کی شادی کے موقع پر میری ملاقات میکسیکو کے صدر لوپز ماتھیسز سے کرائی گئی۔صدر ماتھیسز بڑے تپاک سے ملے۔باتوں باتوں میں ذکر آیا کہ یو این میں اکثر گلوبل مسائل پر پاکستان اور میکسیکو میں عموماً رائے کا اتفاق ہوتا ہے۔"مگر" انہوں نے فرمایا۔"میکسیکو میں پاکستان کا سفارتخانہ موجود نہیں۔واشنگٹن میں متعین

پاکستانی سفیر (عزیز احمد) سال میں ایک آدھ بار ادھر پھیرا لگا جاتے ہیں جو نا کافی ہے۔ بھارت کے ساتھ ہمارے اچھے مراسم ہیں اور اس کا سفارت خانہ یہاں بڑا فعال ہے۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ تجارتی روابط قائم کر سکتے ہیں اور ایسی صورت میں دونوں ملکوں کو فائدہ ہوگا۔'' میں نے وعدہ کیا کہ ان کا نقطۂ نظر صدر پاکستان تک پہنچا دوں گا۔

الکی ہوڈی میہکو ادارے نے ستمبر ۱۹۶۲ء میں کورس کے اختتام پر ایک کرایہ کے ہوائی جہاز پر سب پروفیسروں کو وسطی اور لاطینی امریکہ کے بعض ملکوں کی سیر کرانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا لیکن مجھے سر ظفر اللہ خان کی سیکرٹری نے فون پر بتایا کہ میں اس مرتبہ بھی اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کا رکن ہوں، اس لیے فارغ ہوتے ہی نیویارک پہنچ جاؤں۔

جس روز میں نے میکسیکو سے نیویارک روانہ ہونا تھا، کورس کے سب طلباء اور طالبات مصر تھے کہ وہ چھٹی کریں گے اور ایئرپورٹ پر مجھے چھوڑنے جائیں گے۔ میرے اصرار کے باوجود کہ انہیں ایسا نہ کرنا چاہیے، انہوں نے ویسے ہی کیا۔ جہاز کی روانگی کے وقت سب نے مل کر کورس گایا اور مجھے الوداع کہا۔ ہسپانوی زبان میں یہ گانا کچھ ایسا ہی تھا جیسے انگریزی میں کسی کو رخصت کرتے وقت ''ہی از اے جالی گڈ فیلو'' کورس میں گاتے ہیں۔ یہ نہایت ہی جذباتی منظر تھا۔ وہ گاتے چلے جا رہے تھے اور میں ان سب سے مصافحہ کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ بالآخر میں نے اپنا بیگ بغل میں دبایا اور وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر ہوائی جہاز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی تک ان کے الوداعی گانے کی گونج مجھے سنائی دے رہی تھی۔ جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میں خوب خوب رویا۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں اب اپنے آپ کو شدید طور پر تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یہاں مختصر مدت میں بہت سا پیار ملا اور مجھے یقین تھا کہ زندگی میں پھر کبھی میرا اس طرف آنا نہ ہوگا۔

نیویارک ایئرپورٹ پر سر ظفر اللہ خان کا ڈرائیور ٹامنر میرا منتظر کھڑا تھا۔ اس مرتبہ پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو وفد کے سربراہ تھے۔ وفد کے ممبران میں سے اے ٹی ایم مصطفیٰ کو تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اس بار غلام مصطفیٰ جتوئی سے ملاقات ہوئی جس نے بعد میں دوستی کی صورت اختیار کر لی۔

اس بار یو این میں پاکستان سے متعلق اہم مسئلہ تو امریکی جاسوس طیارے کا صوبہ سرحد کے بڈابیر ایئر بیس سے اڑنا، سوویٹ روس کی حدود کے اندر جا کر پرواز کرنا، روس کا اس کو مار گرانا اور ساتھ پاکستان کے خلاف شدید احتجاج کرنا تھا۔ سپیشل پولیٹیکل کمیٹی میں روسی سفیر اور میرے درمیان اس مسئلہ پر بحث نے ایک مکالمہ کی صورت اختیار کر لی۔ ہم آپس میں خوب الجھے۔ ہم دونوں کے جواب در جواب سے تنگ آ کر چیئرمین نے ہمیں خاموش کرا دیا۔ روسی الزام کے جواب میں میں نے یہی موقف اختیار کیا

کہ ہم نے امریکہ کو دوست کی حیثیت سے بیس استعمال کرنے کی رعایت دے رکھی ہے۔ ہمارے علم میں نہ تھا کہ وہ اسے کس مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم نے اب امریکہ کو تنبیہ کر دی ہے کہ بیس کو کسی ناجائز مقصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے ورنہ ہم یہ رعایت واپس لے لیں گے۔ کمیٹی میں یہ بحث رات کے دس بجے ہوئی تھی۔ چونکہ سر ظفر اللہ خان بمطابق معمول رات نو بجے سو جایا کرتے تھے اس لیے میں نے انہیں صبح فون کر کے صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ بولے ''میں نے گزشتہ شب ساری کارروائی ریڈیو پر سن لی تھی، تم نے درست موقف اختیار کیا۔ امریکنوں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ اپنی جان چھڑانے کے لیے بے شک ہمیں برا بھلا کہہ دو۔''

یو این کا یہ سیشن اس لیے بھی اہم تھا کہ سوویٹ روس نے کیوبا کو میزائل فراہم کرنے کے منصوبے کا اعلان کر رکھا تھا جس پر صدر کینڈی نے اسے امریکہ کے مفادات کے خلاف سمجھ کر کیوبا کا بحری محاصرہ کر دیا۔ خدشہ تھا کہ تیسری جنگ چھڑ جائے گی، اس لیے سکیورٹی کونسل خاصی فعال ہو گئی اور دونوں طرف سے گرما گرم تقریریں ہونے لگیں۔ ہفتہ بھر کے لیے یو این میں بڑی ''ٹینشن'' رہی لیکن پھر سوویٹ روس پیچھے ہٹ گیا۔

تیسرا مسئلہ بھارت اور چین کی جنگ تھی جس میں چین نے اپنے علاقے بھارت کے تسلط سے آزاد کرا لیے۔ (عجیب بات ہے سیشن کے خاتمہ پر جب میں واپس پاکستان آنے لگا تو سر ظفر اللہ خان نے جنرل ایوب خان کے نام ایک خط تحریر کر کے مجھے دیا کہ انہیں بذات خود دے دوں۔ خط میں انہوں نے جنرل ایوب خان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ کشمیر پر حملہ کر کے اسے بھارت کے چنگل سے آزاد کرا لیا جائے اور ایسا موقع پھر کبھی پاکستان کو نہ ملے گا۔ یہ خط میں نے جنرل ایوب خان کو پیش کر دیا تھا لیکن وہ صدر کینڈی بلکہ جیکی کینڈی سے اس قدر مرعوب تھے کہ ان کے حکم پر ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا۔ صدر کینڈی نے جنرل ایوب خان کو طفل تسلی دے رکھی تھی کہ چین کے مقابلے کے لیے بھارت کو جو ہتھیار دیئے جائیں گے، ان کی تفصیل پاکستان کو فراہم کر دی جائے گی لیکن یہاں بھی امریکہ نے پاکستان سے دغا کیا جس پر جنرل ایوب خان صدر کینڈی سے مایوس ہو گئے مگر بے بسی کے عالم میں کچھ کر نہ سکے۔)

چوتھا مسئلہ پاکستان کا خصوصی طور پر امریکہ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کرنا تھا کہ یو این میں چین کی صحیح نمائندگی اس کی کمیونسٹ حکومت ہی کر سکتی ہے نہ کہ تائیوان۔ اس زمانہ میں امریکہ کی طرح سوویٹ روس کے تعلقات بھی ریڈ چائنا یا مین لینڈ چائنا سے خراب تھے۔ صدر کینڈی سینیٹر کی حیثیت سے تو پاکستانی موقف کی حمایت میں تقاریر کرتے رہے تھے لیکن صدر منتخب ہونے کے بعد ان کے خیال میں ابھی امریکہ کے روشن خیال طبقہ کو اس موقف کا قائل کرانے کی ضرورت تھی۔ اسی بنا پر سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے یو این کے

پاکستان اور یوگوسلاویہ کے مشنوں سے درخواست کی کہ اپنے اپنے وفود میں سے ایک ایک رکن امریکہ کی ریاستوں کے سفر کے لیے مختص کریں تاکہ وہ یہاں کے روشن خیال طبقہ کو اس نقطہ نگاہ کا قائل کرا سکیں۔

سر ظفر اللہ خان نے اس مقصد کے لیے پاکستان کی طرف سے میرا نام تجویز کیا کیونکہ میں چین کی صحیح نمائندگی کے موضوع پر یو این میں تقاریر کر چکا تھا۔ یوگوسلاویہ کے مشن نے (یوگوسلاویہ یو این میں پاکستان کے موقف کی تائید کرتا تھا) مارشل ٹیٹو کے ایک مشیر کا نام بھیجا۔ بالآخر ہم دونوں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے خرچ پر بڑے شاہانہ طریقہ سے ریاست ہائے امریکہ کے دورے پر نکلے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کا دورہ تھا جو سیشن کے اختتام پر کیا گیا۔ مارشل ٹیٹو کے مشیر تو ستر اسی برس کی عمر کے تھے اسی لیے سان فرانسسکو تک پہنچ کر بیمار ہو گئے اور واپس نیویارک چلے گئے لیکن میں واشنگٹن، شکاگو، سان فرانسسکو، لاس اینجلز، بوسٹن، نیو آرلینیز، میامی اور خدا جانے کون کون سے شہروں کا چکر لگا کر واپس نیویارک پہنچا۔ میں نے بار ایسوسی ایشنوں کو خطاب کیا یا ڈیموکریٹک پارٹی کی ذیلی انجمنوں کے اس مسئلہ پر بحث مباحثوں میں حصہ لیا۔ خاصا مصروف وقت گزرا۔

اس طویل سفر کے دوران بعض اوقات عجیب و غریب صورت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں بوسٹن میں اپنے ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ بار پر کھڑی ایک خاتون شراب پینے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر خبریں بھی سن رہی تھیں۔ سکرین پر جونہی صدر کینڈی کی تصویر نظر آئی وہ آپے سے باہر ہو گئیں اور شراب کا گلاس دھیں سے سکرین پر دے مارا، سکرین ریزہ ریزہ ہو گئی۔ بارمین نے تعجب سے ان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ فرمایا "پٹ اٹ ان دا بل۔" مجھ سے نہ رہا گیا۔ پوچھ بیٹھا کہ اس قدر ناراضگی کا مظاہرہ کیوں؟ بولیں "یہ حرامی کمیونسٹ ہے۔ اس کے ہاتھ میں امریکہ کے مفادات محفوظ نہیں۔" یہ سن کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح ہر سیاسی مخالف کو ملک کے لیے "سکیورٹی رسک" سمجھا جاتا ہے۔

نیو آرلینیز کے ایک بازار میں فرنچ اسٹائل نائٹ کلبیں تھیں جن میں نہایت خوبصورت لڑکیاں نیم برہنہ بھڑ کیلے کپڑے پہنے مجھے رقص کرتی نظر آئیں۔ میں نے کبھی اتنی زیادہ تعداد میں اسقدر خوبصورت لڑکیاں اکٹھی نہ دیکھی تھیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب ہیجڑے تھے۔ اسی طرح شاید لاس ویگاس میں ایک شب میں اپنے ہوٹل کی لفٹ سے نیچے اتر رہا تھا۔ کسی فلور سے ایک خاتون لفٹ میں داخل ہوئیں جنھوں نے نہایت بیش قیمت فرکوٹ (پوستین) زیب تن کر کھا تھا۔ فرکوٹ شاید اتفاقاً یا دیدہ دانستہ طور پر سامنے سے سرک گیا۔ وہ مادر زاد برہنہ تھیں، صرف جوتے پہن رکھے تھے۔ میرے دل سے فوراً نکلا "اصل جمہوریت تو صرف امریکہ ہی میں ہے۔"

پانچواں مسئلہ جس کا یو این سے براہ راست تعلق تھا، وہ بین الاقوامی عدالت میں سر ظفر اللہ

خان کا جج کے طور پر دوسری مرتبہ منتخب ہونا تھا۔ ان کے لیے ہم سب نے کنویسنگ کی اور علاوہ اس کے وزارت خارجہ کی کوششیں بھی بار آور ثابت ہوئیں۔ سر ظفر اللہ خان کامیاب ہوئے اور اگلے سال نیویارک سے ہیگ منتقل ہو گئے۔

جہاں تک نیویارک میں سوشل لائف کا تعلق ہے، بھٹو نے سربراہ کی حیثیت سے مشن میں ایک بہت بڑی پارٹی دی اور پرنس علی خان کی تقلید میں انواع واقسام کے کھانوں میں بادام میں پکی مچھلی سمیت پنک شیمپین کے دریا بہا دیے۔ افسوس ہے کوئی اہم شخصیت پارٹی میں نہ آئی۔ صرف دوسرے درجے کے ڈپلومیٹ آئے اور ایک ہی پارٹی میں سارے سیشن کا تواضع کے لیے مخصوص انٹرٹینمنٹ الاؤنس ختم ہو گیا۔ ہمارے مشن میں پرنس علی خان کی پارٹیاں نیویارک میں مشہور تھیں۔ ان میں شرکت کے لیے ہالی وڈ سے ایکٹرسیں اور فلمی ستارے مدعو ہوتے۔ سارا مشن رنگ برنگے پھولوں اور خوبصورت ماڈل لڑکیوں سے سجا دیا جاتا۔ ساتھ ہی مشرقی یورپین اسٹائل کی موسیقی کا اہتمام ہوتا۔ بعض غیر مدعو اہم شخصیات سمگل ہو کر پارٹیوں میں شریک ہوتیں مگر وہ سب اخراجات اپنی جیب سے برداشت کرتے تھے بلکہ حکومت پاکستان سے تنخواہ بھی نہ لیتے تھے۔ پارٹی رات گئے تک چلتی رہی اور بھٹو خوب بہکے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب میں رخصت ہونے لگا اور ان سے اجازت چاہی، بولے ''جا رہے ہو تو نصرت کو بھی ہوٹل میں چھوڑتے جاؤ۔ میں ذرا دیر سے آؤں گا۔'' میں نے بیگم بھٹو سے چلنے کا پوچھا۔ وہ کہنے لگیں کہ میں ''اس......'' کو یہاں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ اس پارٹی پر یا کسی اور موقع پر (مجھے یاد نہیں رہا) بھٹو نے ماڈی ڈیوس سے بدتمیزی کی جس پر انہوں نے مجھے آغا شاہی کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر یہ شخص کبھی بھی تمہارا وزیراعظم بنا تو یقین رکھو امریکہ سے پاکستان کے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ بھٹو امریکہ کے سخت مخالف تھے اور بعض اوقات اس کے لیڈروں کو فحش گالیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ شاید اسی بنا پر شعیب (جنرل ایوب خان کے وزیر خزانہ) کو امریکہ کا آدمی سمجھتے ہوئے انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ایک دوپہر لنچ بریک کے وقت میں ڈیلی گیٹس لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ راحت بخاری (پطرس بخاری کے عزیز اور یو این میں انڈر سیکرٹری) ڈاکٹر عبدالوحید (آف فیروز سنز لاہور) کے ساتھ بار پر کھڑے نظر آئے، میں ان کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر عبدالوحید صاحب کی بیٹی ناصرہ وہاں تشریف لائیں۔ راحت بخاری نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ یہ میری ہونے والی بیوی سے پہلی ملاقات تھی۔ دراصل راحت بخاری نے انہیں لنچ پر مدعو کر رکھا تھا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے معذرت کر لی کیونکہ میں نے فرانسسکو اور اینا کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔ ڈاکٹر عبدالوحید صاحب نے فرمایا کہ وہ تو دو ایک روز میں واپس پاکستان جا رہے ہیں مگر ناصرہ نیویارک ہی میں ٹھہریں گی اور اگر ممکن ہو سکے تو ان کا خیال رکھوں۔ میں نے

ناصرہ کا فون نمبر لے لیا اور ان سے رابطہ کرنے کا وعدہ کیا۔

چند دنوں بعد میں نے ترکی اور ایران کے سفیروں کا ڈپلومیٹک لنچ کیا اور اس میں جوڈی بنگھم، باربرا کراؤس، اینا اور فرانسسکو کے علاوہ ناصرہ کو بھی مدعو کیا۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی۔ میں نے اپنی جمیکن سیکرٹری کو ان کا استقبال کرنے کے لیے متعین کیا۔ وہ ناصرہ، جو نیلی ساڑھی میں ملبوس تھیں، کو ساتھ لے کر ڈیلی گیٹس لنچ روم میں آئیں۔ میں نے ناصرہ کا تعارف اپنے سب مہمانوں سے کرایا اور وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میری سیکرٹری ناصرہ کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوئیں۔ کہنے لگیں کہ مجھے یقین ہے آپ کی شادی اسی لڑکی سے ہوگی۔

ایک ہفتہ بعد ناصرہ نے مجھے فون پر کہا کہ ان کے والد کے جاننے والے کسی پبلشر نے انہیں پارٹی پر مدعو کیا ہے اور میں ان کے ہمراہ چلوں۔ میں نے ہاں کہہ دی۔ پیم ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کیا اور وہاں سے ٹیکسی لے کر ہم وِلیج پبلشر کے اپارٹمنٹ میں پہنچے۔ پارٹی کے اختتام پر میں نے ناصرہ کو ایک پاکستانی ریستوران میں ڈنر کھلایا اور انہیں گاڑی پکڑنے کے لیے پیم اسٹیشن پر چھوڑ آیا۔ دس پندرہ دنوں بعد ناصرہ کی خالہ زاد بہن ثریا انور (جن کے ہاں وہ ٹھہری ہوئی تھیں) کی سالگرہ پارٹی پر مجھے مدعو کیا گیا اور میں اس میں پاناما کی ایک مندوب کارمن کے ساتھ شریک ہوا۔ کارمن کو پاکستانی کھانے بے حد پسند تھے اور وہ ہسپانوی رقص پاسا ڈوبلے بہت اچھا کرتی تھیں۔ میں نے اپنی شادی بیاہ کے بارے میں ابھی سوچا تو نہیں تھا مگر ملاقاتوں پر ایک دوسرے کو جاننے کے ایسے مواقع کم از کم میری نسل کے زمانہ میں پاکستان میں ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

عجیب اتفاق ہوا۔ مجھے جوڈی بنگھم کے ہاں کاک ٹیل پارٹی پر میدام کیراپے (آنٹی گل) ملیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آتا تھا کہ دنیا اس قدر چھوٹی ہوگئی ہے۔ میں انہیں کیمبرج میں طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ پیرس میں بھی مل چکا تھا جہاں انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ پیرس میں سستے ریستورانوں میں جو بیف سٹیک ملتا ہے وہ دراصل گھوڑے کے گوشت کا سٹیک ہوتا ہے اور اگر اونٹ کے گوشت کا سٹیک کھانا ہو تو نپولین کے مزار کے اردگرد جو مراکش یا الجیرین ریستوران ہیں، وہاں کھایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے میرے انواع واقسام کے کھانے کھانے کا ذوق پورا کرنے کی خاطر مجھے پیرس میں پہلی بار مینڈک کی ٹانگیں اور سیپیوں میں بند سنیل کھلائے تھے۔ دوسرے دن اقبال اخوند کے ڈنر میں میں نے میدام کیراپے کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ تیار ہوگئیں۔ مجھے بیرن فان براؤن نے اپنی کار میں اقبال اخوند کے گھر لے جانا تھا کیونکہ وہ نیویارک سے باہر رہتے تھے۔ مقررہ شام میں اور بیرن فان براؤن میدام کیراپے کے ہوٹل پہنچے اور انہیں ساتھ لے کر اقبال اخوند کے گھر ڈنر میں شریک ہوئے۔ ناصرہ، ثریا اور ڈاکٹر انور بھی

وہاں موجود تھے۔ میں نے ناصرہ کا تعارف میدام کیراپئے اور بیرن فان براؤن سے کرایا۔ رات گئے واپسی پر میدام کیراپئے کو ان کے ہوٹل میں چھوڑنے کے بعد جب بیرن فان براؤن مجھے چھوڑنے جا رہے تھے تو انہوں نے کہا۔ "یہودیوں کے جسم سے ایک ناپسندیدہ مہک آتی ہے۔ کیا آپ کو میدام کیراپئے کی معیت میں اس مہک کا احساس نہیں ہوا؟" "نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نازی نہیں ہوں۔"

اس مرتبہ سر ظفر اللہ خان کی شخصیت کے ایک نہایت ہی دلچسپ پہلو کا مجھ پر انکشاف ہوا۔ ان کی غالباً تیسری اور آخری بیوی انہیں ملنے کے لیے نیویارک آئی ہوئی تھیں۔ سر ظفر اللہ خان نے ان کے ساتھ معاہدے کے مطابق انہیں طلاق دے کر آزاد کر دیا۔ انہوں نے اپنی نجی زندگی کے اس پہلو کے متعلق نہایت افسردگی کے ساتھ خود ہی مجھے بتایا۔ "جب میں پاکستان کا وزیر خارجہ تھا تو بیروت (لبنان) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ہمارے سفارت خانے کا ایک کوریئر (چپڑاسی) فلسطینی تھا۔ اس نے ایک روز جرأت کر کے مجھے کہا کہ اسرائیل بننے سے پیشتر اس کا خاندان آسودہ حال تھا مگر اب اس کی بہن اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی ہیں مگر ان کے لیے ایسا ممکن نہیں۔ کیا آپ ان کے ساتھ شادی کر کے ان کی خواہش پوری کر سکتے ہیں؟" میں نے اس بارے میں سوچنے کی مہلت مانگی۔ سال بعد میں پھر بیروت گیا تو کوریئر نے پوچھا کہ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ بہرحال ایک دو سال پس و پیش کرنے کے بعد میں نے اس لڑکی سے شادی کر لی اور ہم میں یہ طے پایا کہ میں اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم نہ کروں گا بلکہ صرف آکسفورڈ میں اس کی خواہش کے مطابق اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کر دوں گا اور جب اس کی تعلیم مکمل ہو جائے گی تو اسے طلاق دے کر آزاد کر دوں گا تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے مستقبل کی زندگی کا فیصلہ کر لے۔ سو آج ہمارا معاہدہ ختم ہو گیا اور میں مطمئن ہوں کہ میں نے اسے بخوشی رخصت کر دیا ہے۔"

میں یو این سے فارغ ہو کر جرمنی پہنچا اور برلن میں آنٹی ڈورس سے ملا بلکہ ان کے ساتھ جا کر میکسیکو سے بچائے ہوئے ڈالروں سے موٹر کار، فریج، ایئر کنڈیشنر، گراموفون، باجا وغیرہ چیزیں خریدیں جو چند ماہ بعد صحیح سلامت لاہور پہنچ گئیں۔ میرے لاہور پہنچنے سے اگلے روز ہی شیخ خورشید احمد (جنرل ایوب خان کے وزیر قانون) مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور فرمایا کہ نواب آف کالاباغ (گورنر مغربی پاکستان) مجھے صوبہ کا وزیر قانون بنانا چاہتے ہیں اس لیے میں ان کے ساتھ جا کر انہیں مل لوں۔ میں نے خورشید سے کہا کہ میں نواب صاحب کو نہیں جانتا۔ ممکن ہے جنرل ایوب خان نے انہیں میرا نام تجویز کیا ہو، اس لیے میں پہلے جنرل ایوب خان سے مل کر یہ فیصلہ کروں گا کہ وزیر بنوں یا نہ بنوں۔ خورشید رخصت ہو گئے اور پھر کبھی نہ آئے۔

میں نے میکسیکو کے متعلق اپنی رپورٹ لکھ کر مکمل کی اور اسے جنرل ایوب خان کو ارسال کر دیا۔ اس کی نقل میں نے بھٹو کو بحیثیت وزیر خارجہ بھیج دی۔ چند روز بعد میں جنرل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں سر ظفر اللہ خان کا خط پیش کیا۔ انہوں نے اسے کھول کر پڑھا اور مسکراتے ہوئے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر میکسیکو کے متعلق میری رپورٹ پر بات ہوئی اور وہاں پاکستانی سفارت خانہ کھولنے کے بارے میں فرمایا کہ بھٹو آپ کی رائے کی تائید کرتے ہیں مگر شعیب معترض ہیں کہ امریکہ کی منشا کے بغیر ہمارے لیے مناسب نہ ہوگا کہ وسطی امریکہ یا لاطینی امریکہ کے کسی ملک کے ساتھ سفارتی یا تجارتی تعلقات استوار کریں۔ معاملہ صاف ہے، ایوب حکومت میں شعیب امریکی مفادات کا خصوصی طور خیال رکھتے تھے۔ علاوہ اس کے جنرل ایوب خان خود بھی امریکہ نواز ہی نہیں بلکہ امریکہ کی جیب میں تھے۔

باتوں باتوں میں میں نے جنرل صاحب سے پوچھا: ''کیا آپ نے مغربی پاکستان کے وزیر قانون کے طور پر نواب کالاباغ کو میرا نام تجویز کیا ہے؟'' انہوں نے جواب دیا ''نہیں، میں صوبائی معاملات میں دخل نہیں دیتا۔'' میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح خورشید میرے پاس نواب صاحب کا پیغام لے کر آئے اور میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ سے مشورہ کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ جنرل صاحب لمحہ بھر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر فرمایا: ''میں حیران ہوں کہ نواب صاحب کو آپ کے نام کا خیال کیوں آیا؟ ہم تو ''راسکلز'' (بدمعاشوں) کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن آپ تو ماشاءاللہ ''اپ رائٹ مین'' (دیانتدار آدمی) ہیں۔ نواب کالاباغ نے آپ کے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟'' مجھے ان کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ میں نے دکھ بھرے طنز کے ساتھ کہا ''سر! کیا نوبت اب یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے ہمیں ''راسکلز'' (بدمعاشوں) کی تلاش ہے؟''

میں پھر وکالت اور لاء پڑھانے میں مشغول ہو گیا۔ غالباً انہی ایام میں انڈونیشیا کے صدر سکارنو نے پاکستان کا دورہ کیا اور لاہور تشریف لائے۔ انہیں مزار اقبال کی زیارت کرائی گئی۔ بعد ازاں گورنر ہاؤس میں چائے پارٹی پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ فرمایا کہ علامہ اقبال کی انگریزی تصنیف ''افکار اسلامی کی تشکیل نو'' کا ترجمہ انڈونیشی زبان میں کرا دیا گیا ہے۔ میں انہیں بڑے تپاک سے ملا مگر وضع قطع سے وہ مجھے دانشور نہ لگے۔ اس لیے میں ان کی شخصیت سے متاثر نہ ہوا۔

ایک دن مجھے چیف جسٹس کیانی نے اپنے چیمبر میں بلایا اور کہنے لگے کہ جنرل ایوب خان نے ان سے کہا ہے کہ مجھے ہائی کورٹ کا جج بنا دیا جائے۔ میں نے جواب دیا: ''سر! میں عمر کے اعتبار سے ابھی چالیس برس کا نہیں ہوا اور پریکٹس کرتے ہوئے بھی ابھی میری دس برس کی میعاد پوری نہیں ہوئی، اس لیے میں جج کیسے بن سکتا ہوں؟''

فرمایا ''آپ ان باتوں کی فکر مت کریں، یہ سوچنا ہمارا کام ہے۔ آپ صرف ہاں یا نہ میں جواب دیں۔'' میں نے کہا ''جناب میں جج بننا نہیں چاہتا بلکہ کسی دیانتدار لیڈر کی قیادت میں ملک کی بہتری کی خاطر سیاست میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔'' کیانی صاحب کو میری بات بڑی پسند آئی۔ فرمایا ''میرا بھی ریٹائرمنٹ کے بعد یہی ارادہ ہے۔'' میں نے عرض کی ''سر! مجھے آپ کے ساتھ ملک کی بہتری کے لیے کام کرنا منظور ہے۔'' کیانی صاحب نے ہنستے ہوئے مجھے رخصت کیا۔ افسوس ہے ریٹائرمنٹ کے تھوڑے عرصہ بعد وہ فوت ہو گئے۔

میرے پاؤں میں چکر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں مجھے بھٹو کا فون آیا کہ مولانا بھاشانی کی قیادت میں جو وفد چین کی آزادی کی تقریبات میں شرکت کے لیے روانہ ہونا ہے اس میں میرا نام شامل ہے۔ مغربی پاکستان سے میرے علاوہ جنرل حبیب اللہ خان بھی جا رہے تھے، باقی سب ممبر مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔

ہم لوگ کراچی سے پان امریکن فلائیٹ میں ہانگ کانگ پہنچے اور چند روز وہاں قیام کیا۔ ہانگ کانگ بھی عجیب وغریب مقام ہے۔ میں دنیا بھر میں سفر کرتا رہا ہوں لیکن اگر کسی ایئرپورٹ پر میرا سامان چوری کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ یہی بندرگاہ تھی۔ میرا چمڑے کا دستی بیگ استرے سے چیر دیا گیا لیکن اس میں سے کوئی شے چرائی نہ گئی کیونکہ چرانے کے قابل نہ تھی۔ میرا مطلب ہے کہ بیگ میں میرے شیو کا سامان، بنیانیں، جرابیں اور شاید ایک سلیپنگ سوٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی طرح ایک بازار میں ہم لوگ شاپنگ کے لیے سیر کر رہے تھے کہ ہجوم میں مجھے دھکا سا لگا اور میرے کوٹ کی اوپر کی جیب میں سے پارکر فونٹین پن غائب تھا۔ اسی بازار میں مجھے لاہور کے ایک معروف جوہری مل گئے جن کا ہانگ کانگ میں کاروبار تھا۔ وہ مجھے اپنی دکان پر لے گئے، خاطر تواضع کی اور ان کے اصرار پر میں نے ایک نہایت نفیس ہیرے کی انگوٹھی خریدی کیونکہ بقول ان کے ہانگ کانگ میں اعلیٰ قسم کے ہیرے سستی قیمت میں دستیاب تھے۔

اس شہر میں چوراچکوں کے علاوہ کوٹھی خانے بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ وزارت خارجہ کے بنگالی سیکرٹری نے جو سرکاری طور پر ہمارے ساتھ تھے، وفد کے ممبران کے لیے کئی قسم کے انتظامات کر رکھے تھے۔ انہوں نے ہمیں ننگے ناچ دکھانے والی نائٹ کلب کی سیر کرائی۔ بعدازاں وہ ہمیں ایک کوٹھی خانے میں لے گئے جہاں نہایت خوبصورت آئینوں سے سجے ڈرائنگ روم میں دس پندرہ چینی لڑکیاں بن سج کے بیٹھی تھیں۔ سیکرٹری سمیت ہم میں سے چند ممبران نے لڑکیاں پسند کیں اور ملحقہ کمروں میں غائب ہو گئے۔ وفد کے باقی ارکان جو میری اور جنرل حبیب اللہ خان کی طرح اس شغل میں دلچسپی نہ رکھتے تھے، ڈرائنگ روم

ہی میں بیٹھے ان کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ساتھی باہر نکلے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب کا ڈالروں سے بھرا بٹوا گم ہو گیا ہے۔ تلاش کی کوشش کی گئی مگر نہ مل سکا۔ (ہمارے فارن آفس کے ارکان کو باہر جانے والے وزیروں، ان کی بیویوں یا وفود کے ممبران کی خاطر کیا کیا انتظامات کرنے پڑتے ہیں، ان کا تفصیل سے ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ وزیروں یا ان کی بیگمات کے لیے تو سفیروں اور ان کی بیویوں کو شاپنگ کرانے کے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ باقی رہا وفود کے ممبران کے لیے تو ان کی حسب منشا ان کی خاطر تواضع کرنا بھی ان لوگوں کا فرض سمجھا جاتا ہے۔)

چوتھے روز صبح ہم سب ریل گاڑی میں سوار ہو کر گھنٹہ بھر سفر کرنے کے بعد سرخ چین کے بارڈر پر پہنچے۔ گاڑی سے اتر کر ہمیں ''نومینز لینڈ'' میں تقریباً ہزار گز کا فاصلہ اپنے سامان کے ساتھ پیدل طے کرنا پڑا۔ دوسری طرف سرخ چین کی ریل گاڑی ہماری منتظر کھڑی تھی۔ گاڑی میں سب آسائشیں مثلاً پھل، چائے، سونے یا آرام کرنے کے لیے صوفے وغیرہ موجود تھے۔ چھ سات گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم لوگ کانٹن پہنچے۔ یہاں ہمیں ایک عالیشان ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ اکتوبر میں یہاں کا موسم لاہور جیسا تھا۔ چند روز ہم کانٹن میں ٹھہرے اور ہمیں شہر اور اس کے مضافات کی سیر کرائی گئی۔ کانٹن ایک صاف ستھرا شہر تھا اور ان تمام آلائشوں سے پاک تھا جو ہمیں ہانگ کانگ میں نظر آئی تھیں۔ مردوں اور عوتوں نے ایک ہی قسم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ ہر کوئی کام کرتا دکھائی دیتا تھا۔ مضافات میں کوئی چڑیا، کوا یا پرندہ بلکہ چوہا تک نہ بچا تھا۔ چینیوں نے فصلوں کو نقصان پہنچانے والے سب پرندے اور جانور کھا لیے تھے۔ اس علاقے کی لیچی بہت بڑی اور لذیز تھی۔ دیگر پھل بھی نہایت اچھے تھے۔

میں نے کانٹن کی عدالتیں دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے ایک اسکول میں لے جایا گیا اور بتایا گیا کہ یہی کانٹن کی عدالت ہے چونکہ وہاں نہ تو کوئی سائل موجود تھا نہ عدالتی گہما گہمی۔ اس لیے میں پوچھ بیٹھا کہ ایسا کیوں ہے؟ جواب ملا کہ دیوانی مقدمات تو اب یہاں ہوتے نہیں کیونکہ اراضی ریاست کی ملکیت ہے۔ پھر بھی اگر کسی صوبے کا دوسرے صوبے سے کوئی تنازع اراضی سے متعلق ہو تو وہ پیکنگ (اب بیجنگ) میں عدالتِ عظمیٰ سنتی ہے۔ دیگر دیوانی معاملات کا تعلق خاندانی امور سے ہے جو مقامی عدالتیں سنتی ہیں البتہ فوجداری مقدمات کی سماعت صوبوں کی عدالتیں کرتی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ یہاں تو کوئی عدالتی کارروائی ہو ہی نہیں رہی۔ بتایا گیا کہ انقلاب کے بعد صوبائی حکومت نے ہزاروں کی تعداد میں مختلف جرائم میں ملوث ملزموں کو ایک بار اکٹھا کر کے اسی اسکول میں عدالت قائم کی تھی۔ ججوں نے چیئرمین ماؤ سے پوچھا کہ اگر عام ضابطے کے تحت کارروائی کی جائے تو بڑی مدت صرف ہو جائے گی، اس لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ انہیں جواب ملا کہ سمری شہادت سنو اور سب کو موت کی سزا دے دو۔ نتیجہ میں موت کی سزا

پانے والے مجرموں سے اپنی اپنی قبریں کھدوائی گئیں اور بعد میں ان کے سروں میں گولی مار کر ان میں ہر ایک کو اس کی اپنی قبر میں دفنا دیا گیا۔ اس کے بعد اس عمارت میں کبھی فوجداری عدالت لگانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، اس لیے اب اسے اسکول کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کانٹن سے ہمیں ایک دقیانوسی ڈکوٹا طیارے میں سوار کرایا گیا اور ہم شاید نو دس گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد پیکنگ پہنچے۔ ہمیں ایک بڑے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ پیکنگ میں مولانا بھاشانی ہمارے وفد میں شامل ہو گئے اور سربراہی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ہم سب نے پیکنگ کے اہم مقامات کی سیر کی۔ دیوارِ چین دیکھی، پرانے مقبرے دیکھے، شہر کے محلات دیکھے، ماؤ کے دور میں تعمیر کردہ عالیشان عمارات دیکھیں اور جشنِ آزادی کی تقاریب کے سلسلے میں کئی سرکاری دعوتوں میں شریک ہوئے۔

چواین لائی ہمارے سفارتخانے کے ڈنر پر تشریف لائے اور وفد کے ممبران سے گھل مل گئے۔ میں نے ان سے مانچوریا بلکہ سنکیانگ اور تبت کے بارے میں دریافت کیا اور ان علاقوں میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ ایسا انتظام کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آپ یہاں بیس پچیس دن مزید قیام کریں کیونکہ سفر کی مختلف منزلیں طے کرنے کی خاطر مختلف ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً ہوائی جہاز، ریل گاڑی، بس، جیپ اور بالآخر خچروں پر سوار ہو کر منزل تک پہنچنا پڑتا ہے۔ ہم چونکہ صرف دس پندرہ دنوں کے لیے چین گئے تھے اس لیے ایسا ممکن نہ تھا۔

یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ تھی کہ میں نے چواین لائی سے پوچھا: ”سر! سوویٹ روس سے اگر آپ کی صلح صفائی ہو جائے تو تیسری دنیا کے ممالک کے لیے مغرب کے استحصال کا مقابلہ کرنے کی خاطر بڑا سہارا بن سکتا ہے۔ آخر نظریاتی طور پر آپ سب ایک ہی لوگ ہیں۔“ (ان ایام میں چین اور سوویٹ روس آپس میں دشمنوں کی حد تک ایک دوسرے سے دور تھے بلکہ روس چین سرحد پر روسی اور چینی فوجیں ایک دوسری کے مقابل کھڑی تھیں)۔

چواین لائی نے مجھے طنز کرتے ہوئے کہا: ”اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ پاکستان اور بھارت کے لوگ ایک ہی ہیں اور ان میں صلح صفائی ہو جانی چاہیے تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟“ میں نے جواب دیا: ”جناب! میں تو بہت برا محسوس کرونگا۔“ فرمایا: ”روسی بڑے ناقابل اعتماد لوگ ہیں۔ نظریاتی اشتراک کے باوجود انہوں نے ہم سے بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ ہمارے ساتھ مختلف منصوبوں پر تعاون کے وعدوں کے باوجود ہمارے کاموں کو ادھورا چھوڑ گئے۔ ہمیں ان سے ایک نہیں ہزاروں شکایتیں ہیں۔ اگر کوئی ہمیں ان کے ساتھ صلح کرنے کو کہے تو ہمیں بھی بہت برا محسوس ہوتا ہے۔“

ہمیں پیکنگ سے شنگھائی اور شنگھائی سے ہانچو لے جایا گیا۔ بڑے چینی شہروں میں موٹر کاریں

شاذ و نادر ہی نظر آتی تھیں، زیادہ تر لوگ سائیکلیں یا پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے تھے۔ ہمیں سڑکوں پر چلتے پھرتے بھی بہت کم لوگ نظر آئے۔ وجہ یہ تھی کہ دن کی شفٹ پر فیکٹریوں میں کام کرنے والے صبح سویرے ہی چلے جاتے تھے اور رات کی شفٹ پر کام کرنے والے دن کو سو رہے ہوتے تھے۔ اس لیے شہروں کی سڑکیں دن رات سنسان ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم نے شنگھائی میں ایک پارک میں سیر کی۔ پارک کے صدر دروازے پر برطانوی استعمار کے زمانے کا ایک بورڈ اب تک نصب تھا جس پر تحریر تھا: ''اس پارک میں کتوں اور چینیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔'' شنگھائی بحرالکاہل کے کنارے ایک نہایت خوبصورت شہر تھا اور کسی زمانہ میں مشرق کا نیویارک سمجھا جاتا تھا۔

ہانچو سرینگر (کشمیر) کی طرح حسین جھیلوں میں گھرا چھوٹا سا خاموش قصبہ تھا۔ یہاں مجھے کشمیر کی یاد نے ستایا۔ دنیا بھر میں انسانوں کے کھانوں کا ذوق ہمیشہ میری دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ جب آسٹریلیا جانا ہوا تو مجھے کنگرو کے سوپ اور شترمرغ کے گوشت کھانے والوں کے ذوق نے متاثر کیا۔ (اب تو شترمرغ کے گوشت کی یورپ میں خاصی مانگ ہوگئی ہے)۔ اسی طرح میکسیکو کے باشندوں کے کھانوں کے ذائقے نے بھی مجھے پریشان کیا۔ اس سے پیشتر کیمبرج میں سستا گوشت ویل مچھلی کا سٹیک ہوا کرتا تھا جو خاصا بدمزہ ہوتا لیکن چین کے تجربے نے تو واقعی مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان زیادہ تر شافعی مسلک کے قائل ہیں، اس لیے پانی سے متعلق ہر شے کو حلال سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مینڈک، پانی کا سانپ، سمندری جونکیں سب حلال ہیں۔ ہانچو میں ہمارے سامنے ایک ڈھکی ہوئی ڈش میں زندہ جھینگے پیش کیے گئے۔ ہمارے ساتھی چینی مسلمانوں نے ڈش کا ڈھکنا اٹھا کر زندہ جھینگے سوٹیوں میں پکڑے، ان پر سویا ساس ڈالا اور منہ میں لے جا کر بڑے اطمینان سے چبانے لگے۔ میرے لیے زندہ جھینگا کھانا ذرا مشکل کام تھا کیونکہ اس کی لمبی لمبی ٹانگیں منہ میں ہلتے رہنے کا امکان تھا۔ مجھے چینی میزبان نے طعنہ دیا کہ آپ ہمارے اچھے فوجی کامریڈ ہیں زندہ جھینگا بھی نہیں کھا سکتے۔

ہمارے ہوٹل میں ہمیں چاولوں کے ساتھ کریم میں پکے مینڈک کھلائے گئے۔ چاولوں کے ساتھ سانپ کا گوشت بھی بڑی رغبت سے کھایا جاتا ہے اور اس کا ذائقہ تیتر کے گوشت کی طرح ہوتا ہے۔ (ہانگ کانگ کی دکانوں میں تو اپنی مرضی کا سانپ یا اژدہا یا روسٹ ہوا کھیتوں کا چوہا آپ خرید کر گھر کھانے کے لیے لے جا سکتے ہیں) ہمارے چینی دوستوں کے مطابق مینڈک چونکہ چاول کے کھیتوں میں پلتے ہیں اس لیے ان کی پرورش چاولوں پر ہی ہوتی ہے۔ چواین لائی کی مرغوب غذا جونکیں تھیں جو سرکاری دعوتوں میں وہ بذات خود مہمانوں کے چاولوں کے پیالوں میں ڈال کر بڑے خوش ہوتے تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے بعض ملکوں اور چین میں کتے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک مخصوص قسم کا کتا

ہوتا ہے، عام کتوں کی طرح نہیں ہوتا۔ خدا کا شکر ہے ہم مانچوریا نہیں گئے۔ وہاں کا مرغوب کھانا زندہ بندر کو بے ہوش کر کے اس کے کچے مغز یا بھیجے کو چاولوں پر ڈال کر کھانا ہے۔ ابلے ہوئے مرغی کے انڈوں کو چند برس زمین میں دفن کرنے کے بعد نکال کر بھی کھایا جاتا ہے جب ان کی زردی براؤن رنگ کی ہو جاتی ہے۔ انہیں کھا لیا جائے تو ہفتہ بھر انڈے کے ذائقہ کے ڈکاروں سے آپ لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ چین کے تقریباً ہر اہم کھانے کے پیچھے ہزاروں سال پرانی کوئی نہ کوئی حکایت ہوتی ہے۔ مثلاً ہانچو ہی میں ایک روز ہمارے روبرو ایک مرغ پروں پنجوں سمیت ڈش میں رکھا پیش کیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا مرا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہانچو کی مٹی کی اپنی مخصوص تاثیر ہے (شاید آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی مٹی تھی)۔ اس میں زندہ مرغ دفن کر کے اوپر آگ کی تپش دی جاتی ہے جس کی گرمی سے وہ زمین ہی میں دم پخت ہو کر پک جاتا ہے۔ بعد ازاں اسے جھاڑ پونچھ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے پروں کے نیچے سفید براق گوشت نہایت ہی نرم تھا۔ اس کے پیچھے کہانی یہ تھی کہ ہزار برس پیشتر کسی بھوکے بھکاری نے گاؤں سے اپنے کھانے کے لیے کسی کا مرغ چرایا اور اسے اپنے جبے میں چھپا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پیچھے پیچھے پکڑنے کے لیے مرغ کا مالک بھاگا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد بھکاری نے مالک سے چھپانے کی خاطر مرغ کو زندہ زمین میں دفن کر دیا اور چونکہ سردیوں کا موسم تھا، اس لیے اوپر آگ جلا کر سینکنے بیٹھ گیا۔ مالک مرغ نہ پا کر خالی ہاتھ واپس چلا گیا۔ بعد میں بھکاری نے جب مرغ کو مٹی سے نکالا تو وہ پک چکا تھا اور بھکاری اسے کھا گیا۔ اس کہانی میں بھی ایک طرح سے چینی کمیونزم سے متعلق سبق ہے۔

ہمیں چین میں بہت سی سوغاتوں اور تحفوں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ بعض اشیاء ہم نے خود خرید کیں۔ جنرل حبیب اللہ خان نے بونے درخت خریدے جو بڑے بیش قیمت تھے۔ یہ چین کا ایک خاص آرٹ ہے یعنی درختوں کے پودوں کو اوائل عمر ہی میں اس طرح کاٹا تراشا اور پالا پوسا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا درخت بھی چھوٹا ہو کر چند انچوں کے سائز کا رہ جائے۔ ایسے درخت کی اگر احتیاط نہ کی جائے تو مر جاتا ہے اور اگر اسے باہر زمین میں گاڑ دیا جائے تو رفتہ رفتہ پورے سائز کا درخت بن جاتا ہے۔ بہر حال بونے درخت چین میں بہت مہنگے داموں بکتے تھے اور ان میں دو سو برس پرانے بونے درخت تو ملک سے باہر لے جانے کی اجازت ہی نہ تھی۔ بالآخر ہم سرخ چین کی سیر کے اختتام پر اکتوبر کے آخر میں ہانگ کانگ کے راستے واپس پاکستان پہنچ گئے۔

لاہور واپس آ کر میں نے چین کے سفر سے متعلق اپنے تاثرات تقریباً بارہ تیرہ مضامین کی صورت میں قلمبند کئے جو سول اینڈ ملٹری گزٹ اخبار میں ۱۹۶۴ء کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے مگر افسوس ہے جس ڈبے میں وہ ریکارڈ موجود تھا، اس کے اکثر کاغذات چوہے کتر گئے۔ ان میں مولانا غلام

رسول مہر کے چند خطوط بھی تھے جن میں میرے پوچھنے پر انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہیں جاوید منزل سے اس لیے باہر نکال دیا تھا کہ اخبار ''انقلاب'' میں اپنی تحریروں میں قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کا ساتھ دینے کی بجائے مادی منفعت کی خاطر وہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا ساتھ دیتے تھے۔ اسی طرح اس ڈبے میں اینا فرنسسکو کا آخری خط بھی موجود تھا جس کے ساتھ انہوں نے یوجین اونیل ڈرامہ نگار کا آخری ڈرامہ ''مزید عالیشان محلات'' ارسال کیا تھا جو اس کی موت کے بعد شائع ہوا۔ نیز اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ انہیں کینسر ہو گیا ہے۔ چند ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ اینا نے نیویارک میں خودکشی کر لی۔

جو کچھ بچ گیا، ان میں میرے نام عطیہ فیضی (علامہ اقبال کے طالب علمی کے زمانہ میں انہیں لندن میں جاننے والی خاتون) کے دو خط ہیں جو انہوں نے پچاسی برس کی عمر میں مجھے کراچی سے تحریر کیے تھے۔ ان کے علاوہ چین کے سفر سے متعلق ایک چھوٹی سی ڈائری ہے جس میں ایک چینی بچی کی چند باتیں میں نے محفوظ کر لی تھیں۔ سات آٹھ سال کی یہ بچی دیوار چین دیکھنے کے موقع پر ہمارے ہمراہ گئی تھی۔ راستے میں میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے پوچھا: ''کیا آپ کے ہاتھوں میں ستارے ہیں؟'' میں نے اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ کہنے لگی: ''آپ کے ہاتھوں میں ستارے نہیں کیونکہ آپ مزدوری کے لیے اپنے ہاتھ استعمال نہیں کرتے۔'' پھر اس نے اپنے ہاتھ کھول کر مجھے دکھائے جن میں مشقت کے سبب گٹھے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ ستارے آپ کے ہاتھوں میں کیسے آ گئے؟'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اپنے اسکول میں پڑھائی کے بعد روز تین گھنٹے زمین کی گوڈی کرتی ہوں۔ اس میں بھل ڈالتی ہوں، سبزیاں اگاتی ہوں، انہیں پانی دیتی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں ستارے اسی مزدوری کا انعام ہیں۔'' پھر میں نے پوچھا۔ ''اگر بارش نہ ہو تو کیا آپ دعا مانگتی ہیں؟'' کہنے لگی۔ ''دعا مانگنا تو بھیک مانگنا ہے۔ ہم لوگ کسی سے کچھ نہیں مانگتے بلکہ اپنے بازوؤں کے زور سے خود زمین کھود کر پانی نکال لیتے ہیں۔''

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے، سلطانی بھی عیّاری

باب ۷

خانہ آبادی

جاوید منزل کی چھتیں بڑی بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ بھائی مختار کی مدد سے ٹھیکے دار کا انتظام کیا گیا اور مرمت و کمروں کے رنگ روغن کا کام شروع ہوا۔

جاوید منزل میں میں اب تنہا ہی رہتا تھا۔ علی بخش بیمار ہو کر اپنے عزیزوں کے پاس مستقل طور پر حکومت کی عطا کردہ اراضی پر چلا گیا اور اس کی وفات بھی وہیں ہوئی (ضلع فیصل آباد میں)۔ منیرہ اپنے نئے گھر میں گلبرگ منتقل ہو چکی تھیں۔ میں نے ہانگ کانگ سے خرید کردہ ہیرے کی انگوٹھی انہیں تحفتہً پیش کی کیونکہ آج تک میں نے اپنی کمائی سے انہیں کوئی تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ انگوٹھی لینے میں پس و پیش کرنے لگیں کہ یہ مجھے اپنی ہونے والی بیوی کو دینی چاہیے۔ میں نے کہا کہ وقت آنے پر اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ منیرہ کہنے لگیں ''اب وقت آنے میں کیا دیر ہے؟ شادی کا قریب قریب سارا انتظام تو آپ نے کر لیا ہے۔ موٹر کار، ایئر کنڈیشنر، فریج، باجا، کراکری، چاندی کے چائے سیٹ، سب سامان تو خرید لائے ہیں۔ حتیٰ کہ گھر کی مرمتوں کا کام بھی شروع کرا دیا ہے۔'' میں نے جواب دیا: ''یہ سب اس لیے تو نہیں کیا جا رہا کہ میں نے شادی بیاہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔''

''مگر آپ کو اب ایسا ارادہ کر لینا چاہیے۔'' منیرہ نے اصرار کیا اور ساتھ پوچھا کہ میں نیویارک میں ناصرہ کو دو تین بار مل چکا ہوں، اب وہ لاہور واپس آ چکی ہیں۔ اس لیے اگر میں انہیں اجازت دوں تو وہ ناصرہ کے والدین سے ان کا رشتہ مانگنے کی کوشش کریں۔ میں نے ہاں کہہ دی۔

بالآخر جون ۱۹۶۴ء میں ہمارا آپس میں نکاح ہوا اور اکتوبر میں ہماری شادی ہو گئی۔ شادی کے موقع پر بیگم جہان آرا شاہنواز مرحومہ نے یاد دلایا کہ ان کے شوہر اور میرے والد کے پرانے دوست میاں شاہنواز مرحوم نے اپنی زندگی میں تھل کے علاقہ میں واقع دس مربع اراضی مجھے ہدیہ کے طور پر عطا کی تھی اور چونکہ میں نے اسے لینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ اس کی دیکھ بھال نہ کر سکوں گا۔ بیگم صاحبہ نے وہ اراضی بیچ دی اور اس کی قیمت فروخت سے ایک غالیچہ خرید کر مجھے اپنی طرف سے دے دیا۔ عجیب بات تو یہ

ہے کہ جب ناصرہ امریکہ سے واپس آئیں تو باہر سے وہ بھی بعینہ وہی اشیا خرید کر ساتھ لائیں جو میں لایا تھا۔ نتیجتاً ہمارے گھر میں ہر اہم شے دوہری ہو گئی۔ دو کاریں' دو فریج' دو ایئر کنڈیشنر' دو باجے وغیرہ وغیرہ۔

غالباً جاوید منزل کی مرمتوں کے زمانہ میں ولانووا یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر حفیظ ملک پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں مجھ سے ملے۔ بعد میں ان کے ساتھ بھی ایسی دوستی استوار ہوئی جو اب تک قائم ہے۔ شادی کے فوراً بعد جس امر کی طرف میری تمام تر توجہ مبذول ہوگئی وہ صدارتی انتخاب میں مس فاطمہ جناح کا حصہ لینا تھا۔ جنرل ایوب خان سے ان کا مقابلہ تھا اور ووٹ بنیادی جمہوریتوں کے نمائندوں نے ڈالنے تھے۔ مادرِ ملت کونسل مسلم لیگ کی طرف سے اور جنرل ایوب خان کنونشن لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ جنرل ایوب خان غالباً واحد پاکستانی صدر ہو گزرے ہیں جو اسلام کے بارے میں علماء کے روایتی تصورات کی بجائے دانشوروں کے جدید لبرل نظریات کے حامی تھے بلکہ انہیں قانونی طور پر پاکستان میں نافذ بھی کرنا چاہتے تھے لیکن جمہوریت اور سیاستدانوں کے متعلق ان کے خیالات کے سبب میرا دل ان سے اٹھ گیا۔ میں نے صدارتی انتخاب میں مادرِ ملت کا ساتھ دیا' ان کے ہمراہ پنجاب کے اہم شہروں کا دورہ کیا' جلسوں سے خطاب کیا اور جھنگ میں ان کے پولنگ ایجنٹ کے طور پر خدمات انجام دیں۔ مجھ سمیت بعض نوجوانوں مثلاً میاں منظر بشیر مرحوم' میاں عارف افتخار مرحوم' یحیٰی بختیار وغیرہ کو مادرِ ملت خصوصی طور پر اہمیت دیتی تھیں' اور ہم ان کی ''شیڈو کیبنٹ'' کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ بعض اوقات تو چودھری محمد علی جیسے بزرگ لیڈر جب انہیں کوئی مشورہ دینا چاہتے تو ہمارے ذریعے ہی ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس الیکشن میں مادرِ ملت تو کامیاب نہ ہو سکیں' مگر انتخاب میں کامیابی کے باوجود جنرل ایوب خان کا زوال شروع ہو گیا۔

شاید مادرِ ملت سے دور رکھنے کی خاطر ۱۹۶۵ء میں مجھے دوسری بار ہائیکورٹ کی ججی قبول کرنے کے متعلق کہا گیا۔ اس زمانے میں انعام اللہ خان مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ انہوں نے میری بیوی ناصرہ کے خالو جسٹس بدیع الزماں کیکاؤس (جج سپریم کورٹ) کے ذریعے یہ پیغام پہنچایا۔ مگر میں نے پھر انکار کر دیا کیونکہ میں مادرِ ملت کی قیادت میں سیاست میں حصہ لے کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں بھارت کی فوجوں نے بغیر کسی اعلان کے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ یہ جنگ پاکستان اور آزاد کشمیر کی مشرقی سرحدوں تک محدود رہی اور اس نے طول نہ پکڑا۔ لیکن لاہور نے پہلی مرتبہ میدان جنگ کا ماحول دیکھا۔ گولے پھٹنے کی آوازوں سے پرندوں تک نے چہچہانا بند کر رکھا تھا اور سرِ شام سڑکیں سنسان نظر آنے لگتیں۔ رات کو ہوائی حملے کے خوف سے بلیک آؤٹ کر دیا جاتا۔ ناصرہ اور ان کی

والدہ لاہور چھوڑ کر سرگودھا کے راستے راولپنڈی اور پھر ایبٹ آباد چلی گئی تھیں۔ منیرہ اور ان کے خاندان کی خواتین بھی لاہور سے نکل گئی تھیں۔ میں دن کے وقت تو ہائیکورٹ میں وکالت کے فرائض نبھاتا یا بار روم میں بیٹھ کر وقت گزارتا اور رات سونے کے لیے میاں صلی کے ہاں چلا جاتا۔

جنرل ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں صدر کینیڈی کی بات مانتے ہوئے کشمیر پر حملہ نہ کر کے ایک اچھا موقع ہاتھ سے گنوا دیا تھا۔ تب امریکہ نے چین کا مقابلہ کرنے کی خاطر جو ہتھیار بھارت کو عطا کیے ان کی تفصیل بھی وعدہ کے باوجود پاکستان کو مہیا نہ کی گئی۔ اب جبکہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا تو بغداد پیکٹ یا سیٹو کے معاہدوں کے باوجود امریکہ پاکستان کی مدد کو نہ آیا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی ہو گئی اور اس سے ایک دن پیشتر ہمارا پہلا بیٹا منیب راولپنڈی میں پیدا ہوا۔ اس جنگ کے خاتمے کے لیے بھی معاہدہ تاشقند طے کرنے کی خاطر پاکستان کو بہ امر مجبوری سوویٹ روس کی ثالثی قبول کرنا پڑی۔ اسی مرحلے پر جنرل ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور جنرل ایوب خان نے بھٹو کو اپنی کابینہ سے نکال باہر کیا۔

میری بیوی ناصرہ کا تعلق ایک تاجر اور صنعت کار گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی جائیداد اور اپنی خاندانی کمپنیوں میں حصص کی مالک تھیں۔ انہوں نے جاوید منزل میں آتے ہی میرے والد کے زمانے کی گھر سے منسلک دو دکانوں (جن کا چھبیس روپے فی دکان ماہوار کرایہ ملتا تھا) سے پرانے کرایہ داروں کو نکالا اور ان کی تعمیر نو کر کے فی دکان دو سو روپے ماہوار کے حساب سے کرایہ پر دے دیں۔ بعد ازاں انہوں نے ان دکانوں کے پیچھے تین چار کوٹھریاں بھی ساتھ کی گلی میں کھول کر انہیں دکانوں میں منتقل کر دیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان سب دکانوں کے اوپر دو نہایت نفیس فلیٹ بنوا کر انہیں بھی کرایہ پر چڑھا دیا۔ اس کے نتیجے میں تین برس کی مدت میں جہاں اس حصۂ جائیداد کا کل باون روپے ماہوار کرایہ ملتا تھا اب چھ ہزار روپے کرایہ ملنے لگا۔ ہمارے دوسرے بچے ولید کی پیدائش یکم اگست ۱۹۶۷ء کو راولپنڈی میں ہوئی۔ اور ناصرہ نے مجھ سے اس حصۂ جائیداد کو دونوں بچوں کے نام ہبہ کرا دیا۔ اگرچہ اس کی آمدنی سے ہمارے گھر اور بچوں کے تمام اخراجات پورے ہوتے تھے۔ ناصرہ نے اپنے حصص میں سے کچھ دونوں بچوں کے نام منتقل کر دیئے۔ میرے والد کی تصانیف کی رائلٹی بھی مجھے اور منیرہ کو خاصی معقول ملتی تھی۔ اور میری پریکٹس کی آمدنی ملا کر اب ہماری زندگی خاصی آسودہ حال ہو گئی تھی۔ ہمارے دونوں بچے ایچی سن کالج جیسے ادارے میں پڑھنے لگے اور انہیں سکول لے جانے اور لانے کے لیے ایک نہیں بلکہ دو کاریں موجود تھیں۔ بچپن میں مجھے اور منیرہ کو ایسی سہولتیں میسر نہ تھیں جیسی منیب اور ولید کو مہیا کی گئی تھیں۔

منیب اور ولید دونوں مختلف طبیعتوں کے مالک ہیں۔ منیب جب پیدا ہوا تو اپنے سرخ و سفید رنگ

اور بھورے بالوں سے یوں لگتا تھا جیسے موم کا بنا ہو۔ جب سکول جانے لگا تو اس کا تخیل بھی عجیب وغریب قسم کا تھا۔ اسے باغ میں پھولوں اور پودوں کے پیچھے ہاتھی' بندر' بھالو اور شیر چھپے نظر آتے۔ منیب اور ولید کو ماں نے صوفی تبسم کی بچوں کے لیے تحریر کردہ نظمیں ازبر کرا رکھی تھیں جو دونوں بڑے شوق سے سنایا کرتے۔ مثلاً ''ایک تھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ'' یا ''ایک تھی چڑیا'' یا ''بلی بی بی! میں آفت کا مارا ہوں'' وغیرہ۔ ولید علامہ اقبال کے نہایت مشکل اشعار ایسی روانی کے ساتھ پڑھتا تھا کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ سونے سے پیشتر جو دعائیں ماں منیب کو سکھاتی انہیں یاد کر کے دہرانے پر اسے میری طرف سے ایک روپے کا نوٹ ملا کرتا۔ ولید ساتھ لیٹا صرف سن کر ہی دعائیں رٹ لیتا اور پھر انہیں دہراتے ہوئے مطالبہ کرتا ''ابو! اب مجھے بھی دو ایک روپئے کا نوٹ۔'' دونوں کو ماں ہی گاڑی میں سکول چھوڑنے یا لینے جاتی تھی۔ جب ذرا بڑے ہو گئے تو اصرار کرنے لگے کہ ماں نہ آیا کرے' دوسرے بچے مذاق اڑاتے ہیں۔ منیب نے انگریزی میں اشعار بھی لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ''سونٹ'' لکھتا تھا اور چھپا کر رکھتا۔ دونوں نے تقریری مقابلوں میں انعام بھی جیتے۔ ولید پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ منیب سُست اور لاپروا تھا۔ ولید پیسہ بچا کر رکھتا۔ منیب جو پیسہ ملتا خرچ کر دیا کرتا۔ ولید کھیلوں کا شوقین تھا۔ منیب بستر پر لیٹے مختلف قسم کی کتابیں پڑھنے کا عادی تھا بلکہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (بچوں کا ایڈیشن) سارا پڑھ ڈالا تھا۔ لاہور میں ایچی سن کالج اور امریکن سکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد منیب کو ہم نے امریکہ میں ویلانووا یونیورسٹی میں داخل کرا دیا' جہاں سے چار سال بعد وہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لے کر واپس لاہور آیا۔ پھر لاہور آ کر یونیورسٹی لاء کالج میں داخلہ لیا اور ایل ایل بی پاس کر کے وکالت کرنے لگا۔ اب ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتا ہے۔ اسے اس بات پر بڑا فخر ہے کہ اس کی شکل اپنے دادا کی طرح ہے۔ مگر چھ فٹ سے اوپر قد کے باعث شاید وہ میرے تایا شیخ عطا محمد پر گیا ہے۔

ولید چونکہ پڑھائی میں تیز تھا' اسے ایچی سن کالج میں اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد پین سلوینیا یونیورسٹی کے وارٹن سکول میں داخلہ ملا۔ وہاں سے تین سال میں بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجویشن کرنے کے بعد لاہور آ کر اس نے کچھ عرصہ ایک بزنس ایگزیکٹو کی حیثیت سے کسی فرم میں ملازمت کی۔ پھر اپنے ماموں خالد ولید کی فرم فیروز سنز لیبارٹریز کے لاہور کے دفتر کا چارج سنبھالا۔ اسی دوران اپنی اچھی شکل و صورت اور قد آور ہونے کے سبب ٹی وی اور سٹیج کے ڈراموں میں حصہ لینے لگا۔ مگر ابھی وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لاہور کے کسی پرائیویٹ لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی میں اچھی پوزیشن کے ساتھ حاصل کی۔ کچھ مدت اپنے باپ اور دادا کے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی داخل رہا۔ چند ماہ واشنگٹن کے ورلڈ بینک میں کام کیا۔ پھر دادا کی یونیورسٹی کیمبرج (انگلستان) اور باپ کے کالج پیمبروک

میں داخل ہو کر سال بھر میں ایم۔ فل کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں اپنے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے سبب اسے ہارورڈ لاء سکول (امریکہ) میں داخلہ مل گیا' جہاں سے اُس نے ایل ایل ایم (کم لاڈے یعنی اعزاز کے ساتھ) کی ڈگری وصول کی۔ نیویارک بار کا ممبر بنا۔ اور بالآخر وکالت کا پیشہ اپنایا۔ ولید اپنی ماں کی طرح محنتی اور بزنس مین ہے۔ مگر منیب کی عادتیں بہت حد تک مجھ سے ملتی ہیں۔ ولید اردو اشعار کا رسیا ہے۔ غالب اور اقبال کے کئی اشعار اسے زبانی یاد ہیں۔ حبیب جالب مرحوم سے بہت دوستی تھی۔ انہیں گھر بلا کران کا کلام سنتا۔ منیب کو ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔

اب میری زیادہ تر توجہ پریکٹس اور بار کی سیاست کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس دوران ذکی الدین پال مرحوم کے ساتھ (جو بعدازاں ہائیکورٹ لاہور کے جج کے طور پر ریٹائر ہوئے) دوستانہ تعلقات قائم ہوئے جو ان کی وفات تک قائم رہے۔ وہ بار کی سیاست کے ماہر تھے اور ان کی معیت میں میں بھی بار کی سیاسیات میں حصہ لینے لگا۔ ہم دونوں اکٹھے مغربی پاکستان کی بار کونسل کی ممبر شپ کے لیے کھڑے ہوئے اور پنجاب' سرحد' بلوچستان اور سندھ کے بڑے شہروں کی بار ایسوسی ایشنوں میں جا کر ووٹ مانگے۔ یہ ایک طوفانی دورہ تھا۔ اس انتخاب میں میں نے دیگر امیدواروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تعداد میں ووٹ حاصل کر کے ریکارڈ قائم کیا' بلکہ بروہی صاحب مرحوم کا قائم کردہ ریکارڈ بھی توڑ دیا۔

اسی کامیابی کے پس منظر میں میں نے اگلے سال لاہور کی بار ایسوسی ایشن کے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا (اس سے پیشتر میں بار کے نائب صدر کے طور پر منتخب ہو چکا تھا) مقابلے میں ڈاکٹر نسیم حسن شاہ تھے۔ سخت مقابلہ ہوا اور ڈاکٹر نسیم حسن شاہ چند ووٹوں سے ہار گئے۔ کامیابی کے بعد میں سیدھا ان کے گھر گیا۔ شاہ صاحب کے والد سید محسن شاہ ان دنوں علیل تھے اور بستر پر دراز تھے۔ میں نے ان سے عرض کی کہ میں بھی ان کے بیٹوں کی طرح ہوں۔ اگر میں کامیاب ہوا اور نسیم حسن شاہ ناکام رہے تو یقین جانئے کہ یہ مقابلہ آپ کے دو بیٹوں میں ہی تھا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے میری کامیابی پر مجھے مبارکباد دی۔ میری قائم کردہ یہ روایت کہ کامیاب ہونے والا بار کا صدر اپنے مدمقابل کے گھر جائے بعد میں بھی قائم رہی۔ چند دنوں بعد جنرل ایوب خان نے ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کو لاہور ہائیکورٹ کا جج بنا دیا (وہ چیف جسٹس پاکستان کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے)۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جنرل ایوب خان کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی جلوس نکلنے اور مظاہرے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اور ان کے اقتدار کا ستارہ روز بروز مائل بہ غروب تھا۔ اسمبلی میں نورالامین اور مولوی فرید احمد نے ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ ادھر بھٹو ان کی کابینہ سے نکلنے کے بعد سیاسی طور پر زیادہ فعال ہو گئے تھے۔ ان ایام میں بھٹو جب بھی لاہور آتے فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرتے اور رات کا کھانا کھانے

میرے گھر آیا کرتے۔ ایسے موقعوں پر مصطفیٰ کھر ان کے ڈرائیور ہوا کرتے تھے۔ بھٹو نے مصطفیٰ کھر کو سگار پینے کی عادت نئی نئی ڈالی تھی' اس لیے ان کا سگار بار بار بجھ جایا کرتا۔ نواب کالا باغ ابھی گورنر تھے اور بھٹو ان سے بہت چلتے تھے۔ اس لیے لاہور میں تقاریر کرنے سے گریز کرتے۔ لیکن کچھ عرصے بعد ان کی جھجک دور ہو گئی۔ انہوں نے گول باغ میں تقریر کر ڈالی۔ ان پر پتھراؤ ہوا اور اس سے ان کا سر پھٹ گیا۔ اس رات بھٹو نے میرے ہاں آنا تھا۔ فون پر بتایا کہ نہ آسکوں گا۔ حادثہ ہو گیا ہے۔ ٹانکے لگے ہیں' پٹی کروائی ہے وغیرہ۔

ان ایام میں میں کراچی بھی گیا اور مس فاطمہ جناح سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگیں: ''بھٹو سے کہو کہ مسلم لیگ کو نیا ایجنڈا دے کر فعال بنائیں۔ مگر بھٹو اپنی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی بنانے کی فکر میں تھے۔ میں نے انہیں مس فاطمہ جناح کا پیغام دیا۔ بھٹو کہنے لگے کہ ممتاز دولتانہ ہمارے پاؤں کے نیچے گھاس نہ اگنے دیں گے۔ علاوہ اس کے میں نے کنونشن لیگ میں رہ کر کونسل لیگ کی مخالفت کی ہے۔ اب کس منہ سے کونسل لیگ میں شریک ہوں۔ بھٹو نے مجھے بتایا کہ ان کی پیپلز پارٹی کا نعرہ ''اسلامی سوشلزم'' ہوگا یعنی روٹی' کپڑا اور مکان۔ اور مجھے ان کی پارٹی میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کرنی چاہیے۔ میں نے جواب دیا کہ بنیادی طور پر یہی ایجنڈا تو مسلم لیگ کا تھا اور اس کے لیے اصطلاح ''اسلام'' ہی کافی ہے ''اسلامی سوشلزم'' چہ معنی دارد؟ بھٹو نے طنزاً کہا ''تم تو پروفیسروں جیسی باتیں کرتے ہو۔ بھائی' میں نے ''اسلامی سوشلزم'' کا نعرہ اس خیال سے نہیں بنایا کہ اس اصطلاح کے کوئی خاص معانی ہیں۔ سیاست میں اصطلاحیں کوئی معانی نہیں رکھتیں' اصل مقصد اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں نے یہ نعرہ اسی لیے اپنایا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جب تک سوشلزم کا نام نہ لو تو کوئی آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں اسلام کا نام لیے بغیر کام نہیں بنتا۔ میرا تعلق نہ تو سوشلزم سے ہے نہ اسلام سے۔ اصل مقصد حصولِ اقتدار ہے اور بس۔''

اس دور میں میں نے بھی بار کے ممبران کے ساتھ مال روڈ پر ایک جلوس کی قیادت کی۔ مگر جب ہمیں ریگل چوک میں آگے بڑھنے سے روک دیا گیا تو میں نے وکلاء حضرات کو واپس چلنے کے لیے کہا کیونکہ ہمارا احتجاج کرنا قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی واجب تھا۔ مگر میاں محمود علی قصوری مرحوم اور ان کے ساتھی وکلاء نے میری بات نہ مانی اور جب تک وکلاء پر پولیس نے لاٹھی چارج کر کے ان کی تذلیل نہ کی وہ سب احتجاجاً آگے بڑھتے چلے گئے۔

مرکزی حکومت نے بالآخر بھٹو کو گرفتار کر لیا اور جیل ہی میں ان کا ٹرائل ہونے لگا۔ حکومت کی طرف سے شریف الدین پیرزادہ بطور اٹارنی جنرل پیش ہوتے تھے اور بھٹو کی طرف سے میاں محمود علی قصوری' ذکی الدین پال اور میں۔ اس زمانے میں ایئر مارشل اصغر خان بھی ریٹائرمنٹ کے بعد سیاسی

میدان میں کود پڑے۔ انہوں نے تحریکِ استقلال کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی بنا ڈالی۔ میں نے بار روم میں ان کی تقریر کا اہتمام کیا۔ بعدازاں آغا شورش کاشمیری' مجید نظامی اور میں نے موچی دروازے کے باغ میں ان کے عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا جس میں ایئر مارشل اصغر خان' آغا شورش کاشمیری کے علاوہ میں نے بھی تقریر کی۔ یہ موچی دروازہ میں تقریر کرنے کا میرا پہلا موقع تھا۔

جنرل ایوب خان نے جب دیکھا کہ حالات ان کے قابو سے باہر ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار اسمبلی کے سپیکر عبدالصبور خان کو سونپنے کی بجائے جنرل یحییٰ خان کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے (بذریعہ خط) دے دیا کہ ان نازک حالات میں آپ اور فوج ہی پاکستان کی باگ ڈور سنبھال سکتے ہیں۔ اقتدار کی گدی پر جنرل یحییٰ خان کو بٹھانے کے بعد وہ خود اپنی ذاتی رہائش گاہ میں منتقل ہو گئے اور کچھ مدت بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کو رہا کر دیا اور وہ ۱۹۶۹ء میں بڑے طمطراق سے میدان سیاست میں آ گئے۔ نواب کالاباغ کو رخصت کر دیا گیا اور وہ چند برس بعد اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ جنرل یحییٰ خان نے پہلے تو ۱۹۶۲ء کے آئین کو معطل کر کے ملک بھر میں مارشل لاء لگایا۔ پھر صوبہ مغربی پاکستان کو توڑ کر چاروں پرانے صوبے پنجاب' سرحد' بلوچستان اور سندھ بحال کر دیئے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے سیاسی لیڈر مجیب الرحمٰن کو جنہیں ان کے چھ نکات (پوائنٹس) کی بنا پر قید میں ڈالا گیا تھا اور جن کا ٹرائل جسٹس ایس اے رحمٰن بنگال میں ادھورا چھوڑ کر بھاگ آئے تھے' انہیں بھی مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں کے اصرار پر رہا کر دیا گیا۔ جنرل یحییٰ خان نے یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ملک بھر میں انتخابات کے انعقاد کے احکام جاری کر دیئے۔

یہ انتخابات بھی اپنی نوعیت کے تھے۔ مغربی پاکستان میں مضبوط پارٹی صرف بھٹو کی پیپلز پارٹی تھی جس نے روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کر کے ایک طرح کی آندھی چلا دی تھی۔ اس پارٹی کا مشرقی پاکستان میں کوئی زور نہ تھا۔ وہاں صرف مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کا زور تھا۔ مگر عوامی لیگ کو مغربی پاکستان میں بہت کم مقبولیت حاصل تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کامیاب ہو گئیں تو ملک دولخت ہو جائے گا اور وہی جمہوری اصول جو پاکستانی وفاق کو وجود میں لایا تھا' اب اسے دو حصوں میں بانٹ دے گا۔ بہر حال پاکستان کی موجد پارٹی مسلم لیگ کی مشرقی پاکستان میں تو برائے نام حیثیت تھی۔ مغربی پاکستان میں وہ کونسل لیگ' کنونشن لیگ اور پتا نہیں کیا کیا لیگوں میں بٹی ہوئی تھی۔ دیگر جماعتیں ایئر مارشل اصغر خان کی تحریکِ استقلال' جماعتِ اسلامی' نوابزادہ نصراللہ خان کی پارٹی' جمعیت العلمائے پاکستان اور جمعیت العلمائے اسلام وغیرہ تھیں۔

میں کونسل لیگ کے ٹکٹ پر لاہور کے ایک حلقے سے قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑا ہوا۔ اس پارٹی میں دیگر اہم شخصیات سردار شوکت حیات، یحییٰ بختیار اور میاں ممتاز دولتانہ تھے جو ہماری پارٹی کے قائد تھے۔ میرے مقابلے میں پیپلز پارٹی کی طرف سے پہلے تو میاں محمود علی قصوری نے کھڑے ہونے کا اعلان کیا لیکن بعد ازاں بھٹو مقابلے میں آ گئے۔ ہم دونوں کے علاوہ احمد سعید کرمانی کنونشن لیگ کے ٹکٹ پر، جنرل سرفراز، نوابزادہ نصر اللہ خان کی پارٹی کی طرف سے اور شاید ایک مسیحی امیدوار بھی اس حلقہ سے کھڑے تھے۔

الیکشن سے پیشتر میں نے علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دی اور عرض کی ''میں اس لیے کھڑا ہوا ہوں کہ اگر مرنے کے بعد آپ اور قائداعظم کے روبرو پیش ہونا پڑے تو کہہ سکوں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے نیک نیتی سے کر دیا۔'' پھر داتا کے دربار پہنچا اور پاکستان کے استحکام کے لیے دعا مانگی۔ الیکشن کے دوران میری تقاریر ہمیشہ حقیقت پسندانہ ہوتی تھیں۔ جلسوں کا اہتمام عموماً آغا شورس کاشمیری کیا کرتے تھے۔ میں کوئی بلند بانگ دعوے نہ کرتا تھا بلکہ عوام کو بتانے کی کوشش کرتا تھا کہ ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے فریب میں نہ آئیں۔ ملک کے جو وسائل ہیں ان کو مدِنظر رکھ کر ہی عوام کی زندگیوں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں اگر ضرورت ہے تو صرف قابلِ اعتماد قیادت کی، جس کے اقتدار کی عمارت جھوٹ کی بنیاد پر بلند ہونے کی بجائے سچ کی بنیاد پر قائم ہو۔ مگر پاکستان کے بھوکے، ننگے اور اَن پڑھ عوام طفل تسلیوں کے ذریعہ بڑی آسانی سے اپنے پیچھے لگائے جا سکتے تھے۔

جہاں تک جنرل یحییٰ خان کا تعلق تھا، میرے خیال میں ان کی یہی کوشش تھی کہ مسلم لیگ منقسم نہ رہے۔ وہ خان عبدالقیوم خان اور میاں ممتاز دولتانہ کی لیگوں کو متحد دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے بھی دو تین مرتبہ طلب کیا۔ وہ میاں ممتاز دولتانہ کو پسند نہ کرتے تھے مگر خان عبدالقیوم خان ان کے منظورِ نظر تھے۔ ایک مرحلے پر تو بڑی دردمندی سے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ مجھے متحد مسلم لیگ کا صدر دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کی کہ ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ کا صدر تو وہی ہو سکتا ہے جسے نیچے سے کارکنان منتخب کریں۔ اگر صدر اوپر سے مقرر کیا گیا تو اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ نیز میں نہ ایسا منصب قبول کرنے کو تیار ہوں نہ میرے وسائل ایسی اجازت دیتے ہیں۔

خیر مقابلہ خاصا سخت تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اس حلقے میں میرا اور بھٹو کا ون ٹو ون مقابلہ ہو اور دیگر امیدواروں کو بیٹھ جانے کی گزارش کی جائے۔ اس بارے میں میں، مجید نظامی اور آغا شورش کاشمیری، مولانا مودودی سے ملے۔ جماعت اسلامی نے میری حمایت کا اعلان کر رکھا تھا۔ مولانا مودودی نے نوابزادہ نصر اللہ خان کو بھی فون کیا کہ مقابلہ ون ٹو ون ہونا چاہیے لیکن انہوں نے فرمایا کہ وہ جنرل سرفراز کو

بیٹھنے کے لیے نہیں کہہ سکتے۔ سو جنرل سرفراز اور احمد سعید کرمانی میدان میں ڈٹے رہے۔

پیپلز پارٹی کے اربابِ بست و کشاد کا زیادہ زور میری مخالفت کرنا تھا کیونکہ باقی امیدواروں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں وہ فکرمند ہوں۔ لہٰذا میاں محمود علی قصوری اور حنیف رامے بھٹو کے حق میں اپنی تقریروں میں بار بار یہی دہراتے کہ میں سرمایہ داروں اور اسلام پسندوں کا ایجنٹ ہوں اور وہ مجھے امریکہ بھاگنے پر مجبور کر دیں گے۔ (لیکن جیسا کہ بعد میں ظاہر ہوا یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے صرف حنیف رامے کے نصیب میں لکھ رکھی تھی) دوسری طرف مولانا نعیمی مرحوم' جو جنرل سرفراز کے حق میں تقاریر کرتے تھے' نے فرمایا کہ میں حضرت نوح علیہ السلام کا نافرمان بیٹا ہوں کیونکہ میں نے جاوید منزل سے منسلک مسجد جامع اقبال کی تعمیرِ نو کرا کے اسے نیچے سے اوپر کی منزل پر منتقل کر دیا تھا اور نیچے دکانیں بنوا کر ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا تاکہ مسجد خود کفیل ہو جائے۔ مگر ان کے خیال میں میں مسجد کی دکانوں کا کرایہ خود کھا جاتا تھا۔ ان سے پیشتر مولانا روپڑی مرحوم نے مجھے مرتد قرار دے رکھا تھا کیونکہ میں نے شریعت کے بعض امور کی تعبیرِ نو کے لیے اجتہاد کی ضرورت کا ذکر کیا تھا۔ الغرض مجھے بھٹو کے سوشلسٹ کا مریڈوں اور جنرل سرفراز کے اسلام پسند غازیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ میرے حلقے میں جتنے بھی پولنگ اسٹیشن تھے وہاں انتظام بہت اچھا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لیے قیمے والے نان موجود تھے اور میاں محمد شریف نے ووٹروں کو لانے کے لیے بسوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ میرے ورکروں کو امید تھی کہ میں اس حلقے سے کامیاب ہو جاؤں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ بہت بڑی تعداد میں ووٹر میری ہی فراہم کردہ ٹرانسپورٹ پر آئے' میرے ہی کیمپ سے قیمے والے نان کھائے اور چٹیں وصول کیں' لیکن اندر جا کر ووٹ بھٹو کو ڈال گئے۔ لاہور میں میرے علاوہ پیپلز پارٹی کے ہر مخالف امیدوار کی ضمانت ضبط ہوئی۔

کونسل مسلم لیگ سے صرف میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات کامیاب ہو سکے۔ میں لاہور میں اور یحییٰ بختیار کوئٹہ میں ہار گئے۔ خان عبدالقیوم خان اور جمعیت العلمائے اسلام نے بالآخر پیپلز پارٹی سے اتحاد قائم کر لیا۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے میدان مارا اور مجیب الرحمٰن کی جماعت کے سامنے کسی بھی جماعت کے قدم نہ جم سکے۔

پاکستان کی تاریخ کا نازک ترین دور اب شروع ہونے کو تھا۔ مشرقی پاکستان سے مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان سے بھٹو پاکستان کی تقدیر کے مالک بنے۔ پرانے سیاستدانوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی نہ کسی طرح ملک کا اتحاد قائم رکھا جا سکے۔ مگر مجیب الرحمٰن اپنی طاقت کے نشے میں چور تھے اور بھٹو نے تو صاف کہہ دیا تھا جو بھی مغرب سے مشرق کی طرف جائے گا وہ اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔

اس مرحلے پر سپریم کورٹ کے جسٹس سجاد احمد جان مجھے ملنے کے لیے آئے۔ وہ علامہ اقبال کے

پرستاروں میں سے تھے۔ فرمایا ''میں آپ کو اس غلاظت میں الجھا دیکھ نہیں سکتا۔ خدا کے لیے اس سے باہر نکلنے کی کوشش کیجئے۔ لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس شیخ انوار الحق میرے عزیز ہیں۔ وہ نئے ججوں کے تقرر کے لیے نام صدر کو بھجوا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے بات کروں۔ وہ آپ کو بلوا بھیجیں گے۔'' ملکی حالات کے سبب میں خود بڑا پریشان تھا اور افسوس تو یہ ہے کہ کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔ میرا خواب کہ سیاست کے ذریعہ ملک کی خدمت کروں گا' پورا ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید میں اس کا اہل نہ تھا یا فطرتاً ایسی صلاحیت سے محروم تھا۔ اتنے سال میں نے اس خواہش کی پرورش کی۔ لیکن یہ ساری مشق بیکار ثابت ہوئی۔ سو میں نے بادل ناخواستہ جسٹس جان کو رضامندی ظاہر کر دی۔

چند دنوں بعد چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے مجھے اپنے چیمبر میں بلوایا اور میری رضامندی کے بعد میرا نام بھی نئے ججوں کی فہرست میں شامل کر کے اوپر بھجوا دیا۔

کچھ مدت بعد صوبہ سرحد کے مسلم لیگی لیڈر یوسف خٹک' مجید نظامی کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ میں جسٹس انوار الحق سے مل کر ججی کے لیے اپنا نام واپس لے لوں۔ میں نے عرض کی کہ آج کل خان عبدالقیوم خان لاہور میں موجود ہیں اور فلیٹیز ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ اسی طرح میاں ممتاز دولتانہ بھی لاہور میں موجود ہیں۔ آپ ان دونوں بزرگ لیڈروں سے گزارش کریں کہ وہ دونوں لیگوں کے اتحاد کا اعلان کر دیں۔ اس مقصد کے لیے یا تو مجید نظامی کے ہاں کھانے پر ہم سب اکٹھے ہو جائیں یا میرے گھر۔ اگر ایسا ممکن ہو سکتا ہے تو میں جسٹس انوار الحق کے پاس جا کر کہہ دوں گا کہ میرا نام نہ بھجوائیں۔ یوسف خٹک نے جواب دیا کہ ایسا عین ممکن ہے اور وہ آج شام ہی مجھے یہ خوشخبری سنانے کی خاطر دوبارہ آئیں گے۔ مگر وہ رخصت ہونے کے بعد پھر کبھی میری طرف نہ آئے۔

چند یوم بعد مجھے جنرل یحیٰی خان کے سیکرٹری کا فون آیا کہ انہوں نے یاد فرمایا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا: ''چیف جسٹس نے ججی کے لیے آپ کا نام بھیجا ہے۔ لیکن آپ نے اتنی جلد ہمت کیوں ہار دی؟ میں تو گزشتہ الیکشنوں کو کالعدم قرار دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور از سر نو الیکشن کرانے کا ارادہ ہے۔ جس کے رولز کے تحت اسی سیاسی جماعت کو کامیاب قرار دیا جائے گا جو اپنے ''ونگ'' کے علاوہ پاکستان کے دوسرے ''ونگ'' سے ایک تہائی ووٹ حاصل کرے۔'' میں نے عرض کی ''سر! میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھ میں ملکی سیاست میں حصہ لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ جج بنا دیا جاؤں تو بہتر۔ ورنہ میں اب صرف وکالت کے پیشے تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھوں گا۔'' اس کے بعد جنرل یحیٰی خان نے مزید مجھے کچھ نہ کہا۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں مجھے لاہور ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ اور میں نے گرمیوں کی تعطیلات ہی میں بطور جج کام کرنا شروع کر دیا۔ گویا جس منصب کو میں

اپنی گزشتہ زندگی میں دو مرتبہ ٹھکرا چکا تھا' اب اسی منصب کو مجھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے قبول کرنا پڑا۔

لیکن پاکستان اور خصوصی طور پر مشرقی پاکستان کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ مجیب الرحمٰن سے مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کی گفت و شنید ناکام ہونے کے بعد وہاں ملٹری ایکشن کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جنرل یحییٰ خان کی سوچ کہ گزشتہ الیکشن کو کالعدم قرار دے کر پاکستان میں دوبارہ الیکشن کرائے جائیں محض سوچ ہی کی حد تک رہی کیونکہ الیکشن ہو چکنے کے بعد ایسی سوچ کو عملی جامہ پہنانا ناممکن تھا۔ اس مسئلے کا سیاسی حل تو یہی تھا کہ مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کی بنا پر عوامی لیگ کو پاکستان کی حکومت سازی کی دعوت دی جائے اور مغربی پاکستان کی پیپلز پارٹی کے لیے یا تو ڈپٹی پرائم منسٹر کا عہدہ مختص کیا جاتا یا وہ اپوزیشن میں بیٹھتی۔ مگر شاید یہ صورت بھٹو کو منظور نہ تھی اور دوسری طرف غالباً مجیب الرحمٰن بھی مغربی پاکستان میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ یہاں آنے کو تیار تک نہ تھے۔ جغرافیائی طور پر غیر منسلک خطے عموماً علیحدہ قومی ریاستیں ہی بنتی ہیں۔ یہ پولیٹیکل جغرافیے کا ایک اہم سبق ہے۔ لیکن پاکستان بنتے وقت صوبہ مشرقی بنگال نے خود ہی دیگر صوبوں کی طرح پاکستان کے وفاق میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ یا تو اسی مرحلہ پر بنگالیوں کو چوائس دی جاتی کہ چاہیں تو علیحدہ قومی ریاست بنا لیں۔ مگر خدا جانے قائداعظم اور دیگر سینئر مسلم لیگی لیڈروں نے اس پہلو پر غور کیوں نہ کیا۔ ملٹری ایکشن کے دوران جو ستم مشرقی پاکستان کے مکینوں پر ڈھایا گیا اور جو ظلم مشرقی پاکستان کی مکتی باہنی نے مغربی پاکستان کے مکینوں پر ڈھایا' ان زخموں کو بھرنے میں خاصی مدت صرف ہو جائے گی۔ ان حالات میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے پاکستان کو توڑنے کے لیے اسے سنہری موقع سمجھتے ہوئے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل کر دیں جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کی افواج نے مشرق میں دباؤ کم کرنے کی خاطر بھارت پر حملہ کر دیا۔ ہندو پاکستان کی اس جنگ میں کوئی بھی دوست ملک چین یا امریکہ ہماری مدد کو نہ آیا۔

جس روز مغربی پاکستان کی طرف سے بھارت پر حملہ ہوا تو میں اور جسٹس ظلہ بہاولپور بینچ پر مامور تھے۔ ہم دونوں اسی شب بلیک آؤٹ کے دوران بہاولپور سے واپس لاہور پہنچے۔ بھارت کی طرف سے ہوائی حملے کا خطرہ ہر وقت رہتا تھا۔ ہمارے ہوائی جہاز بھی خاصے فعال تھے۔ بہرحال لاہور کے ہائیکورٹ میں کام بدستور جاری رہا۔ اور اس جنگ کے سبب کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔ ایک شام مجھے اب تک یاد ہے۔ میں اور ناصرہ اپنے بیڈروم میں بیٹھے تھے۔ چھ سالہ منیب اور چار سالہ ولید اپنے کمرے میں مولوی صاحب سے قرآن شریف کا درس لے رہے تھے۔ اتنے میں اچانک دو بھارتی ہوائی جہاز نہایت نیچی پرواز کرتے چنگھاڑتے ہوئے ہمارے گھر کے اوپر سے گزرے۔ شاید ان کا ارادہ ریلوے لوکوشاپ پر بم گرانے کا تھا جو ہمارے گھر سے ایک دو میل دور تھی۔ میں اور ناصرہ سراسیمگی کے عالم میں بچوں کے کمرے

کی طرف دوڑے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں بچے مولوی صاحب سمیت میز کے نیچے گھسے بڑے اطمینان سے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر نہ تو خوف کے کوئی آثار تھے نہ اس آفتِ ناگہانی کے شور نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی۔

جنگ ختم کرانے کے لیے یو این میں پاکستان کی طرف سے بھٹو کی سٹریٹیجی کامیاب نہ رہی۔ مشرقی پاکستان میں افواج پاکستان نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ بھارتی فوج نے ہزاروں کی تعداد میں ہمارے افسروں اور جوانوں کو جنگی قیدی بنالیا۔ اسی جنگ کے نتیجے میں بنگلہ دیش قائم ہوا۔ اور اندرا گاندھی نے بڑے فخر سے اعلان کیا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں پھینک دیا ہے۔ اس موقع پر مغربی پاکستان کے لوگوں کی عجیب کیفیت تھی۔ جنگ بند ہوچکی تھی لیکن اس کے باوجود لاہور میں بلیک آؤٹ جاری تھا اور ساری سڑکیں سنسان تھیں۔ سوگ کا یہ عالم تھا کہ کوئی شہری دوسرے سے بات نہ کرتا تھا۔

بہرحال مغربی پاکستان میں بھٹو نے اقتدار سنبھالا۔ جنرل یحییٰ خان کو حفاظتی تحویل میں لے کر ایبٹ آباد کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں بھجوادیا گیا۔ رہائی کے بعد جنرل یحییٰ خان زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اور پشاور میں گمنامی کے عالم میں وفات پائی۔ نئے پاکستان کے لیے کوئی آئین نہ تھا۔ اس لیے ابتدائی طور پر بھٹو کو خود ہی صدر اور مارشل لاء ایڈمنسٹر کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ پارلیمینٹ کے اجلاس ہونے لگے۔ بالآخر ۱۹۷۳ء کا آئین وجود میں آیا۔ اور اس کے تحت پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ ہائیکورٹوں اور سپریم کورٹ کے ججوں نے از سرِ نو حلف لیا۔

بھٹو حکومت کا سب سے پہلا کام تو جنگی قیدیوں کی رہائی کا انتظام کرنا تھا۔ اس ضمن میں اندرا گاندھی اور ان کے درمیان شملہ معاہدہ طے ہوا۔ جس کے تحت جنگی قیدی رہا ہوئے اور مسئلہ کشمیر کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ مگر اب یہ ساری باتیں بہت پرانی لگتی ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جس ''یونانی المیہ'' سے پاکستان گزرا اس ڈرامے کے تین اہم کردار مجیب الرحمٰن، اندرا گاندھی اور بھٹو اب اس دنیا سے اٹھالیے گئے ہیں۔ پہلے دونوں تو رائفل کی گولیوں کا نشانہ بنے اور تیسرے ہیرو کو پھانسی دے دی گئی۔

باب ۸

عدل گُستری

پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے دو چہرے ہیں' ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ظاہری چہرہ تو وکلاء اور سائلین کو نظر آتا ہے اور باطنی چہرہ وہی دیکھ سکتے ہیں جو ''بار'' کی دیوار پھلانگ کر ''بینچ'' پر آ بیٹھیں' یعنی خود جج بن جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے قیام ہی سے عدلیہ مشکل ادوار سے گزری ہے۔ ابتدا ہی سے اُسے اقتدار کے قابضین اور سیاستدانوں کے میلے کپڑے دھونے کے لیے بھیجے گئے اور اس نے عددی اکثریت کی بنا پر بعض ایسے فیصلے صادر کیے جو بانیانِ پاکستان کے قائم کردہ اصولوں کے خلاف تھے۔ اس کی تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں' کیونکہ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

مختصراً جب ملک کی باگ ڈور عسکریوں کے ہاتھ آتی ہے تو دستور بہر صورت ''کالعدم'' ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کیفیت کی وضاحت کے سلسلہ میں اصطلاح ''معطل'' استعمال کی جاتی ہے اور بعض اوقات ''معلق''۔ ایسی صورت میں دستور کی معطلی یا معلقی کے سبب عدلیہ کے وہ تمام اختیارات سلب ہو جاتے ہیں جن کے تحت دیئے گئے فیصلوں پر فوج اعتراض کر سکتی ہو۔ اس لیے عدلیہ کے لیے ایک طرح کی آسانی ہو جاتی ہے کہ ہم کیا کریں' سن سکنے کا ہمیں اختیار ہی نہیں' لیکن جب کسی نافذ کردہ دستور کے تحت جمہوری یا پاپولر حکومت قائم ہو تو حکمران انتظامیہ جن جن طریقوں سے عدلیہ پر دباؤ ڈالتی ہے' انہیں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ تو شاید چیف جسٹس صاحبان ہی جانتے ہوں گے یا انفرادی طور پر وہ جج جنہیں ایسی آزمائش سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ سو جب سے پاکستان بنا ہے' دساتیر کی بار بار معطلی یا انتظامیہ کی دخل اندازی کی وجہ سے عدلیہ بحیثیت مجموعی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی ہے۔ پاکستان میں جمہوری کلچر فروغ نہیں پا سکا کیونکہ ہم سب میں رواداری کی اخلاقی قدر سرے سے موجود ہی نہیں۔ عدلیہ کے دروازے وہی کھٹکھٹاتے ہیں جن کا تعلق حزبِ اختلاف سے ہوتا ہے اور جنہیں حزبِ اقتدار کی مار کھانی پڑتی ہے' لیکن جب یہی لوگ اقتدار میں آ جاتے ہیں تو اپنے حریفوں سے بدلہ لینے کی خاطر سب سے پہلے عدلیہ کا کانٹا اپنے راستہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ حریفوں کی رسائی عدلیہ تک نہ ہو سکے۔

۱۹۷۲ء میں مجھے بطور جج کنفرم ہونا تھا اور یہ کنفرمیشن بھٹو نے بطور صدر کرنا تھی۔ ان ایام میں آغا شورش کاشمیری انہیں ملنے گئے۔ فرمایا: "جاوید سے کہیں کہ بند کمرے میں بیٹھ کر لوگوں کے فیصلے کرنے کی بجائے میرے ساتھ اسمبلی میں بیٹھ کر قوم کی قسمت کے فیصلے کریں۔ اگر وہ مان جائیں تو کنفرمیشن کی بجائے ان کی خاطر بہتر انتظامات کیے جا سکتے ہیں۔" آغا شورش نے بھٹو کے مقابلے میں الیکشن میں میری ناکامی پر ایک نظم بھی لکھ کر "چٹان" میں شائع کی تھی جس میں انہوں نے پنجابیوں کی "فرزندِ اقبال" کو ہرانے پر لعن طعن کی تھی۔ علاوہ اس کے بھٹو کے خلاف تقریریں کرنے کے الزام میں وہ کچھ مدت کے لیے گرفتار بھی رہ چکے تھے، لیکن اب وہ میرے ہاں تشریف لائے اور بھٹو کا پیغام پہنچایا۔ میں نے جواب دیا کہ میں اسمبلی میں بیٹھنے کا خواہشمند نہیں۔ اگر بھٹو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ بطور جج اپنے فرائض انجام دیتا رہوں تو مجھے کنفرم کر دیں ورنہ میں پھر اپنی وکالت کی طرف رجوع کروں گا۔ آغا شورش نے ٹیلیفون پر بھٹو کو میرا جواب سنا دیا اور انہوں نے بغیر کچھ کہے مجھے بطور جج کنفرم کر دیا۔

جج بنتے وقت اپنے منشی شفیع صاحب اور وکالتی کیسوں کا پلندا میں نے چودھری فضل الٰہی ایڈووکیٹ (مرحوم) کے سپرد کر دیا تھا، مگر ابھی انہوں نے چند ہی کیس نبٹائے تھے کہ وزیراعظم بھٹو نے ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت انہیں پاکستان کا صدر بنا دیا، جس پر وہ فضل الٰہی چودھری کے نام سے فائز ہوئے۔

جج کے طور پر میرے تقرر کے وقت تو چیف جسٹس شیخ انوار الحق تھے، لیکن ان کے سپریم کورٹ چلے جانے کے بعد سردار محمد اقبال چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ہائی کورٹ میں ججوں کے دو گروپ موجود تھے۔ ایک گروپ جسٹس سردار اقبال کے عقیدت مندوں کا تھا اور دوسرے گروپ کے سربراہ جسٹس مولوی مشتاق حسین تھے۔ جسٹس سردار اقبال نہایت ملنسار، خلیق اور دوسروں کے کام آنے والی شخصیت تھے۔ جسٹس مولوی مشتاق حسین بظاہر سخت مزاج نظر آتے تھے، لیکن دوستوں کے ساتھ دوستی نبھانے اور دشمنوں کو کبھی معاف نہ کرنے اور ان کا پیچھا قبر تک کرنے والوں میں سے تھے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ ایک دوسرے کے مخالف یہ گروپ کیوں اور کیسے بن گئے، البتہ خداوند تعالیٰ کا شکر ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، دونوں جسٹس سردار اقبال اور جسٹس مولوی مشتاق مجھے محبت اور شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس اعتبار سے میں شاید واحد ایسا شخص تھا جو دونوں متحارب کیمپوں میں آسانی سے آ جا سکتا تھا۔

کنفرم ہونے کے بعد میں بمطابق معمول جج کا کام کرتا رہا۔ بھٹو کا زمانہ بھٹو شاہی کہلاتا ہے یا بھٹو گردی، مگر اعلیٰ عدلیہ کے لیے یہ زمانہ اچھا نہ تھا۔ اسی دور میں بھٹو اور عدلیہ کے درمیان اختلافات کی خلیج

گہری ہونا شروع ہوئی اور بالآخر بھٹو کے عبرت ناک انجام پر جا کر ختم ہوئی۔ بھٹو حکومت کا نزلہ سب سے پہلے اے این پی پر گرا۔ اس کے ایک لیڈر، جنرل جیلانی پنجاب میں بار بار گرفتار کر لیے جاتے تھے اور میرا اور جسٹس چودھری محمد صدیق (مرحوم) کا بینچ انہیں بار بار رہا کر دیتا، لیکن ہم پر انتظامیہ کا دباؤ اس لیے نہ پڑا کیونکہ ان ایام میں بھٹو حکومت ججوں کو مراعات دے کر اپنی طرف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چیف جسٹس سردار اقبال ججوں کو مختلف سہولتیں دلانے میں پیش پیش تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ججوں کی تنخواہ تو وہی رہی اور ٹیکس بھی صرف اسی پر ہی لگتا رہا، لیکن سہولتیں ٹیکس سے مبرا تھیں۔ ہر جج کو نئی موٹر کار ملی۔ ڈرائیور، مالی اور دو اضافی نائب کورٹ کی تنخواہیں، پٹرول، ٹیلیفون، بجلی، پانی اور گیس کے بل ہائی کورٹ کی طرف سے ادا کیے جانے لگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جج اپنی استعمال کردہ موٹر کار کم قیمت پر خرید کر گھر لے جا سکتا تھا۔ وغیرہ

یہی نہیں بلکہ سب ججوں کو خوش کرنے کی خاطر انہیں بذریعہ ہوائی جہاز یحیٰی بختیار کی تشکیل کردہ ایک جیورسٹ کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی لے جایا گیا۔ ہم سب میٹروپول ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ دن بھر تو کانفرنس کے اجلاس ہوتے تھے، لیکن رات کو ڈنر کے وقت سب کو ''کیبرے'' دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ بعض ''پارسا'' جج صاحبان اس عیاشی کی زندگی کو پسند نہ کرتے تھے۔ مثلاً جسٹس ذکی الدین پال (مرحوم) ڈنر کھاتے وقت پانی کا گلاس اپنے سامنے رکھنے سے گریز کرتے تاکہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ شراب کا گلاس ہے۔ (حالانکہ ان کے نام کے ساتھ ''پال'' ہونے کے سبب بعض اصحاب انہیں غلطی سے مسیحی سمجھتے تھے) ایک شب کھانے کے وقت میں، جسٹس مولوی مشتاق (مرحوم) اور جسٹس اے آر شیخ (مرحوم) اکٹھے ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ نیم برہنہ یورپی لڑکی رقص کرتے کرتے ہمارے قریب سے گزری۔ جسٹس اے آر شیخ نے فخریہ انداز میں بڑ مارتے ہوئے مجھ سے کہا کہ جاوید بھائی، یہ کیا برہنگی ہے۔ ہم نے تو کینیڈا میں مادر زاد برہنہ لڑکیوں کا رقص دیکھا ہے۔ مولوی مشتاق بولے: ''زہے نصیب! کینیڈا اور پاکستان میں کچھ فرق تو رہنے دیجئے۔'' بعض پارسا جج صاحبان جنہیں کبھی ایسے ناچ دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا، یا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رقص دیکھتے یا آنکھیں بند کر لیا کرتے۔ مگر خدا عمر دراز کرے یحیٰی بختیار کی کہ انہوں نے پاکستان کے اٹارنی جنرل کی حیثیت سے جج صاحبان کو صحیح معنوں میں کراچی کی سیر کرا دی۔ مگر ان ایام میں بھٹو بھی کراچی میں موجود تھے اور کانفرنس کے آخری اجلاس کے خاتمے پر ڈنر کے دوران غیر ملکی مہمانوں، وکلاء اور تمام جج صاحبان کی موجودگی میں انہوں نے اپنی فی البدیہہ تقریر میں ججوں کو ''مائی لارڈیز، مائی لاڈریز'' کہہ کر ان کا ایسا مذاق اڑایا اور ایسی تذلیل کی جس کا وہاں موجود چیف جسٹس پاکستان جسٹس حمود الرحمٰن (مرحوم) نے نہ صرف نوٹس لیا بلکہ بہت برا منایا۔

جسٹس چودھری محمد صدیق کا ذکر آ گیا ہے تو بتا تا چلوں کہ داڑھی رکھنے سے پیشتر آپ پکے رند

تھے' مگر بعد میں نہ صرف تائب ہو گئے بلکہ فیصل آباد کے پیر برکت علی مرحوم کے زیر اثر انہوں نے صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ تصوف کی منازل بھی طے کرنا شروع کر دیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "تصوف کی دنیا میں حضرت علامہ اقبال کے صحیح مقام کا علم تو مجھے اپنے پیرومرشد کے ذریعہ ہوا۔" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" فرمایا: "پیرومرشد جب کبھی لاہور تشریف لاتے تو حضرت علامہ کے مزار پر دعا کے لیے جاتے اور پھر داتا دربار حاضری دے کر واپس فیصل آباد کے ضلع میں اپنے چک پہنچتے۔ ایک روز میں جرأت کر کے ان سے پوچھ بیٹھا کہ پیرومرشد! داتا صاحب کے دربار میں حاضری دینا تو بجا مگر آپ کا علامہ اقبال کے مزار پر جانا جو ایک...... پیرومرشد نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ کر کہا آگے مت کچھ کہنا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ان کا کیا مقام ہے۔ کہنے لگے کہ ایک دن میں بمطابق معمول لاہور میں تھا۔ حضرت علامہ اقبال کے مزار پر حاضری دے کر داتا دربار پہنچا۔ وہاں مغرب کی نماز کی ادائیگی کے بعد واپس فیصل آباد جانے کے لیے اپنی جیپ میں بیٹھنے لگا تو کسی نے مجھے روکا اور کہا داتا صاحب یاد کر رہے ہیں۔ میں جیپ سے اتر کر اس شخص کے پیچھے پیچھے چپ چاپ غلام گردش سے گزرتا داتا صاحب کی تربت تک پہنچا۔ اس شخص نے تربت پر پڑے بہت سے غلافوں میں سے ایک نکال کر مجھے تھما دیا اور کہا کہ لے جاؤ' یہ داتا صاحب کی طرف سے ہے۔ فیصل آباد جاتے ہوئے مجھے جیپ میں بیٹھے بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ شاید میری موت قریب آن پہنچی ہے اور داتا صاحب نے میری قبر کے لیے اپنا غلاف عطا کیا ہے۔ بہر حال فیصل آباد پہنچ کر کچھ دیر ستانے کے لیے میں اپنی بیٹھک میں اترا تو معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کا دیرینہ خدمتگار علی بخش فوت ہو گیا ہے۔ میں اپنے چک واپس پہنچنے سے پہلے علی بخش کے چک میں گیا' اس کے جنازے میں شریک ہوا اور جب اسے دفنا چکے تو وہ غلاف میں نے علی بخش کی قبر پر اوڑھ دیا۔ سو چودھری صاحب! حضرت علامہ اقبال کے مرتبہ کے بارے میں آپ کو کیا بتاؤں۔ بس اس سے اندازہ کر لو کہ ان کے خدمتگار کی تربت کے لیے داتا صاحب نے اپنا غلاف اتروا کر میرے ہاتھ بھجوایا۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے چودھری صدیق اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ میں نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا "چودھری صاحب! ایک جج کی حیثیت سے اپنے آپ کو صرف شریعت تک ہی محدود رکھئے اور طریقت سے حتی الوسع اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

اسی زمانے میں سیلاب نے پنجاب میں بڑی تباہی مچائی۔ چیف جسٹس سردار اقبال نے مجھے فلڈ کمیشن کا چیئرمین مقرر کر دیا۔ میں نے کمیشن کے دیگر ممبران کے ہمراہ سارے پنجاب کا دورہ کیا اور بالآخر ایک طویل رپورٹ تحریر کر کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے کو پیش کی۔ اس رپورٹ میں ڈپٹی کمشنروں' محکمہ انہار کے افسروں اور دیگر لوگوں کے بیانات کی روشنی میں جو انکشافات ہوئے' درج کر دیئے گئے۔ مثلاً

بہاولپور اور دوسرے ضلعوں میں اکثر جاگیرداروں کے کارندوں نے، جن کا تعلق خصوصی طور پر پیپلز پارٹی سے تھا، اپنی اراضی کو سیلاب کے پانی سے بچانے کی خاطر اس کا رخ شہری آبادیوں کی طرف موڑ دیا۔ اسی طرح فیڈرل گورنمنٹ کے ایک وزیر (جو اپنے آپ کو ہائیڈرولک انجینئر سمجھتے تھے) لوکل ڈپٹی کمشنر کو سیلاب کے بہاؤ سے متعلق اپنے احکام جاری کر کے خود وہاں سے رخصت ہو گئے۔ مگر ڈپٹی کمشنر نے سیلاب کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی صورت کے پیش نظر اپنا ذاتی ذہن استعمال کرتے ہوئے، بجائے اس کے بہاؤ کا رخ موڑ دے، شہری آبادی کی طرف بڑھنے دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ وزیر صاحب کا حکم تھا، سیلاب کے بہاؤ کا رخ بدلا نہ جائے۔ الغرض جاگیرداروں اور زمینداروں کی اراضی کو سیلاب کے پانی سے محفوظ رکھنے کی خاطر خصوصی طور پر سرائیکی بیلٹ میں اس کا رخ شہری آبادیوں کی طرف دیدہ دانستہ موڑا گیا۔ اس اسٹریٹجی کے نتیجے میں خانپور شہر جو جغرافیائی اعتبار سے ایک پیالے کی شکل میں ہے، بالکل ڈوب گیا اور وہاں سب سے زیادہ تباہی مچی۔ علاوہ اس کے سیلاب زدہ لوگوں کے لیے امدادی سامان بھی سیاسی کارکنان نے خوب خورد برد کیا۔ سب سے زیادہ غلط بیانی جمیعت العلمائے اسلام کے کارندوں نے کی جنھوں نے مردہ لوگوں کے ناموں پر امدادی سامان غصب کیا۔ یہاں تک کہ صحیح حقداروں کو امداد بہت کم مل سکی۔ مستقبل میں سیلاب مینجمنٹ کے سلسلے میں تدابیر کے موضوع پر ایک مفصل باب تحریر کیا گیا۔ مگر رپورٹ شائع نہ ہوئی، نہ سیلاب مینجمنٹ کے بارے میں درج کردہ تدابیر پر عمل ہوا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ کئی برس بعد جب پرویز مسعود پنجاب کے چیف سیکرٹری تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ رپورٹ کی تین جلدیں چیف منسٹر کو دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تو غالباً فیڈرل حکومت کو ارسال کی گئی ہوگی، باقی جلدیں کہاں غائب ہو گئیں؟ مگر حکومت پنجاب کے ہاں وہ رپورٹ سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ پرویز مسعود نے میری ذاتی جلد کی فوٹو کاپی کرا کے صوبائی ریکارڈ میں محفوظ کی۔ پتا نہیں وہ اب بھی وہاں ہے یا نہیں۔

غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ مجھے کھر صاحب کا وہ زمانہ بھی خوب یاد ہے جب وہ بھٹو کے شوفر کی حیثیت سے میرے گھر آیا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ جب بھٹو میرے گھر آئے تو بھٹو تو اندر آ کر گھنٹہ بھر بیٹھے رہے۔ بعد میں معاً کہا کہ یار مصطفیٰ کار میں بیٹھا ہے، چاہو تو اسے بلا لو۔ میں باہر گیا، کھر صاحب کو ساتھ اندر لایا۔ تب ان کا سگار بار بار بجھ جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بھٹو نے انہیں نیا نیا سگار پر لگایا ہے۔

کمرے میں جنرل وسیع الدین (فرزند خواجہ شہاب الدین منسٹر کیبنٹ جنرل یحییٰ خان) بھی تشریف فرما تھے۔ بھٹو اور جنرل وسیع الدین ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کر رہے تھے۔ بھٹو نے جنرل وسیع الدین سے کہا کہ آپ چاہیں تو جنرل یحییٰ کو ہٹا سکتے ہیں۔ جنرل وسیع الدین نے جواب دیا کہ

بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟ بھٹو فوراً بول اٹھے کہ آپ! اور کون؟

مگر گورنر بننے کے بعد کھر وہ کھر نہ رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ پرانے گورے گورنروں کی نقل کرتے ہوئے برجس بھی پہن لیتے اور ہائی بوٹ۔ کہتے کہ ابھی ابھی گھوڑ سواری کر کے آیا ہوں۔ میرے ساتھ دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ ایک رات ان کے ہاں کھانا تھا۔ معلوم ہوا اسی دن کھر ایئر مارشل رحیم خان اور جنرل گل حسن کو اسلام آباد سے لاہور لائے ہیں اور وہ دونوں گورنر ہاؤس کے نچلے کمروں میں مقیم ہیں۔ اگلی صبح خاموشی سے انہیں ہسپانیہ اور آسٹریا میں سفیروں کے طور پر رخصت کر دیا جائے گا۔ کھر کی گورنری کے زمانے میں لاہور میں اچھی خاصی ''کھل'' ہو گئی تھی۔ مجروں کی محفلیں عام سجتی تھیں۔ لاہور کی سب طوائفوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دیئے تھے۔ اس لیے ان کے وارے نیارے تھے۔ لیکن کھر سرائیکی بیلٹ کے بعض جاگیرداروں کی طرح صرف عیاشی کے دلدادہ ہی نہ تھے' اپنے آپ کو سخت قسم کا منتظم بھی سمجھتے تھے۔ اپنے ماتحت انتظامیہ کے افسروں سے ان کا رویہ بہت جابرانہ تھا۔

بھٹو کی جمہوری حکومت نے عدلیہ پر اپنا دباؤ ڈالنے کے لیے کیا کیا حربے اختیار کیے۔ اس کی دو ایک مثالیں یہ ہیں۔ ایک دن چیف جسٹس سردار اقبال نے مجھے اپنے چیمبر میں بلا بھیجا۔ فرمایا: ''حال ہی میں آپ نے ایک معرکتہ الآرا فیصلہ ''شیزوفرینا'' کے مریض کسی ملزم سے متعلق سنایا ہے' جس نے رات گئے اٹھ کر ٹوکے سے اپنی سوئی ہوئی بیوی اور تین بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ مہربانی کر کے مجھے ''شیزوفرینا'' کی ذہنی بیماری کی علامات کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کر کے دیجئے۔'' میں نے نوٹ تیار کر دیا کہ ماہرین کے مطابق ''شیزوفرینا'' کے مریض کو ہر قسم کی ''ہیلوسی نیشنز'' ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی ان دیکھا شخص اس سے مسلسل سرگوشیاں کر رہا ہے یا کوئی عجیب و غریب مخلوق اس کے گھر کی کھڑکیوں یا روشن دانوں سے اسے مسلسل گھور رہی ہے۔ بسا اوقات اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بیوی بچے دوست احباب سب اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں' بلکہ اس کی بیوی یا ماں اس کا پیٹ چاک کر کے اس کی انتڑیاں باہر نکال رہی ہے اور پیٹ درد کی انتہائی تکلیف دہ کیفیت میں اسے دیکھ کر اس کے بچے اور دیگر اہل خانہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ ایسی کیفیات کو حقیقت سمجھ کر مریض کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وغیرہ۔ میں نے سردار اقبال سے پوچھا ''کیا آپ یہ حوالہ کسی فیصلہ میں دینا چاہتے ہیں؟'' فرمایا: ''نہیں۔ مجھے جسٹس ظلہ نے شکایت کی ہے کہ انہوں نے بعض فیصلے ایسے دیئے ہیں جن سے گورنر کھر ان کے خلاف ہو گئے ہیں' لہٰذا ان کے اشارے پر پولیس کے اہلکار انہیں گھر میں عجیب و غریب طریقوں سے ستاتے ہیں مثلاً روشن دانوں سے کوئی شخص اپنا سر نکال کر انہیں یا ان کے اہل خانہ کو ڈراتا دھمکاتا ہے۔ یا کوٹھی کے زنان خانہ کے گٹر سے ایک سر باہر نکل آتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سب پولیس کے اہلکار کھر صاحب کے حکم پر کر رہے ہیں۔ لہٰذا مجھے وزیراعظم بھٹو

سے وقت لے کر دیا جائے تا کہ اپنی شکایت ان تک پہنچا سکوں۔" سردار اقبال کی تفتیش کے مطابق نہ تو گورنر کھر نے آئی جی پولیس کو کوئی ایسا حکم دیا تھا اور نہ ہی پولیس اہلکار ایسی حرکتوں کے مرتکب ہو رہے تھے۔ ان کے خیال میں جسٹس ظلہ کو شاید "ہیلوسی نیشنز" ہونے لگی تھیں۔ میں نے سردار اقبال سے پوچھا کہ اگر ایسی بات ہے تو جسٹس ظلہ کے اہل خانہ' ان کی بیگم اور بیٹیاں گھر میں پیش آنے والے ایسے واقعات کی تائید کیونکر کر سکتی ہیں' مگر سردار اقبال کی رائے تھی کہ جسٹس ظلہ کا اپنے اہل خانہ پر اتنا رُعب ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال سردار اقبال نے جسٹس ظلہ کی ملاقات وزیر اعظم بھٹو سے کروا دی۔ حیرت ہے کہ وزیر اعظم بھٹو سے ملاقات کے بعد ایسے واقعات ہونا بند ہو گئے۔ کیا جسٹس ظلہ کی شکایت درست تھی کہ انہیں مستقبل میں خوفزدہ کرنے کی خاطر صوبائی انتظامیہ نے ایسے انوکھے قدم اٹھائے؟ یا واقعی جسٹس ظلہ کو "ہیلوسی نیشنز" ہونے لگی تھیں اور وہ ذہنی مرض "شیزوفرینا" کا شکار ہو گئے تھے؟ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک جسٹس ظلہ جج کے فرائض انجام دیتے رہے اور آخر کار سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ان کی شکایت درست ہو۔

اس مرحلے پر مجھے پاکستان کے ایک اور نامور جج صاحب کی یاد آ گئی۔ جسٹس کیکاؤس مرحوم نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک رٹ درخواست لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی کہ ۱۹۷۳ء کا دستور کفریات پر مبنی ہے اس لیے اسے کالعدم قرار دیا جائے۔ چیف جسٹس سردار اقبال کے کہنے پر میں ان کے ساتھ بینچ پر بیٹھا۔ کیکاؤس صاحب کے دلائل سننے سے پیشتر ہم نے ان سے سوال کیا کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت ہی ہم ججوں کے طور پر بیٹھے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں' لہٰذا ہم اسی دستور کو کفریات پر مبنی کہہ کر کالعدم کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ جواب دیا: "آپ اللہ کے مقرر کردہ جج ہیں اس لیے جو تحریر بھی کفر پر مبنی ہو' اسے کالعدم قرار دے سکنے کا آپ کو اختیار ہے۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو آپ دونوں کے نکاح باطل ہو جائیں گے۔" ان کی رٹ پٹیشن تو ڈسمس کر دی گئی' مگر جسٹس کیکاؤس کا شمار اپنے عہد کے عظیم ترین پاکستانی سول اور کانسی ٹیوشنل ججوں میں ہوتا ہے۔ حیرت ہے وقت گزرنے کے ساتھ انسانی ذہن میں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح کوئی فوجی کرنل کسی کریمنل کیس میں ملوث تھا۔ معاملہ جسٹس شمیم حسین قادری صاحب کے سامنے پیش تھا۔ انہوں نے شاید فوجی کرنل کو برا بھلا کہا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا' جس پر بھٹو نے چیف جسٹس سردار اقبال کو اسلام آباد طلب کر لیا اور ہدایت کی کہ اپنے جج صاحبان کو سنبھالیے "ہم ابھی جنگل سے باہر نہیں نکلے۔" سردار اقبال نے جسٹس شمیم حسین قادری کو بھٹو کا پیغام پہنچا دیا۔ جسٹس قادری اتنے خوفزدہ ہوئے کہ معافی تلافی کی غرض سے کمانڈر ان چیف جنرل ٹکا خان تک جا پہنچے اور شاید اس کی

درازیٔ عمر کے لیئے بکرے کی قربانی بھی دی۔

خدا بہتر جانتا ہے کہ چیف جسٹس سردار اقبال کی اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کے ساتھ ٹھن کیسے گئی کہ وہ انہیں نکالنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ یحییٰ بختیار نے اپنے کسی دوست وکیل کو جج بنانے کی فرمائش کی جس پر سردار اقبال نے جواب دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ''دلے'' ہائی کورٹ کے جج مقرر کر دیئے جائیں۔ اس ریمارک پر یحییٰ بختیار ناراض ہو گئے۔ ممکن ہے کوئی اور ذاتی وجوہ بھی ہوں۔ بہرحال بھٹو حکومت نے چیف جسٹس سردار اقبال کو نکالنے اور جسٹس یعقوب علی خان کو سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر ان کی متعینہ مدتِ ملازمت میں توسیع دینے کی خاطر ایک عجیب و غریب قانون نافذ کیا۔ اس قانون کے تحت چار برس بعد اگر کسی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو سپریم کورٹ کے جج کے طور پر جانا قبول نہ ہو تو وہ ریٹائرڈ تصور کیا جائے گا اور اسی طرح سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی متعینہ مدتِ ملازمت کو غالباً تین سال تک بڑھا دیا جائے گا' یعنی وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی چیف جسٹس کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا۔ سردار اقبال جنہوں نے کئی برس تک لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس رہنا تھا' کو انتظامیہ نے چار سال کی چیف ججی کے بعد سپریم کورٹ کا جج بننے کے لیے کہا اور ان کے انکار پر وہ ریٹائر ہو گئے۔ ادھر جسٹس یعقوب علی خان کو ان کی ریٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچنے کے بعد بھی چیف جسٹس پاکستان کے عہدے پر قائم رکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ بھٹو حکومت کے نزدیک سردار اقبال شاید بہت زیادہ انڈی پینڈنٹ جج تھے یا کسی معاملے میں ضرورت پڑنے پر اٹارنی جنرل کے ذریعے بھٹو تک پہنچنے کی بجائے ان سے براہِ راست بات کرتے تھے' اس لیے ان پر اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا کہ حکومت کی مرضی کے مطابق فیصلے دیں گے مگر ان کے مقابلے میں جسٹس یعقوب علی خان قابلِ اعتماد چیف جسٹس آف پاکستان تھے اور حکومت ان سے جو چاہے فیصلے کروا سکتی تھی۔

بہرحال جسٹس سردار اقبال کے رخصت ہونے پر لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ خالی ہو گیا۔ یحییٰ بختیار کونسل مسلم لیگ کے ناتے سے اور ویسے بھی میرے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ مجھ سے ملے' فرمایا: ''وزیر اعظم بھٹو نے چیف جسٹس کے عہدہ کے لیے تمہارا نام تجویز کیا ہے۔'' بھٹو کی ذات کا ایک قابلِ ذکر پہلو یہ ہے کہ کونسل مسلم لیگ کی بعض شخصیتوں کے لیے ان کے دل میں ہمیشہ نرم گوشہ رہا۔ مثلاً انہوں نے وزیر اعظم بنتے ہی یحییٰ بختیار کو کوئٹہ فون کیا اور انہیں اٹارنی جنرل کے عہدہ کی پیشکش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔ خان عبدالقیوم خان اور ان کا گروپ تو شروع ہی سے پیپلز پارٹی کے ساتھ تھا۔ سردار شوکت حیات نے بھٹو سے ازسرنو دوستانہ تعلقات استوار کر لیے اور بہت سے کاروباری فوائد اٹھائے۔ میاں ممتاز دولتانہ نے بھی بھٹو کے کہنے پر برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر کے طور پر خدمات انجام

دینے کا فریضہ اٹھالیا۔ اب کونسل مسلم لیگ کا ایک فرد صرف میں ہی رہ گیا تھا۔ بھٹو نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ میں ان کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں، لیکن میں نہ مانا۔ پھر مجھے بطور جج کنفرم کرنے سے پیشتر پیغام بھیجا کہ ججی چھوڑ کر میں ان کے ساتھ پارلیمینٹ میں بیٹھ کر قوم کی تقدیر کے فیصلے کروں۔ مگر میرے نہ ماننے پر انہوں نے مجھے بطور جج کنفرم کر دیا۔ اب ایک اور موقع مجھے نوازنے کا انہیں ملا۔ اگر میں چاہتا تو لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بن سکتا تھا۔ مگر میں نے یحییٰ بختیار سے کہا ''میرے لیے ہائی کورٹ کا جج بن جانا ہی بڑا اعزاز ہے۔ یہ وہ منصب ہے جس کے لیے میرے والد کو اس وقت کے ہندو چیف جسٹس سر شادی لعل نے نا قابلِ قبول سمجھا تھا۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ سنیارٹی لسٹ میں میں چودہ نمبر پر ہوں اور مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ اپنے چودہ رفقائے کار سے سبقت لے کر چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لوں۔ تم وزیر اعظم کو مشورہ دو کہ سردار اقبال کے جانے کے بعد جو سب سے سینئر جج (یعنی جسٹس مولوی مشتاق حسین) ہیں، انہیں یہ عہدہ سونپا جائے۔''

جسٹس مولوی مشتاق حسین کے گروپ کے ججوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ میں ایسے ایثار کا مظاہرہ کیسے کر سکتا ہوں۔ انہیں یقین نہ آتا تھا۔ ایک روز اتفاق سے جسٹس انوار الحق سے پنجاب کلب میں میری ملاقات ہوئی۔ وہ جسٹس یعقوب علی خان کے، چیف جسٹس پاکستان کے عہدے پر اضافی مدت تک فائز رہنے کے سبب چیف جسٹس نہ بن سکے تھے۔ فرمایا: ''کیا واقعی آپ نے لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بننے سے معذرت کر لی ہے؟'' میں نے انہیں وہی جواب دیا جو یحییٰ بختیار کو دیا تھا۔

مگر یحییٰ بختیار، جسٹس مولوی مشتاق حسین کو کسی صورت میں چیف جسٹس ہائی کورٹ لاہور دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جسٹس مولوی مشتاق بھی جسٹس سردار اقبال کی طرح گروپ نواز ہیں اور جب تک یہ دونوں گروپ توڑے نہ گئے لاہور ہائی کورٹ منقسم رہے گا۔ ممکن ہے اس سبب کے علاوہ اور بھی ذاتی اسباب ہوں۔ بہرحال جسٹس مولوی مشتاق چیف جسٹس بننے کے لیے سخت بیتاب تھے اور ان کا حق بھی تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا: ''یحییٰ بختیار آپ کے دوست ہیں۔ وہ مجھے اس منصب کے لیے کیوں نامناسب خیال کرتے ہیں؟ میں نے جنرل ایوب خان کے زمانے میں بھٹو کو ان کی قید سے رہا کرایا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یحییٰ بختیار اور مجھے کسی دن اپنے گھر چائے وائے پر بلا لیں تاکہ میں ان سے پوچھ سکوں کہ میرے خلاف یحییٰ بختیار یا وزیر اعظم بھٹو کو کیا عناد ہے؟'' میں نے یحییٰ بختیار سے بات کی، لیکن انہوں نے فرمایا: ''اگر تم نے مولوی مشتاق کو اس مقصد کے لیے اپنے گھر بلایا تو نہ صرف یہ کہ میں نہ آؤں گا بلکہ میری تمہاری دوستی بھی ختم ہو جائے گی۔'' میں نے ان کا جواب مولوی مشتاق کو سنا دیا۔ اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار وزیر اعظم بھٹو کے بہت منہ چڑھے تھے۔ افسوس ہے میں ان کو اپنا قائل کرنے میں ناکام رہا۔ لیکن معلوم

ہوتا ہے کہ آسمانوں میں بھٹو کی اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لیے تانا بانا بنا جا رہا تھا اور ہم سب بے بس تھے۔

یحییٰ بختیار کے مشورے پر بھٹو نے جسٹس اسلم ریاض حسین کو (جو سنیارٹی لسٹ میں آٹھویں نمبر پر تھے) لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بنا دیا۔ اسلم ریاض اور یحییٰ بختیار دونوں نے لندن میں بار کا امتحان اکٹھے پاس کیا تھا اور دونوں کی آپس میں گہری دوستی تھی۔ اس تقرر پر مولوی مشتاق بہت ناخوش تھے' اس لیے لمبی چھٹی لے کر پاکستان سے باہر چلے گئے۔

مجھے فوج کے اعلیٰ تعلیمی ادارے (مثلاً کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ' نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی وغیرہ) نظریۂ پاکستان کے موضوع پر لیکچر دینے کے لیے اکثر بلوایا کرتے تھے۔ مگر وزیراعظم بھٹو نے چیف جسٹس سردار اقبال سے کہہ کر ججوں کا لیکچروں کے لیے فوجی اداروں میں جانا بند کرا دیا۔

بھٹو عہد میں مجھے دو مرتبہ ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا اور انہوں نے دونوں مرتبہ اس کی اجازت دے دی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں امریکی حکومت کی طرف سے مجھے لیڈرشپ پروگرام کے تحت امریکہ یاترا کی دعوت ملی۔ بھٹو نے امریکہ جانے کی اجازت دینے سے پیشتر مجھے بلوایا اور اس زمانے میں پاکستانی سفیر سلطان محمد خان کے بارے میں مجھے اپنے تاثرات لکھنے کے لیے کہا۔ بات یہ ہے کہ جنرل یحییٰ خان کے زمانے میں انہی کی وساطت سے کسنجر نے چین کا دورہ کیا اور اس طرح امریکہ کے چین کے ساتھ براہِ راست تعلقات استوار کرنے کا موقع پاکستان نے فراہم کیا۔ نتیجہ میں سوویٹ رُوس (جس کے تعلقات چین کے ساتھ بہت خراب تھے) پاکستان سے ناراض ہو گیا اور پاکستان کے خلاف بھارت کی مدد کر کے اس نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں پاکستان کو سخت سبق سکھایا۔ بھٹو کے دل میں جس طرح امریکہ کے خلاف گرہ تھی' اسی طرح وہ سلطان محمد خان کو شعیب کی طرح امریکہ کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔

واشنگٹن پہنچنے پر پاکستانی سفارت خانے اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں نے میرا استقبال کیا۔ سفارت خانے کی دعوت میں مجھے امریکہ کے فیڈرل سپریم کورٹ کے معروف جج جسٹس اوڈگلس سے ملاقات کا موقع ملا۔ جسٹس اوڈگلس کی عمر تقریباً پچاسی برس کی تھی اور انہوں نے اٹھائیس سالہ خاتون سے شادی کر رکھی تھی۔ وہ واشنگٹن میں عموماً پاکستانی سفارت خانے کے یومِ اقبال کی تقاریب کی صدارت کرتے تھے۔ کافی سترے بہترے تھے۔ مثال یہ ہے کہ انہوں نے مجھے فیڈرل سپریم کورٹ دیکھنے کی دعوت دی اور بعدازاں اپنے رفقائے کار ججوں کے ساتھ لنچ میں شرکت کے لیے کہا' مگر چند ہی لمحوں کے بعد بھول گئے کہ میں کون ہوں' جس پر ان کی بیوی نے انہیں یاد دلایا کہ وہی ہیں جن کو دعوت دی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اس قسم کا عمر رسیدہ جج مقدمات کے فیصلے کس طرح کر سکتا ہے۔ (امریکہ میں سپریم کورٹ کے جج کی ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہیں' البتہ وہ خود چاہے تو ریٹائر ہو سکتا ہے۔)

میں نے سفیر صاحب کے ساتھ سپریم کورٹ کی عمارت کی سیر کی۔ عدالت کا وہ ہال بھی دیکھا جس میں مستقل طور پر امریکی صدر کی کرسی رکھی گئی ہے۔ رواج کے مطابق وہ نیچے کھڑا ہو کر ڈائس پر کھڑے نئے چیف جسٹس سے حلف لیتا ہے۔ بعد ازاں سپریم کورٹ کے ججوں کے ساتھ اس عمارت کی سب سے اوپر کی منزل پر واقع ریستوران میں لنچ کھایا۔ اس زمانے میں جسٹس وارن برگر چیف جسٹس تھے اور ان کی عمر بھی تقریباً اسی برس تھی۔ مجھ سے میری عمر پوچھی۔ میں نے بتایا کہ انچاس برس کا ہوں۔ فرمایا کہ آپ تو ابھی بچے ہو۔ جج صاحبان میری اس بات پر بڑے خوش ہوئے کہ پاکستان میں اعلیٰ عدالتیں صبح آٹھ بجے کام شروع کرتی ہیں اور ایک بجے دوپہر تک کام ختم کر دیتی ہیں۔ کہنے لگے کہ اے کاش کم از کم گرمیوں میں یہاں بھی ہم ایسے اوقات متعین کر سکیں تا کہ دوپہر کا کھانا اپنے اپنے گھر جا کر کھا سکیں۔ وہ سب اس بات کے بھی بڑے خواہشمند تھے کہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں انہیں تعطیلات گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے جوار بابِ بست و کشاد جنوبی ایشیا کے معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سفیر صاحب کے ساتھ مجھے لنچ پر مدعو کیا۔ اس لنچ پر امریکی افسروں نے ہمارے سفیر سلطان محمد خان کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔ کیپٹل ہل میں سلطان محمد خان کی مقبولیت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ نہ صرف وہ امریکہ کے آدمی ہیں بلکہ مجھے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ بھٹو حکومت نے اگر امریکہ سے فائدہ اٹھانا ہے تو سفیر کے عہدے کے لیے صرف وہی موزوں ہوں گے۔

واشنگٹن سے فارغ ہو کر میں نے بالٹی مور میں ججوں کے ایک سیمینار میں شرکت کی جہاں ان کی ریاست کے لیے کسی نئے فوجداری قانون کا ضابطہ زیر غور تھا۔ اس ضابطے میں بعض نئے جرم تجویز کیے گئے تھے' مثلاً مزدوری کا سرقہ یعنی اگر کوئی کسی کی سروسز استعمال کرے اور اس کا معاوضہ نہ دے تو یہ فوجداری نوعیت کا جرم ہوگا۔ میں نے جج صاحبان کو بتایا کہ پاکستان میں فوجداری قوانین کا جو ضابطہ نافذ ہے' اسے بنیادی طور پر لارڈ میکالے نے ترتیب دیا تھا اور اگرچہ بعد میں ہم نے اس میں بعض تبدیلیاں کی ہیں' لیکن وہ قانونی تفاصیل کے ساتھ ایک ادبی شاہکار بھی ہے۔ لارڈ میکالے گو قانون کا ماہر تھا مگر انگلستان کے ادیبوں میں بھی اس کا شمار ہوتا تھا۔ ججوں نے پاکستان کے پینل کوڈ میں دلچسپی کا اظہار کیا کیونکہ انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں امریکہ میں ایسا کوئی ضابطہ نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ میں نے واپس آ کر ججوں کی خواہش کے مطابق انہیں پاکستان پینل کوڈ کی چند جلدیں ارسال کر دیں۔ یہ ہائی کورٹ لاہور کی طرف سے بالٹی مور کے ہائی کورٹ کو تحفہ تھا۔

اپنے قیام کے دوران میں نے پنسلوینیا سٹیٹ میں روزمانٹ کالج کی ایک کانفرنس میں بھی

شرکت کی جس کا اہتمام وہاں کے پروفیسر مسعود غزنوی نے کیا تھا اور اس میں میرے علاوہ سر محمد ظفر اللہ خان بھی شریک ہوئے جو ہالینڈ سے تشریف لائے تھے۔ بعدازاں واشنگٹن سے میں سان فرانسسکو پہنچا اور برکلے یونیورسٹی میں اسلامی تصوف کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اس لیکچر کا اہتمام یونیورسٹی کی ساؤتھ ایشین سٹڈیز کی فیکلٹی نے کیا تھا۔ برکلے سے سٹینفورڈ یونیورسٹی کا چکر لگایا۔ یہ یونیورسٹی ہسپانوی طرز تعمیر (یا اسلامی کہہ لیجیے) کا نمونہ ہے۔ کیلیفورنیا بھی عجیب وغریب ریاست ہے' خوبصورت بہت ہے' موسم پنجاب کی طرح ہے۔ اکثر طلباء وطالبات یا تو ہندو جوگی جوگنیں ہیں یا بدھ مت کے پیروکار یا صوفی ازم کے دلدادہ۔ یہاں تک کہ بعض امریکن لڑکیوں نے سکھ مذہب قبول کر رکھا ہے اور سکھ تصوف کو ''سکھی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں شادی کے بغیر لڑکے اور لڑکیاں یا ہم جنس پرست مرد اور عورتوں کے جوڑے عام اکٹھے رہتے ہیں۔ اس طرز کی بود وباش کو ''ایل ٹی اے'' (یعنی لیونگ ٹوگیدر ارینجمنٹ) کا نام دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی مادر پدر آزادی کو ''امریکن وے آف لائف'' کہا جاتا ہے۔ میں سان فرانسسکو سے سیکرامنٹو بھی گیا۔ یہاں مدت ہوئی پنجابی مسلمان مزدوروں کے طور پر آ کر آباد ہو گئے تھے' لیکن اب بڑے بڑے زمیندار ہیں' وہ امریکن تو بخوبی بولتے ہیں لیکن جب پنجابی میں بات کریں تو ان کا لہجہ دیہاتیوں یا گنواروں جیسا ہوتا ہے۔

سان فرانسسکو سے میں نیویارک پہنچا' چونکہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا مہمان تھا اس لیے گرینڈ سنٹرل پارک کے سامنے ففتھ ایونیو سے ہٹ کر ہوٹل پلازہ کے پنٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ میں گیارہ برس بعد نیویارک آیا تھا اور سب کچھ بڑی تیزی سے بدل گیا تھا۔ یواین کی پرانی جاننے والی خواتین میں سے اینا خودکشی کر چکی تھیں اور اب ان کے شوہر غالباً جرمنی میں میکسیکو کے سفیر تھے۔ جوڈی بنگھم تھرڈ کسی فرانسیسی کے ساتھ شادی کر کے پیرس جا مقیم ہوئی تھیں۔ باربرا کراؤس سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ کہنے لگیں: ''تم مجھے پہچان نہیں سکو گے۔ میں کینسر کی مریض ہوں۔ کیموتھیرپی کے سبب میرے سر کے تمام بال جھڑ چکے ہیں۔'' اقبال اخوند یواین میں پاکستان کے سفیر تھے۔ مجھے اپنے گھر پارٹی پر بلایا۔ وہی یواین کے جھوٹے قہقہے لگاتے ہوئے سفیر اور وہی نیویارک کی خوبصورت ماڈل لڑکیوں کی نئی پود۔ میں نے دل میں سوچا کہ زندگی میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔

امریکہ سے واپسی میں چند روز کے لیے لندن رکا اور زندگی میں پہلی بار اپنی بیگم ناصرہ کے لیے ہیروڈز کی دکان سے نہایت نفیس جوتے خریدے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ بدقسمتی سے یہ غلط سائز کے تھے۔ بڑی پریشانی ہوئی۔ رونا دھونا مچا۔ جوتے تو کسی نہ کسی طرح بدلوا کر سائز کے مطابق منگوا لیے گئے۔ لیکن ہم دونوں میں یہ اصول طے پایا کہ آئندہ میں اپنی بیگم کے لیے سوائے خوشبوؤں کے اور کوئی شے نہیں خریدوں گا۔

پاکستان واپسی سے پیشتر میں تہران بھی ٹھہرا' کیونکہ حکومت ایران نے لیڈرشپ پروگرام کی طرز کی دعوت دے رکھی تھی۔ اس زمانے میں ''شاہ'' ایران کا مطلق العنان حکمران تھا۔ میں نے تہران یونیورسٹی میں پاکستان اور ایران کے موضوع پر لیکچر دیا۔ سوال جواب کے سیشن میں کسی نے کوئی سوال نہ اٹھایا بلکہ میں نے محسوس کیا کہ طلباء اور طالبات غیر معمولی طور پر نہایت خاموش اور سہمے سہمے سے تھے۔ اسی طرح علامہ اقبال سے متعلق ایک عظیم الشان تقریب میں سفیر صاحب کے ساتھ شریک ہوا اور اپنا مقالہ پڑھا۔ رات کا کھانا کسی بینکر نے آب علی نامی ایک مشہور کیسینو (جوئے خانہ) میں دے رکھا تھا جہاں ہم رات گئے تک مادام گوگوش کے نغمے سنتے رہے۔

تہران سے میں پاکستان کے کلچرل اتاشی کے ہمراہ اصفہان پہنچا۔ اس شہر کی خوبصورت مساجد میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔ مجھے اس محل میں بھی لے جایا گیا' جہاں شاہ عباس کے زمانے میں مغل بادشاہ ہمایوں نے قیام کیا تھا۔ اصفہان سے ہم لوگ شیراز گئے اور حافظ و سعدی کے مزارات کی زیارت کی۔ پھر ساسانی عہد کے دارالحکومت پرسی پولس پہنچے۔ سائرس کا مقبرہ اور دارا کے محل کے کھنڈرات بھی دیکھے جسے اسکندر اعظم نے شراب کے نشے میں اپنی داشتہ کے کہنے پر جلا دینے کا حکم دیا تھا۔ ان عجیب وغریب مقامات کی سیر کے بعد ہم بالآخر مشہد پہنچے اور حضرت امام رضا کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت امام رضا کا مزار تو یوں لگتا ہے گویا سارے کا سارا چاندی کا بنا ہو۔

لاہور پہنچ کر میں نے سفر کی رپورٹ بھٹو کو بھیج دی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ بھٹو مری میں تھے۔ مجھے وہیں بلا بھیجا۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے: ''سلطان محمد خان دو وجوہ کی بنا پر تمہیں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں لے کر گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ تم مجھے آ کر بتاؤ کیپٹل ہل میں وہ کس قدر مقبول ہے اور دوسری یہ کہ تم کس حد تک امریکہ کے کام آ سکتے ہو۔'' بھٹو نے شاید شعیب یا امریکہ کو چڑانے کی خاطر میکسیکو میں پاکستانی سفارت خانہ قائم کرنے کے لیے انور آفریدی کو وہاں پہلے پاکستانی سفیر کے طور پر بھیجا تھا۔

دوسری مرتبہ میں ۱۹۷۵ء میں ملک سے باہر گیا۔ اس مرتبہ حفیظ ملک نے بیلاجیو (اٹلی) میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں چیف جسٹس سردار اقبال اور مجھے شرکت کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر حفیظ ملک سے پہلی مرتبہ میری ملاقات غالباً تب ہوئی تھی جب علامہ اقبال پر اپنی تصنیف کے لیے انہوں نے میرے ایک مضمون ''اقبال بحیثیت باپ'' کا انگریزی ترجمہ مانگا جو میں نے اس کتاب میں اشاعت کے لیے انہیں دے دیا تھا علامہ اقبال پر یہ پہلی کتاب تھی جو امریکہ میں شائع ہوئی۔ بعدازاں حفیظ ملک نے ایک ادارہ امریکن انسٹیٹیوٹ فار پاکستان سٹڈیز قائم کیا جس کی خاطر مالی امداد بھٹو نے بھی انہیں دی۔ اسی سلسلے میں بھٹو سے ملاقات کے لیے وہ ۱۹۷۳ء میں پاکستان آئے جب میں امریکہ جا رہا تھا۔

ڈاکٹر حفیظ ملک کے ساتھ ۱۹۷۳ء ہی سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ وہ جب کبھی لاہور آتے' میرے یہاں قیام کرتے اور میں کبھی امریکہ جاتا تو ان کے ہمراہ کچھ دن گزارے بغیر واپس نہ آتا۔ ہم آپس میں بیٹھے ہوں تو بات چیت کے دوران موضوعات کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ملک صاحب ہی کے ذریعے منیب ویلانووا یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ دراصل حفیظ ملک اور ان کی بیگم لنڈا منیب اور ولید دونوں کی دیکھ بھال امریکہ میں ان کی تعلیم کے دوران اپنے بچوں کی طرح کرتے رہے۔ ملک صاحب ایک مخلص اور شفیق دوست ہیں۔ آج کے زمانے میں ایسے دوست ملنا بہت مشکل ہے۔

بیلاجیو جھیل کومو کے کنارے چھوٹی سی آبادی ہے جس میں ایک نہایت خوبصورت ولا ہے جو غالباً کسی اطالوی کاؤنٹ کی ملکیت تھا۔ پھر کسی امریکی نے اسے خرید کر ادیبوں اور اسکالروں کے لیے ایک آرام گاہ میں منتقل کر دیا تھا۔ امریکی ادیب اور دانشور چھٹی منانے یا آرام کرنے کی خاطر اس وِلا میں آ کر اپنے خرچ پر ٹھہرتے ہیں یا بعض ادارے یہاں کانفرنسیں یا سیمینار منعقد کرتے ہیں' اس سیمینار میں میرا مقالہ ''علامہ اقبال کے سیاسی فکر میں اسلامی اتحاد کی اہمیت'' کے موضوع پر تھا۔ یہاں اتفاقاً میری ملاقات اپنے کیمبرج کے ٹیوٹر مسٹر کیمپس سے ہوئی جو اپنی امریکن بیوی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کی نظر بے حد کمزور ہو چکی تھی اور بڑی مشکل سے مجھے پہچان سکے۔ میں اٹلی سے غیر مانوس نہ تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں میں نے روم' نیپلز' وینس' میلان' اطالوی ریویرا بلکہ سسلی' کپری اور پمپئی (رومن شہر جو زلزلے اور ماؤنٹ ویسوویس سے اگلتے لاوے سے بالکل تباہ ہو گیا تھا) سب دیکھ چکا تھا۔

سیمینار سے فراغت کے بعد سردار اقبال اور میں میلان سے بذریعہ ہوائی جہاز میڈرڈ (ہسپانیہ) پہنچے۔ پاکستانی سفیر ایئر مارشل رحیم نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔ میڈرڈ سے ہم کوچ کے ذریعے اندلس کی سیر کو نکلے۔ غرناطہ اور قرطبہ دیکھے۔ غرناطہ میں قصر الحمرا اور اس کے عجیب و غریب باغات کی خوبصورتی سے تو واقعی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے انہیں جنات نے تعمیر کیا تھا۔ الحمرا کی طرز تعمیر سے اندلس کے اموی حکمرانوں کی عظمت اور شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اللہ کے روبرو ان کے عجز کا' کیونکہ ہر مقام پر یہی عبارت کندہ ہے: لا غالب الا للّٰہ۔ لیکن قرطبہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

سردار اقبال اور میں رات تقریباً نو بجے قرطبہ پہنچے اور مسجد قرطبہ کے بالمقابل واقع ''ہوٹل موسےٰ المیمون'' میں قیام کیا۔ موسےٰ المیمون' ابن رشد کے معروف یہودی شاگرد تھے جن کے ذریعے ان کے استاد کی تصانیف پاڈوا (اٹلی) پہنچیں اور ان کا ترجمہ عربی سے لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یوں یورپ میں تحریکِ احیائے علوم یونان کے علاوہ اندلس کے ذریعے اسلامی علوم سے بھی متاثر ہوئی۔ میرا دل تو رات ہی کو مسجد قرطبہ کے اندر جانے کے لیے بیتاب تھا۔ لیکن مسجد (کلیسا) کے سب دروازے بند تھے اور ہر طرف

تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی میں ہم نے مسجد کا طواف کیا اور بعدازاں سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئے۔ ہم دونوں دن بھر کے سفر کے سبب بہت تھکے ہوئے تھے۔ میں نے سردار اقبال کو اندلس میں مسلمانوں کے عروج و زوال اور خصوصی طور پر قرطبہ کی تاریخ کے متعلق بتانا شروع کیا۔ میں بولتا چلا گیا اور سردار اقبال سو گئے' مگر میں بڑی بے چینی کے عالم میں تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے والد کے آخری ایام کا خیال آ رہا تھا۔ انہیں بھی نیند نہ آتی تھی۔ ''نیند نہیں آ رہی! وقت نہیں گزر رہا۔ نیازی صاحب! کوئی کہانی سنائیے جس میں اندلس کا ذکر ہو۔ شاید نیند آ جائے۔'' نذیر نیازی کی کہانی سنتے سنتے کبھی کبھار انہیں نیند آ جایا کرتی اور بچوں کی طرح اطمینان سے سو جاتے مگر اکثر اوقات نیند نہ آتی تھی۔ وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا تھا۔ بہت بے چین ہوتے۔ ایسی ہی بے چینی کے عالم میں رخصت ہوئے۔

اگلے دن صبح صبح ہم مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ عام مساجد کی طرح وہ روشن نہ تھی بلکہ کلیساؤں کی طرح اس میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں' آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے' کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

میڈرڈ سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ عمرے کی غرض سے رات گئے جدہ پہنچے۔ احرام باندھے اور موٹر کار پر مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ فجر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی۔ پھر عمرہ کیا' لیکن سارا وقت میرے ذہن میں یہی سوال گھومتا رہا۔ ''یہاں اتنی روشنی کیوں؟ وہاں اتنا اندھیرا کیوں؟'' دوسرے روز مدینہ منورہ پہنچے لیکن میری بے چینی میں کمی واقع نہ ہوئی۔ ''میرے والد یہاں پہنچنے کے لیے ترستے مر گئے' انہیں نہیں بلایا' کیوں؟ مجھے بلا لیا' کس لیے؟'' واپس لاہور آ کر میں نے آغا شورش کو بتایا کہ میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ وہ رو دیئے' فرمایا: ''عاشقوں کو نہیں بلایا کرتے۔''

۱۹۷۷ء سے پیشتر ہی علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت منانے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ بھٹو حکومت نے اس مقصد کے لیے نیشنل اقبال کمیٹی قائم کی جس کے ممبروں میں مولانا کوثر نیازی' حفیظ پیرزادہ اور دیگر لوگوں کے علاوہ میں بھی شامل تھا۔ کمیٹی کے دو ایک اجلاس لاہور گورنر ہاؤس میں ہوئے جن کی صدارت بھٹو نے کی۔ دیگر تجاویز کے علاوہ دو باتیں خصوصی طور پر قابلِ غور تھیں۔ ایک کا تعلق تو ''جاوید منزل''

کو مجھ سے خرید کر ''اقبال میوزیم'' میں تبدیل کرنا تھا اور دوسری تجویز کے مطابق علامہ اقبال کے مزار کی تعمیرِ نو حافظ و سعدی کے مزارات کی صورت میں کرنا تھی۔ یہ تجویز غالباً بھٹو کی تھی۔ میں نے کمیٹی کے اجلاس میں اس کی مخالفت کی۔ میرا مؤقف تھا کہ مزار مسلمانوں کے چندے سے تعمیر ہوا ہے اور اس کی موجودہ طرزِ تعمیر کی قبولیت کے پیچھے بڑی دلچسپ روداد ہے۔ اقبال مزار کمیٹی نے مزار کے نقشے کے لیے ظاہر شاہ (افغانستان کے بادشاہ) اور نظام حیدر آباد سے استدعا کی کہ اس سلسلے میں کمیٹی کی مدد کریں۔ افغانستان کے سرکاری اطالوی ماہرِ تعمیرات نے جو نقشہ بھیجا اس میں اطالوی انداز میں تربت پر علامہ اقبال کا مجسمہ ہاتھ باندھے لٹایا گیا تھا۔ دوسری طرف حیدر آباد دکن سے جو نقشہ آیا وہ کچھ ایسا تھا، گویا کسی بلبل کو نہایت باریک اور خوبصورت پنجرے میں بند کر دیا ہو۔ کمیٹی نے اطالوی ماہر کا نقشہ تو غیر موزوں سمجھ کر مسترد کر دیا، مگر حیدر آباد دکن کے ماہرِ تعمیرات زین یار جنگ کو لاہور آنے کی دعوت دی گئی۔ جب وہ لاہور آئے تو چودھری محمد حسین صدر اقبال مزار کمیٹی انہیں اپنے ساتھ موقع پر لے گئے۔ بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں پر انہیں بٹھا کر فرمایا: ''دیکھئے! ایک طرف قلعہ لاہور کا صدر دروازہ ہے جو مسلمانوں کی ریاستی شوکت کا نشان ہے اور دوسری طرف بادشاہی مسجد میں داخل ہونے کے لیے صدر دروازہ ہے جو ان کی روحانی عظمت کا نشان ہے۔ علامہ اقبال اسلام کی ریاستی شوکت اور دینی عظمت کے علمبردار تھے۔ ان کا تعلق گل و بلبل کی شاعری سے نہ تھا بلکہ وہ فقر و سادگی، عزم و ہمت، تگ و دو اور عملِ پیہم کے شاعر تھے۔ اس لیے ان کے مزار کی عمارت اس طرز کی ہونی چاہیے جو ان اقدار کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ مسجد کی مشرقی دیوار سے، جس کے زیرِ سایہ ان کی تربت ہے، بلند نہ ہونے پائے۔ زین یار جنگ چودھری محمد حسین کی بات سمجھ گئے اور انہوں نے واپس جا کر نیا نقشہ بنایا اور کمیٹی کو بھجوایا جو پسند کیا گیا۔ مزار کی موجودہ عمارت اسی نقشے کے مطابق تعمیر کی گئی ہے۔ یہ کنول کے پھول کے اندر ایک طرح کا مضبوط و مستحکم مصری ''ٹیلہ'' (پیرامڈ) ہے جسے اوپر سے کاٹ دیا گیا ہے تاکہ مسجد کی دیوار سے عمارت سر نہ نکالے۔ مزار کے اندر چھت پر اور باہر جو اشعار کندہ ہیں وہ علامہ اقبال کے دست راست چودھری محمد حسین نے ان کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھتے ہوئے منتخب کیے تھے۔ کتبہ اور تعویذ ظاہر شاہ کی طرف سے ہدیہ ہیں اور پتھر میں کندہ اشعار کی خوشخطی اس زمانے کے معروف کاتب ابنِ پروین رقم کی ہے۔ نئی عمارت تعمیر کرنے کے لیے یہ سب کچھ مسمار کرنا پڑے گا، اس لیے تاریخ کا لحاظ کرتے ہوئے مزار کی موجودہ صورت کو من و عن اسی طرح رہنے دیا جائے۔ میری رائے مان لی گئی، مگر مزید کہا گیا کہ کم از کم مزار کے باہر کے دالان کو وسیع کر دیا جائے اور چاروں طرف گارڈز کے کھڑے ہونے کے لیے چبوترے تعمیر کر دیئے جائیں۔ میں اس تجویز کے بھی خلاف تھا کیونکہ علامہ اقبال ایک درویش تھے۔ ان کی آرام گاہ پر گارڈز کی ضرورت نہ تھی، لیکن میری اس بات سے اتفاق نہ کیا گیا۔ بھٹو کی رائے تھی کہ پاکستان اقبال کا خواب تھا۔ وہ

مصورِ پاکستان تھے۔ ان کے مزار کی زیارت کے لیے دنیا بھر کے ملکوں کے سربراہان آتے ہیں' لہٰذا ان کا تعلق پاکستان کی ''نیشن سٹیٹ'' سے بھی ہے۔ سو ریاست کے بانی کے طور پر ان کے مزار پر گارڈز اور معمول کے مطابق گارڈز کی تبدیلی کا نظام ضروری ہے۔ اس تجویز کے مطابق مزار کے باہر دالان کو وسعت دے دی گئی اور گارڈز کے لیے چبوترے بھی تعمیر ہو گئے۔

''جاوید منزل'' کو میوزیم میں منتقل کرنے کے بارے میں میرا موقف تھا کہ میرے پاس اس گھر کے سوا نہ کوئی اور گھر ہے' نہ کوئی پلاٹ۔ اس لیے اگر مجھے اسی کے رقبے کے مطابق کسی مناسب مقام پر حکومت کوئی پلاٹ دے دے اور ساتھ اس پر اپنی رہائش گاہ کے لیے گھر تعمیر کرنے کی خاطر رقم ادا کر دے تو مجھے منظور ہو گا۔ میں اقبال میوزیم میں اپنی طرف سے علامہ اقبال کے مسودات' اہم کاغذات' تصاویر اور ان کے استعمال میں آنے والی وہ تمام اشیاء جو میری تحویل میں ہیں' ایک مستقل قرض کے طور پر وفاقی حکومت کو پیش کر دوں گا۔ لیکن اس معاملے میں ابھی کوئی پیش رفت ہونا باقی تھی کہ وزیر اعظم بھٹو کے حالات نے کوئی اور ہی رخ اختیار کر لیا۔

بات یوں ہوئی کہ بھٹو نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کی خاطر وقت سے پیشتر انتخابات کروا دیئے اور پیپلز پارٹی بھاری اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوئی۔ مخالف سیاسی جماعتوں کا خیال تھا کہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی ہے' اس لیے انتخابات دوبارہ کرائے جانے چاہئیں' مگر پیپلز پارٹی ایسا کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ نتیجے میں احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہو گئے جو رفتہ رفتہ مظاہروں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ساتھ ہی تشدد کی کارروائیاں بھی ہونے لگیں۔ ان کے تدارک کے لیے بھٹو حکومت نے ''منی مارشل لا'' لگا دیا۔ فوج نے ایسے مظاہرین پر گولیاں چلائیں اور چند لوگ مارے بھی گئے۔ ہائی کورٹوں میں رٹیں ہوئیں کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت سول حکومت کسی قسم کا ''مارشل لا'' نافذ نہیں کر سکتی۔ بھٹو انتظامیہ نے اٹارنی جنرل کی کوششوں کے ذریعے سارے صوبوں کے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس تو اپنی مرضی کے مطابق مقرر کر رکھے تھے اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یعقوب علی خان میعادِ ملازمت میں توسیع ملنے کے سبب ویسے ہی حکومت کے زیر احسان اور فرمانبردار تھے۔ اس بنا پر عام یہی خیال تھا کہ ہائی کورٹوں میں ایسی رٹیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ سندھ ہائی کورٹ نے ایسی رٹ مسترد کر دی تھی اور حکم صادر کیا تھا کہ سول حکومت دستور کے تحت مارشل لا لگا سکتی ہے۔ مگر لاہور ہائی کورٹ میں جب یہ مسئلہ زیر سماعت آیا تو کئی دن بحث جاری رہی۔

مسئلہ کو نبٹانے کے لیے چیف جسٹس اسلم ریاض حسین نے پانچ ججوں پر مشتمل فل بنچ بنائی تھی جس میں ان کے علاوہ جسٹس شمیم حسین قادری' جسٹس کرم الٰہی چوہان' جسٹس ذکی الدین پال اور میں تھے۔

کیس کئی دن چلتا رہا اور ہم وکلاء کے دلائل سنتے رہے۔ اسی دوران بڑے عجیب وغریب مناظر دیکھنے میں آئے۔ مثلاً مال روڈ پر کسی مظاہرے پر فوج نے گولیاں چلائیں اور چند افراد زخمی حالت میں ہائی کورٹ کے احاطہ بلکہ چیف جسٹس کے چیمبر کے برآمدہ میں آ کر گرے۔ اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار حکومت کے حق میں اپنے دلائل پیش کر رہے تھے کہ اچانک جسٹس شمیم حسین قادری جوش میں آ گئے اور بھٹو کو برا بھلا کہنے لگے۔ پھر یکدم کورٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ریٹائرنگ روم کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے اٹھنے کے سبب بینچ ٹوٹ گیا۔ ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ریٹائرنگ روم میں آ گئے۔ یہاں شمیم حسین قادری کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں انہیں بھٹو کے غیظ وغضب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ زور زور سے چلانے لگے: ''یحییٰ بختیار کو بلاؤ' یحییٰ بختیار کو بلاؤ اور اس سے وعدہ لو کہ وہ بھٹو کو میری شکایت نہیں کرے گا۔'' چیف جسٹس اسلم ریاض حسین نے یحییٰ بختیار کو ریٹائرنگ روم میں طلب کیا اور ہم سب نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ اس واقعے کے بارے میں بھٹو کو کچھ نہیں بتائیں گے۔

پاکستان میں جب بھی کسی حکومت کو گرانا مقصود ہو تو عموماً اسلام کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بھٹو کی مخالف سیاسی جماعتوں کے ''کٹھ'' نے بھی نظام مصطفےٰ تحریک کے تحت ان سے زیادہ تر مذہبی مطالبات ہی کیے۔ مثلاً احمدیوں کو اقلیت قرار دو' اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کرو' گھڑ دوڑ پر جوا بند کرو' شراب بند کرو۔ بھٹو نے اپنی کرسی محفوظ کرنے کی خاطر سب مطالبات مان لیے' لیکن سیاسی جماعتوں کے ''کٹھ'' کی تسلی نہ ہوئی۔ دراصل ان کا مقصد کسی قسم کے اسلام کا نفاذ نہ تھا بلکہ کسی نہ کسی طریقہ سے بھٹو کو ہٹانا تھا۔ بہر حال بھٹو اور مخالف سیاسی قائدین کے درمیان بات چیت جاری رہی۔ توقع تھی کہ ان کے درمیان کوئی تصفیہ ہو جائے گا۔

اسی دوران ہمارے سامنے کیس بھی چلتا رہا۔ بالآخر سب وکلاء کے دلائل سننے کے بعد ہم نے فیصلہ حکومت کے خلاف صادر کیا کہ دستور کے تحت سول حکومت مارشل لا نہیں لگا سکتی۔ یحییٰ بختیار کو ان کے پرانے دوست چیف جسٹس اسلم ریاض حسین نے بے حد مایوس کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے دوست نے ان کے ساتھ دغا کیا ہے۔ مگر اسلم ریاض حسین کے نزدیک ایسی کوئی بات نہ تھی کیونکہ بقول ان کے جج ہمیشہ اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور یہ فیصلہ تو پانچ ججوں کی اتفاق رائے پر مبنی تھا۔ مگر خدا جانے یہ بات درست تھی یا نہیں' کیونکہ چیف جسٹس کی اپنی رائے کا اثر عموماً دوسرے ججوں پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ جسٹس کرم الٰہی چوہان مجھے کبھی کبھار ''ٹرکس آف دی ٹریڈ'' (یعنی جج کے کاروبار میں جو کھیل کھیلے جاتے ہیں) سے متعلق سبق دیا کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر فرمایا: ''دستور سے متعلق فیصلے جج کے ضمیر کے مطابق نہیں ہوتے بلکہ وقتی مصلحت کے تحت کیے جاتے ہیں۔ ایسے کیسوں میں تو ہمیشہ دو فیصلے تیار

کر کے رکھتا ہوں۔ ایک حکومت کے حق میں اور دوسرا خلاف۔ جو وقتی مصلحت ہو اسی کے مطابق مثبت یا منفی فیصلہ سنا دیتا ہوں۔''

اب ہائی کورٹ لاہور کے اس فیصلے کو کالعدم کروانے کے لیے بھٹو حکومت کے ترکش میں صرف ایک ہی تیر رہ گیا تھا اور وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس یعقوب علی خان تھے جو یہ کہتے سنے گئے کہ لاہور ہائی کورٹ ایسا فیصلہ کیونکر دے سکتی ہے جبکہ سندھ ہائی کورٹ نے اس سے پیشتر حکومت کے حق میں فیصلہ دے رکھا ہے۔ بہرحال وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ میں ہمارے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ مگر پیشتر اس کے کہ اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار اپیل کے حق میں دلائل دینے کی خاطر پیش ہوں' پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا لگ گیا۔

میرے لیے یہ بات سمجھ سکنا قدرے مشکل ہے کہ جب پاکستان میں فوج مداخلت کرتی ہے تو کیا وہ اپوزیشن کے سیاستدانوں کی ایما پر کرتی ہے یا کسی بیرونی طاقت کی شہ پر؟ اب بھٹو ہی کی مثال لیجئے۔ یہ مانا کہ ان کے ذاتی کردار میں بہت سی اخلاقی خامیاں تھیں' لیکن خامیاں کس میں نہیں؟ کیا ایسی خامیوں سے سکارنو' کینیڈی یا کلنٹن مبرا تھے؟ بھٹو کرپٹ بالکل نہ تھے' تماش بینی بھی اپنے سرمایہ دار یا جاگیردار دوستوں کے خرچ پر کرتے تھے۔ مگر اجتماعی طور پر ملک وقوم کے لیے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ انہوں نے ہزاروں پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھارت کے چنگل سے چھٹکارا دلایا' حالانکہ بعض اصحاب کے نزدیک وہ قید بھی بھٹو کی وجہ سے ہوئے تھے' کیونکہ بھٹو ہی نے ملک کو دولخت کرایا تھا۔ شملہ معاہدہ میں کشمیر کاز کو زیادہ نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ اگر بھارت نے ۱۹۷۴ء میں ایٹم بم چلایا تو بھٹو نے اس عزم کا اظہار برملا کیا کہ گھاس کھالیں گے لیکن پاکستان کو نیوکلیئر پاور ضرور بنائیں گے اور بالآخر انہی کے لگائے ہوئے پودے نے پھل دیا اور پاکستان ۱۹۹۸ء میں نیوکلیئر پاور بن گیا۔ اسی طرح او آئی سی کو فعال بنانے کی غرض سے انہوں نے مسلم ممالک کے سربراہان کا سربراہی اجلاس ۱۹۷۴ء میں لاہور میں منعقد کرایا۔ وہ اپنے عہد میں نہ صرف دنیائے اسلام بلکہ تیسری دنیا کے واحد اہم ترین قائد کی صورت میں ابھرے' لیکن انہیں پاکستانی فوج نے آلیا۔ کیوں؟ اپوزیشن کے لیڈروں کی شکایات کی بنا پر؟ یا امریکہ کے اشارے پر؟ یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ بھٹو خصوصی طور پر امریکہ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ ہمارے اپوزیشن لیڈر جب حزبِ اقتدار سے بہت ہی مایوس ہوں تو ''اسلام خطرہ میں ہے'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے عموماً فوج کی طرف ہی اپنا رخ موڑتے ہیں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس مرتبہ کن یا کس کی ایما پر بھٹو کا تختہ الٹا گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے دستور کو ''معلق'' کر دیا۔ اسمبلیاں وغیرہ ختم کر دی گئیں۔ پی سی او کے تحت

ججوں نے نئی قسمیں کھائیں۔ اس ''ڈرل'' میں بھٹو حکومت کے مقرر کردہ جج صاحبان کو اوتھ نہ دی گئی اور یوں وہ عدلیہ سے نکال دیئے گئے۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اسلم ریاض حسین کو گورنر پنجاب بنادیا گیا۔ میری نظر میں تو انہوں نے ''سموتھ اوپریٹر'' کی صورت میں پنجابی محاورہ کے مطابق ''چھتر'' سے ''ساہیہ'' مار لیا (یعنی جوتے سے خرگوش مار گرایا) ان کی جگہ مولوی مشتاق حسین کو باہر سے بلوا کر چیف جسٹس مقرر کردیا گیا۔ دوسری طرف ججوں کے بارے میں بھٹو حکومت کے وضع کردہ قانون جس کے تحت جسٹس یعقوب علی خان کو میعادِ ملازمت میں توسیع کی گئی تھی' کالعدم قرار دے کر انہیں اپنے منصب سے فارغ کردیا گیا۔ ان کی جگہ مولوی مشتاق حسین گروپ کے شیخ انوارالحق کو چیف جسٹس سپریم کورٹ پاکستان بنادیا گیا۔ ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس صاحبان سے متعلق بھٹو حکومت کا بنایا ہوا قانون برقرار رکھا گیا۔ میں بھولپن میں مولوی مشتاق حسین سے پوچھ بیٹھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ جواب ملا کہ اگر اسے بھی کالعدم کردیا جاتا تو جسٹس سردار اقبال کے واپس چیف جسٹس لاہور کے طور پر آ جانے کا امکان تھا۔

عدلیہ میں اس رد و بدل کے بعد بھٹو پر ایک پرانی ایف آئی آر کی بنا پر قتل کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ وہ گرفتار ہوئے اور مقدمہ کی اہمیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کا مقدمہ براہِ راست ہائی کورٹ لاہور میں ہونا قرار پایا (نواب کالاباغ جب اپنے فرزند کے ہاتھوں قتل ہوئے تو وہ قتل کیس بھی ہائی کورٹ میں براہِ راست سنا گیا تھا) اس مقدمے کے دوران بھٹو کو جسٹس صمدانی نے ضمانت پر رہا کردیا' لیکن چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے ضمانت منسوخ کردی اور بعد ازاں جسٹس صمدانی کو بھی جج کے منصب سے ہٹادیا گیا۔ پس کچھ مدت سے بھٹو کے لیے آسمانوں میں جو تانا بانا بنا جا رہا تھا' وہ مکمل ہوگیا۔ خوش الحان چڑیا اب جال میں پھنس چکی تھی اور اس کی تقدیر کا فیصلہ کرنے والے جج صاحبان چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سرکردگی میں بیٹھ چکے تھے۔ جہاں تک مولوی مشتاق حسین کا تعلق ہے' وہ تو کیس سننے سے پیشتر ہی اپنا مافی الضمیر بتانے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ایک دوپہر مجھے اور پروفیسر حفیظ ملک کو پنجاب کلب میں لنچ کھلا رہے تھے۔ فرمایا: ''یہ تو اوپن اور شٹ کیس ہے۔ کھولو اور بند کردو۔ لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔'' مولوی مشتاق حسین نے مجھے بھی اس بینچ پر بیٹھنے کو کہا' لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میں بھٹو کے مقابلہ میں الیکشن ہار چکا ہوں۔ اب ان کی زندگی یا موت کا فیصلہ کرنے والی بینچ پر بیٹھنا میرے دل کو گوارا نہیں۔

علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلہ میں قومی کمیٹی کی سربراہی اب جنرل ضیاء الحق نے سنبھال لی تھی۔ اس سال دسمبر ۱۹۷۷ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ایک بین الاقوامی اقبال کانگرس منعقد کی جس میں دنیا بھر کے اقبال شناسوں نے شرکت کی۔ اس کانگرس کا افتتاح پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے فیصل آڈیٹوریم میں جنرل ضیاء الحق نے کیا۔ دیگر اجلاس پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کے ہال میں ہوتے رہے۔

بعدازاں بیرونی ممالک سے آئے ہوئے اقبال شناسوں کو سیالکوٹ میں علامہ اقبال کے آبائی گھر میں ایک جلوس کی شکل میں لے جایا گیا۔ شہر کے لوگوں نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے ان کا خیر مقدم کیا۔

صد سالہ جشنِ ولادت کے دوران مرکزی مجلسِ اقبال کی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری ہوئی اور لاہور میں ایوانِ اقبال کی تعمیر کی خاطر گورنر پنجاب جنرل جیلانی نے الحمرا کی پشت پر ایک پلاٹ عطا کیا۔ ایوان کی تعمیر کے لیے قومی ماہرین تعمیر سے نقشے طلب کیے گئے۔ نقشوں میں انتخاب کے لیے کمیٹی کے سربراہ چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین تھے۔ انہوں نے جو نقشہ پسند کیا، وہی جنرل ضیاء الحق نے قبول کیا۔ ایوانِ اقبال کی عمارت کی تعمیر کے لیے ''زمین پھاڑنے'' کی تقریب غالباً ۱۹۷۸ء میں میرے ہاتھوں انجام پائی۔ ایک چاندی کے بیلچے سے میں نے زمین پھاڑ دی مگر صوبائی بیوروکریسی نے اس تاریخی واقعے کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا، نہ وہ بیلچہ محفوظ رکھا گیا اور نہ اس جگہ میرے نام کے نصب کردہ کتبے کا کوئی نام و نشان ہے۔ تصویریں تک غائب کر دی گئیں۔ ہاں، ایوان کے سنگِ بنیاد رکھنے کے بارے میں شاید میاں نواز شریف کا کتبہ ضرور نصب ہے۔ بات یہ ہے کہ جس طرح ہماری عدلیہ میں کمزوریاں ہیں، اسی طرح بیوروکریسی بھی وقتی یا سیاسی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ انہیں اس بات کی اہمیت کا کوئی احساس نہ تھا کہ ایوانِ اقبال کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے سے پیشتر ''زمین پھاڑنے'' کی رسم علامہ اقبال کے فرزند سے ادا کروائی گئی تھی جس کے نام پر ''جاوید نامہ'' لکھا گیا اور اگر اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو قائم رکھا تو پانچ سو یا ہزار برس گزرنے کے بعد کی نسلیں ہماری نسل کو خراجِ تحسین پیش کریں گی کہ اس نے ان کے لیے تاریخ سازی کا کام انجام دیا۔

اقبال میوزیم کے قیام کے لیے ''جاوید منزل'' وفاقی حکومت نے مجھ سے قیمتاً خرید لی اور میں نے علامہ اقبال سے متعلق نوادرات میوزیم کے حوالے کر دیئے۔ اپنی رہائش گاہ کے لیے میں نے گلبرگ میں اراضی خرید کر نئے گھر کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا (چند برس بعد سیالکوٹ میں علامہ اقبال کا آبائی گھر بھی میرے تایازاد بھائیوں اور بہنوں سے خرید کر وفاقی حکومت نے میوزیم بنا دیا)۔

''جاوید منزل'' کی خرید کے بارے میں صوبائی بیوروکریسی نے مجھے جن چکروں میں ڈالا، ان کا ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ قیمت کم کرانے کی خاطر مجھے دھمکایا گیا کہ ملک میں مارشل لا لگا ہے، اگر حکومت کی قائم کردہ رقم وصول نہ کرو گے تو زبردستی یا ریکیوزیشن کر کے عمارت پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ پیغام مجھے گورنر پنجاب اسلم ریاض حسین کی طرف سے ملا اور میں نے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کو آگاہ کر دیا۔ انہوں نے بات آگے جنرل ضیاء الحق تک پہنچا دی۔ نتیجہ میں اوپر سے حکم آیا کہ جس رقم کا میں تقاضا کر رہا ہوں، ادا کر دی جائے اور معاملہ ختم ہو گیا۔ میری دوسری شرط یہ تھی کہ جب تک میرا اپنا گھر نہیں بنتا، مجھے جی او آر میں کوئی سرکاری گھر کم از کم ایک برس کی مدت تک رہائش کے لیے الاٹ

کیا جائے۔ (اپنے گھر کی عدم موجودگی میں کسی ایسے سرکاری گھر میں رہائش ویسے بھی بحیثیت ہائی کورٹ جج میرا حق بنتا تھا) مگر چیف سیکرٹری پنجاب کی طرف سے اطلاع ملی کہ جی او آر میں کوئی گھر خالی نہیں، البتہ حکومت میرے لیے کرایہ کا ایک گھر (تجویز کردہ گھر کا کرایہ پچاس ہزار روپیہ ماہوار تھا جو حکومت ادا کرنے کو تیار تھی) لے سکتی ہے جو والٹن (نزد ماڈل ٹاؤن) میں واقع ہے۔ والٹن کا علاقہ ویسے بھی ہائی کورٹ سے خاصا دور تھا۔ پھر بھی میری بیوی وہ گھر دیکھنے کے لیے گئیں۔ پتا چلا کہ کسی فلم اسٹار کی ملکیت ہے جو غالباً صوبائی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی جاننے والی ہیں، اگرچہ یہ تکون (یعنی گورنر پنجاب، چیف سیکرٹری اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر) نہایت مستحکم تکون تھی، اس کے باوجود میں نے مولوی مشتاق حسین کو تمام حقائق سے آگاہ کر دیا۔ بات پھر اوپر گئی اور پلک جھپکتے ہی مجھے جی او آر میں مال روڈ کے اوپر ایک برس کی مدت تک رہائش کے لیے نہایت نفیس بنگلہ مل گیا۔ مولوی مشتاق حسین کے حق میں میرا ایثار میرے کام آیا ورنہ کمزور گورنر کے مقابلہ میں صوبہ کے چیف سیکرٹری اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تو مجھے اپنا ہاتھ دکھا گئے تھے۔

۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشنِ ولادت کے سلسلے میں مجھے دو بار پاکستان سے باہر جانا پڑا۔ پہلی مرتبہ امریکن انسٹیٹیوٹ فار پاکستان سٹڈیز اور برکلے یونیورسٹی کی جنوب ایشیا کی فیکلٹی کے اقبال سے متعلق سیمینار میں شرکت کے لیے میں نیویارک اور واشنگٹن گیا۔ اس سیمینار کا اہتمام ڈاکٹر حفیظ ملک نے کیا تھا۔ سیمینار سے فراغت کے بعد میں نے چند ہفتے ان کے ساتھ ان کی یونیورسٹی ولانووا (پان سلوینیا) میں گزارے۔

دوسری مرتبہ میں اور میری بیوی ناصرہ پاکستان ہائی کمیشن کی دعوت پر علامہ اقبال سے متعلق تقریب میں شرکت کے لیے دہلی گئے۔ تقسیم کے بعد میں پہلی مرتبہ (تیس برس بعد) بھارت گیا تھا۔ دہلی کی تقریب میں اندرا گاندھی اور واجپائی بڑے تپاک سے ملے۔ علاوہ ان کے بھارت میں اقبال شناسوں یعنی جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، اسلوب احمد انصاری وغیرہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں واجپائی بھارت کے وزیر خارجہ تھے، اندرا گاندھی اپوزیشن لیڈر تھیں اور مرار جی ڈیسائی وزیر اعظم تھے (واجپائی پاکستان بھی تشریف لائے تھے اور جنرل ضیاء الحق کو بھارت میں بنی علامہ اقبال پر فلم پیش کی تھی) میں نے اندرا گاندھی سے کہا کہ جب اگلی مرتبہ لاہور تشریف لائیں تو ہمارے یہاں ٹھہریں۔ انہوں نے قریب کھڑے واجپائی کی طرف دیکھ کر طنزاً کہا کہ پہلے ان سے میرا پاسپورٹ واپس دلوائیے۔

ہم نظام الدین اولیاء گئے اور خواجہ حسن نظامی ثانی نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ وہاں موجود قوالوں نے جب علامہ اقبال کی نظم

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رُوسیاہی

سنائی تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے نظام الدین اولیاء کی تربت پر بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل امن اور دوستی کی دعا کی۔ بعدازاں غالب کے مزار کی زیارت کی اور ان کے ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی۔

جب مرار جی ڈیسائی کو معلوم ہوا کہ ہم لوگ دہلی آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے مجھے اور ناصرہ کو بلوا بھیجا۔ اتفاق سے اسی شام ہمیں واپس لاہور آنا تھا۔ ایک بجے دوپہر ملاقات کا وقت طے ہوا۔ لیکن مرار جی ڈیسائی کا ہوائی جہاز لیٹ ہو گیا۔ بہرحال ہم نے اپنا سامان موٹر کار میں رکھا اور ایئرپورٹ جاتے ہوئے رستہ میں وزیراعظم کے دفتر میں ان سے ملاقات کی۔ مرار جی ڈیسائی بڑی شفقت سے ملے اور اس بات پر خفا ہوئے کہ میں تیس برس بعد دہلی آیا ہوں۔ فرمایا کہ پاکستان بننے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہمارے آپس میں فاصلے اس قدر بڑھ جائیں۔ آپ نے بنگلہ دیش بنوانے میں اندرا گاندھی کے کردار پر بھی سخت نکتہ چینی کی۔ کہنے لگے کہ اندرا نے یہ کام کر کے نہ صرف ایک کی بجائے دو پاکستان بنا دیئے اور ہماری مشکلات میں اضافہ کر دیا بلکہ مستقبل میں بھارت کے ٹوٹ سکنے کا امکان بھی پیدا کر دیا۔ مرار جی ڈیسائی بیاسی برس کی عمر میں بڑی عمدہ صحت کے مالک تھے۔ ناصرہ ان سے پوچھ بیٹھیں ”آپ کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے، اس کا کیا راز ہے۔“ میں یکدم گھبرا گیا کہ کہیں ڈیسائی انہیں یہ جواب نہ دے دیں کہ میری صحت کا راز یہی ہے کہ میں روزانہ باقاعدگی سے اپنا پیشاب پیتا ہوں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ انہوں نے فرمایا: ”راز یہی ہے کہ میں ”کھدا“ پر بھروسا رکھتا ہوں۔ آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا، لیکن جب موسم کی خرابی کے سبب ہوائی جہاز لیٹ ہو گیا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر ”کھدا“ کو منظور ہوا تو آپ سے ملاپ ہو جائے گا اور ویسے ہی ہوا۔“

لاہور ہائی کورٹ میں چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سربراہی میں بینچ نے بھٹو کا ٹرائل شروع کر رکھا تھا۔ ان دنوں پاکستان کے وزیر خارجہ آغا شاہی تھے۔ انہوں نے اتفاق سے مجھے فون کیا۔ فرمایا: ”یو این میں پاکستانی وفد کے رکن کے طور پر نیویارک جانا پسند کرو گے؟“ میں نے حامی بھر لی کیونکہ اس مقدمے کے دوران میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ لاہور میں موجود رہوں۔ ستمبر ۱۹۷۷ء کے وسط میں میں نیویارک روانہ ہو گیا۔ ناصرہ بھی منیب (بعمر ۱۲ برس) اور ولید (بعمر ۱۰ برس) دونوں کو ساتھ لے کر یورپ کی سیر کو نکلیں۔ اٹلی، فرانس، ہالینڈ، ڈنمارک اور برطانیہ سے ہوتی ہوئیں وہ نیویارک پہنچ گئیں۔ پھر بچوں کو نیاگرا

کی آبشاریں دکھانے اور فلوریڈا میں ڈزنی لینڈ کی سیر کرانے لے گئیں۔ میں نے نیویارک میں ان سب کے لیے ایک بڑا فلیٹ لے رکھا تھا۔ چند ہفتے بچوں نے نیویارک اور حفیظ ملک کے ساتھ ولانووا میں گزارے۔ فلاڈیلفیا اور واشنگٹن میں تاریخی مقامات دیکھے اور پھر ہم نے بچوں کو واپس لاہور بھیج دیا۔ دونوں بچے ایئر ہوسٹسوں کی تحویل میں ایک طرح سے اکیلے گئے کیونکہ ناصرہ کا خیال تھا کہ یوں ان میں خوداعتمادی پیدا ہوگی۔ رخصت کے وقت ناصرہ نے بچوں سے کہا کہ اگر ہوائی جہاز ہائی جیک ہو جائے تو رونا نہیں، دونوں نے اپنی اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا نہیں روئیں گے۔ ناصرہ بھی چند ہفتے مجھ سے پیشتر لاہور پہنچ گئیں کیونکہ جی او آر میں ہم نے سرکاری گھر میں منتقل ہونا تھا۔

''جاوید منزل'' میں علامہ اقبال میوزیم کا افتتاح جنرل ضیاء الحق نے ایک نہایت سادہ اور پروقار تقریب میں کیا۔ میوزیم کی تزئین جاپانیوں نے اپنے انداز میں کر رکھی تھی۔ جنرل ضیاء الحق اور دیگر مدعوئین نے میوزیم کی سیر کی اور یوں یہ مرحلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہوا۔ ایک برس سرکاری گھر میں قیام کے بعد ناصرہ کی ہمت سے گلبرگ میں ہم اپنا گھر تعمیر کرنے میں کامیاب ہوگئے اور ۱۹۷۸ء میں اس میں رہائش اختیار کر لی۔

لاہور ہائی کورٹ کے مقدمے میں چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین کی سربراہی میں بینچ نے بھٹو کو مجرم قرار دے کر انہیں پھانسی کی سزا سنائی۔ بینچ کے دیگر جج صاحبان تھے: ذکی الدین پال، ایس ایم ایچ قریشی، گلباز خان اور شاید کرم الٰہی چوہان۔ فیصلہ متفقہ تھا۔ (جیسے میں عرض کر چکا ہوں کہ مولوی مشتاق حسین دوستی کے ساتھ دشمنی بھی پوری طرح نبھاتے تھے۔ دشمنوں کو کبھی معاف نہ کرتے تھے۔ مثلاً جب چیف جسٹس نامزد ہوئے تو حلف لینے گورنر ہاؤس جانے سے صاف انکار کر دیا کیونکہ گورنر اسلم ریاض حسین کو ان کا حق مارنے والا دشمن سمجھتے تھے، چنانچہ گورنر کو ہائی کورٹ میں آ کر انہیں چیف جسٹس کا حلف دلانا پڑا۔) سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل چیف جسٹس انوارالحق کی قیادت میں فل بینچ نے اکثریت کی بنا پر نبٹا دی۔ ریویو ناکام رہا اور رحم کی اپیل بھی خارج ہوگئی۔ فوجداری قوانین کے ضابطے اور فیصلہ شدہ نظیروں کے مطابق یہ درست فیصلہ نہ تھا۔ اس لیے آج تک کبھی کسی ایسے کیس میں نظیر کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا۔

مجھے اپنی زندگی میں چند مشاہدات نے ''عالمِ ارواح'' کے وجود کا قائل کر دیا ہے۔ اس ضمن میں پہلا واقعہ تو بھٹو کو پھانسی دیئے جانے سے متعلق ہے۔ ہم میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ بھٹو کو کب پھانسی دی جائے گی۔ مگر ماہ اپریل کے اوائل میں ایک شب میں اور ناصرہ سو رہے تھے کہ کوئی تین بجے کے قریب اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اوڑھی ہوئی چادر میرے اوپر سے کھینچ کر پرے پھینک دی ہے۔ میں ہڑبڑا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ کھلے کالر اور کھلے کفوں کی قمیض اور شلوار پہنے بھٹو نہایت تلخ لہجے

میں مجھے انگریزی میں بتا رہے ہیں" لک واٹ دے ہیوڈن ٹومی" (دیکھو انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے) ناصرہ بھی جاگ اٹھیں۔ کہنے لگیں کہ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟ میں نے جواب دیا" ابھی ابھی بھٹو یہاں موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پھانسی دے دی گئی ہے۔"

دوسرا واقعہ میرے پرانے دوست منور حسین بخاری کی موت کا ہے۔ اس رات ہمارا چھوٹا بیٹا ولید ہوائی جہاز پر نیویارک سے لاہور آ رہا تھا۔ ناصرہ کسی کام سے اسلام آباد گئی ہوئی تھیں اور میں خوابگاہ میں اکیلا تھا۔ رات کے کوئی دو بجے کے قریب مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ میں نے پہلی کھٹکھٹاہٹ تو شاید خواب میں سنی مگر دوسری بار کھٹکھٹاہٹ کے وقت میں یقیناً جاگ رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور سمجھا کہ ممکن ہے باہر تیز ہوا چل رہی ہو۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، مگر ہر طرف خاموشی اور رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر جس دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہوئی تھی، میں نے کھول کر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میں ڈر گیا اور طرح طرح کے وسوسوں نے مجھے آ لیا۔ یہی دعا کرتا رہا کہ خداوند تعالیٰ ولید کا نگہبان ہو اور وہ بخیر و عافیت لاہور پہنچ جائے۔ اگلے روز صبح ہمارے بڑے بیٹے منیب نے مجھے فون پر بتایا کہ گزشتہ شب دو بجے میرے دوست منور حسین بخاری حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو گئے اور چار بجے بعد از دوپہران کا جنازہ ہے۔

میرے مشاہدے سے یہ تو ثابت ہو جاتا ہے کہ جب کسی کی روح اس جہان سے پرواز کرتی ہے تو جاتے جاتے جسے چاہے اسے کسی غیر مادی یا مادی ذریعہ سے اپنی رخصت کی اطلاع دے دیتی ہے، مگر اس کے بعد وہ کہاں جاتی ہے؟ اس کے بارے میں قیاس یا ایمان کا سہارا ہی لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پھر اس سے ملاقات شاذ و نادر یا تو خوابوں میں ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔

ایک اور مسئلہ غور طلب ہے۔ جسم کے اندر روح کا مقام کہاں ہے؟ کیا روح دراصل ذہن ہے جو دماغ میں مقید ہے یا روح کا مسکن قلب ہے؟ ذہن اگر بیمار ہو جائے تو کیا روح بھی بیمار تصور کی جائے گی؟ مجھے اپنے دوست اور تایازاد بھائی مختار کی یاد آ گئی۔ ان کی وفات بیاسی برس کی عمر میں ہوئی اور وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے تھے۔ میں ان کی بیمار پرسی کے لیے گیا اور ان کا حال پوچھا۔ نہایت تکلفانہ انداز میں جواب دیا۔ "شکر الحمدللہ میں بخیریت ہوں" قریب کھڑے بیٹے نے بتایا" ابا جان! یہ چچا جاوید ہیں۔ آپ نے انہیں پہچانا نہیں؟" اس پر یکدم مجھے پہچان کر گلے لگا لیا اور زار و قطار رونے لگے۔ میں انہیں دلاسا دیتا رہا۔ اسی کشمکش میں تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے اور ان کا رونا نہ تھما۔ پھر اچانک مجھے اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر فرمایا" آپ سے تعارف نہیں ہوا؟ آپ کون ہیں؟" چند روز بعد وہ فوت ہو گئے۔ کیا ان کی روح نے یادداشت سے محرومی کی کیفیت میں قفس عنصری سے پرواز کی؟ کیا روح نکلتے وقت جسمانی نہ سہی، اپنی ذہنی بیماری ساتھ لے جاتی ہے؟

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

باب ۹

نظریہ سے انحراف

قائداعظم کے نزدیک پارلیمانی جمہوری طرز حکومت کا قیام' بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ' شہریوں میں عدم امتیاز کی بنیاد پر مساوات' معاشی انصاف کی فراہمی اور قانون کی حاکمیت اسلام ہی کے اصول تھے۔ مگر ان کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ان نظریات سے انحراف کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ''قراردادِ مقاصد'' کے ذریعے ان اصولوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی لیکن پاکستان کا دستور بنانے میں کئی برس لگ گئے۔ خدا خدا کر کے جب دستور بنا بھی تو تھوڑے عرصہ بعد کالعدم قرار دے دیا گیا۔ سیاستدانوں پر بیوروکریسی غالب آئی اور بیوروکریسی پر فوج' ملک مین مارشل لا لگا دیا گیا۔ پھر مارشل لاؤں کے دور شروع ہوئے جن کا تسلسل بھٹو کی جمہوری حکومت سے ٹوٹا' لیکن اس کے ساتھ ہی پاکستان دولخت ہوگیا۔ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ بھٹو یا مجیب الرحمٰن یا جنرل یحییٰ خان یا اندرا گاندھی؟ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اس سانحہ کی ذمہ دار دراصل ہم میں رواداری کی عدم موجودگی تھی۔ ہم ''جمہوریت جمہوریت'' کے نعرے تو بلند کرتے رہے لیکن جمہوری کلچر پیدا نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ کہ جس جمہوریت کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا تھا' اسی جمہوریت نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بھٹو جاتے جاتے ہمیں اسلام کے نام پر چند مزید ایسے تحفے ''عطا'' کر گئے جن سے قائداعظم کی ''جدید لبرل اسلامی فلاحی جمہوریت'' کے تصور کو نقصان پہنچا۔ رجعت پسند مذہبی عناصر' جن کے ''جن'' کو قائداعظم کی بلند قامت شخصیت نے بوتل میں بند کر رکھا تھا' رہائی اور زبان مل گئی اور بچے کھچے پاکستان میں علاقہ پرستی' مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ تعصّبات نے فروغ پانا شروع کر دیا۔ بات یہ بھی ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی اپنی نام نہاد نظریاتی اساس کی اصطلاحیں مثلاً ''جدید''، ''لبرل''، ''اسلامی''، ''فلاحی''، ''جمہوریت'' کی صحیح طور پر تشریح نہیں کر پائے۔ ہم کہہ تو دیتے ہیں کہ ہم ''جدید'' ہیں مگر درحقیقت ہم عاشق ''قدیم'' ہی کے ہیں۔ اسی طرح بظاہر ہم ''لبرل'' بھی بنتے ہیں' لیکن اندر سے ہمارے دل قدامت پسندی' تقلید اور فرقہ وارانہ تعصب کی دلدل میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ان سے نکلنا محال ہے۔ دراصل

ہم نہ تو جدید ہیں' نہ لبرل' نہ جمہوریت نواز' نہ فلاح پسند' بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ہم صحیح معنوں میں اسلام کے پیروکار بھی نہیں۔ شاید اسی سبب پاکستانی اسلام ہماری قومی یکجہتی اور اتحاد کا باعث نہیں بن سکا۔ ہم ''ملتِ مسلمین'' کہلانے کے مستحق نہیں۔ ہم تو محض فرقوں' قومیتوں اور قبیلوں پر مشتمل ''ہجوم مسلمین'' ہیں۔

اسی پس منظر میں جنرل ضیاء الحق نے اقتدار غصب کرتے ہی ایک نئے تجربے کی ابتدا کی۔ انہوں نے پاکستانیوں کو اچھے مسلمان بنانے کی خاطر بھٹو کی عطا کردہ اصلاحات (قادیانیوں کو اقلیت قرار دو' جمعے کی چھٹی کرو' گھڑ دوڑ بند کرو' شراب بند کرو) کی سمت میں مزید آگے قدم بڑھانے کی ٹھانی۔ اس کے نتیجے میں قادیانیوں پر اسلامی شعائر استعمال کرنے کی پابندی لگا دی گئی۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں تمیز کرنے کی خاطر ہر قسم کے فارموں میں مذہب کا اندراج کرنا ضروری قرار پایا۔ کسی منصب کا حلف لیتے وقت بھی یہ حلفی بیان دینا اہم تھا کہ محلف قادیانی نہیں ہے۔ وغیرہ۔ علاوہ ان کے قرونِ وسطیٰ کے عہد کے فقہی اسلام کی کڑوی دوا کی چند خوراکیں پاکستانیوں کو پلوانے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ''توہینِ رسالت'' کا قانون بنا جس کے سبب غیر مسلم اقلیتوں میں خوف و ہراس پھیلا' شریعت کورٹ قائم ہوا' جہاں خصوصاً سرقہ' حرابہ' زنا وغیرہ کے کیس سنے جاتے تھے اور مجرموں کو اسلامی سزائیں دی جانی مقصود تھیں (جو ثبوت کا معیار بہت مشکل ہونے کے سبب آج تک نہیں دی گئیں) اس عدالت کے جج صرف مسلمان ہو سکتے تھے اور صدر جنرل ضیاء الحق کے رحم و کرم پر تھے' چونکہ وہی ان کو مقرر کرنے اور ہٹانے کا اختیار رکھتے تھے۔ گویا ان اسلامی ججوں کو وہ آزادیٔ ضمیر بھی حاصل نہ تھی جو سیکولر عدالتوں کے ججوں کو ''معلق'' دستور کے تحت حاصل تھی۔ علاوہ اس کے اس عدالت کو اسلامی عائلی قوانین اور مالی معاملات سے متعلق کیس سننے کا اختیار بھی نہ تھا۔ پہلے یہ تجربہ کیا گیا کہ ہائی کورٹوں ہی میں شریعت بینچ بنا دی جائے اور ابتدائی دور میں ہائی کورٹ لاہور کے دو ججوں پر مشتمل شریعت بینچ میں میں سینئر جج کے طور پر بیٹھا تھا' لیکن بعد ازاں بعض علماء کے مشورے پر اس عدالت کو علیحدہ فیڈرل نوعیت کا بنا دیا گیا۔

جہاں تک اسلامی قانون سازی کا تعلق ہے' اس ضمن میں حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا۔ نیز ضابطہ قانونِ شہادت میں عورت کی گواہی نصف کر دی گئی اور چند مزید ایسی تبدیلیاں لائی گئیں جو آج کے زمانے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں۔ ضربِ خفیف اور ضربِ شدید کے قانون میں بھی آنکھ کے بدلے آنکھ کے اصول پر تبدیلیاں ہوئیں جن کے تحت سزا دیتے وقت ججوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

خیر یہ تو مختصر سا خاکہ اس ''اسلامائزیشن'' کا ہے جو جنرل ضیاء الحق نے ملک میں نافذ کی۔ مگر ہم پر ان اصلاحات کا نہ تو کوئی روحانی اثر ہوا اور نہ اخلاقی' بلکہ سنگین جرائم میں کمی کی بجائے روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پاکستان میں خصوصی طور پر عورتوں سے متعلق کئی نئے قسم کے جرائم مشاہدے میں آئے جن کی پہلے کوئی

مثال موجود نہ تھی۔ مثلاً پنجاب میں مردہ خواتین کو قبروں سے نکال کران کے ساتھ زیادتی کرنے کے دو واقعات پیش آئے اور شرعی عدالت کے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ جرم ''زنا'' بنتا ہے یا نہیں۔ پھر مخالف پارٹی کے مردوں نے کسی خاندان کی خواتین کو (بوڑھی عورتوں' جوان اور چھوٹی عمر کی بچیوں سمیت) الف ننگا کر کے انہیں بازار میں نچوایا اور مردوں نے مل کران کے اردگرد بھنگڑا ڈالا۔ نیز حدود آرڈیننس کا بالخصوص عورتوں کے معاملے میں غلط استعمال کیا گیا۔ بطور جج لاہور' بہاولپور' ملتان اور راولپنڈی کے بنچوں پر میرے سامنے مستغیث پارٹی اور پولیس کی اس دیدہ دانستہ دھاندلی کے بعض ایسے کیس آئے کہ میں حیران رہ گیا۔ چند مثالیں پیش ہیں:

بہاولپور کے کسی کالج میں ایک طالبہ اپنے پروفیسر سے کسی سوال کا جواب پوچھنے کی غرض سے اس کے کمرے میں گئی۔ اس پر کسی مذہبی جماعت سے تعلق رکھنے والے چند طلباء نے کمرے کو باہر سے مقفل کر دیا اور ساتھ کی مسجد کے امام کو بلوا کر ایف آئی آر میں اس کی گواہی دلا دی کہ اس نے پروفیسر کو کمرے میں طالبہ کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے۔ دونوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ وہ دس بارہ دن جیل میں رہے کیونکہ سیشن کورٹ کو ضمانت دینے کا اختیار نہ تھا اور ہائی کورٹ کی بینچ نے بہاولپور ابھی آنا تھا۔ بہرحال میرے سامنے ان کی ضمانت کا کیس لگا۔ میں نے امام مسجد سے علیحدگی میں پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا۔ اس کا جواب تھا کہ جب طلباء نے کمرے کا دروازہ کھولا تو دونوں سخت پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے اور غصے میں تھے۔ ''مگر آپ کا تو بیان ہے کہ آپ نے زنا ہوتے دیکھا ہے؟'' ''سچی بات ہے' میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا مگر لڑکے کہہ رہے تھے کہ زنا ہوا ہے اور میں نے بھی یہی کہہ دیا۔ بعد ازاں جس مذہبی ادارے سے میرا تعلق ہے انہوں نے مجھے ڈرایا کہ جو بیان میں نے پولیس کو لکھوایا ہے اس سے نہ پھروں ورنہ مجھے سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

خانپور کے کسی قریبی گاؤں میں ایک نوجوان کی شادی ہوئی جو دُبئی میں ملازمت کرتا تھا۔ پندرہ یوم کی تعطیل کے بعد دُبئی جانے کے لیے کراچی پہنچا اور ساتھ بیوی اور اپنے بوڑھے باپ کو کراچی سیر کرانے کی خاطر لے آیا۔ دن بھر تینوں کراچی کی سیر کرتے رہے۔ ہوائی جہاز پر چڑھنے سے پیشتر اس نے بیوی اور باپ کو کراچی سے خانپور جانے والی ٹرین میں چڑھایا اور خود ہوائی جہاز پکڑ کر دُبئی روانہ ہو گیا۔ ٹرین لیٹ ہو گئی اور آٹھ بجے رات خانپور پہنچنے کی بجائے بارہ بجے رات وہاں پہنچی۔ اس وقت کوئی بس انہیں خانپور سے اپنے گاؤں لے جانے والی نہ مل سکی۔ بہ امر مجبوری انہیں ریلوے سٹیشن کے قریب کسی سرائے میں رات گزارنی پڑی۔ لڑکی کمرے میں تنہا سونے سے ڈرتی تھی۔ اس لیے اس کا سسر بھی نیچے فرش پر چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ رات دو بجے کے قریب سرائے کا مالک تھانہ دار کو ساتھ لے کران کے کمرے میں آیا اور رپٹ

لکھوائی کہ اس نے دونوں کو زنا کرتے دیکھا ہے۔ دونوں گرفتار کر لیے گئے اور ہفتہ بھر جیل میں رہے کیونکہ سیشن جج کو ضمانت لینے کا اختیار نہ تھا' لہٰذا انہیں بھی ضمانت پر میں نے رہا کیا۔

گوجرانوالہ میں کسی میونسپل الیکشن کے امیدوار نے پولیس اسٹیشن میں اپنے مخالف امیدوار م ش کے خلاف رپٹ لکھوائی: ''میں شام کو چہل قدمی کے لیے باہر نکلا تو اپنی بیٹھک کے سامنے ایک جھونپڑی سے مجھے کوئی گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ میں نے دروازے کی دراڑ سے جھانک کر اندر دیکھا تو م ش خانہ بدوشوں کی عورت سے زنا میں مشغول تھا۔ میں بازار میں تین چشم دید گواہوں کی تلاش میں نکلا تا کہ انہیں بھی زنا ہوتے دکھا سکوں' چنانچہ میں تین افراد کو اپنے ساتھ جھونپڑی کے دروازے پر لے آیا اور ان تینوں نے بھی میرے ساتھ دراڑ سے جھانک کر زنا ہوتے دیکھا۔ پھر یکدم ہم نے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا۔ م ش تو بھاگنے میں کامیاب ہو گیا لیکن عورت کو ہم نے قابو کر لیا۔'' (بعدازاں پولیس نے م ش کو اس کے گھر سے گرفتار کیا۔ عورت تو پہلے ہی گرفتار تھی) لہٰذا ان دونوں کے خلاف حدود آرڈیننس (زنا کے جرم میں) کے تحت پرچہ کاٹ دیا گیا۔ ان کی ضمانت کا کیس میں نے لاہور میں سنا۔ میں نے مستغیث سے چند سوال پوچھے: ''وقوعہ دیکھنے کے بعد تمہیں بازار میں تین چشم دید گواہ ڈھونڈنے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟'' جواب تھا: ''تقریباً بیس پچیس منٹ'' ''اور کیا ان بیس پچیس منٹوں میں زنا کا عمل بدستور جاری رہا؟'' ''جی ہاں۔'' ''جب تم لوگوں نے دھکا مار کر دروازہ کھول دیا تو تم چار آدمیوں سے ملزم م ش موقع پر کیوں نہ پکڑا گیا؟'' ''دراصل وہ ہمیں دیکھ کر پہلے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا' صرف عورت ہی بیٹھی رہی۔''

آخری واقعے کا تعلق ''غیرت کی خاطر قتل'' سے ہے اور یہ بھی بہاولپور ضلع کا کیس تھا۔ اس کیس میں ملزم نے پہلے تو اپنے مخالف کو کسی کھیت میں بندوق کی گولیوں سے قتل کیا' پھر گھر واپس آ کر اپنی بارہ سالہ نابینا بیٹی کو اسی بندوق کی گولیوں سے مار کر ڈھیر کر دیا۔ بعدازاں بچی کی لاش کو اٹھا کر کھیت میں لے گیا اور اپنے مخالف کی لاش کے ساتھ اسے لٹا دیا تا کہ اپنے دفاع میں کہہ سکے کہ میں نے غیرت کی بنا پر دونوں کو قتل کر دیا ہے۔ مگر جب اس نے گھر آ کر اپنی بیٹی کو قتل کیا تو بندوق کی گولیاں ساتھ کھڑی اس کی بھینس کو بھی لگیں۔ اندھی بچی کی طرف توجہ دینے کی بجائے اسے اپنی بھینس کی زیادہ فکر تھی اور یوں چند گواہوں نے یہ سارا عمل دیکھ لیا۔ اس نے بچی کو اس لیے ٹھکانے لگایا کہ وہ اندھی ہونے کے سبب ایک بوجھ تھی' لہٰذا وہ اس کے اسی کام آ سکتی تھی۔ میں نے اپیل میں اس کی پھانسی کی سزا برقرار رکھی۔

پاکستان اور بھارت میں جو ''قدر'' مشترک ہے' وہ یہی ہے کہ دونوں ملکوں کی عورت مظلوم ہے۔ اسی لیے انگریز کے بنائے ہوئے فوجداری قانون میں اسے ہر جنسی جرم میں ملزم نہیں بلکہ مستغیث کا درجہ دیا گیا تھا' مگر حدود آرڈیننس کے تحت اب اسے کسی بھی جنسی جرم میں مرد کے برابر ملزم سمجھا جاتا ہے' بشرطیکہ وہ

ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے کہ جرم کا ارتکاب مرد نے کیا تھا' مثلاً زنا بالجبر کے کیس میں عورت چاہے مستغیث ہی کیوں نہ ہو' وہ زنا کے عمل کا اعتراف تو کرتی ہے' اب اگر جرم کے ارتکاب میں وہ جبر کا پہلو' جج کے مزاج یا ضمیر کے مطابق ثابت نہ کر سکے تو زنا کے جرم میں اسے مرد کے برابر شریک گردان کر سزا دی جاسکتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ مصیبت زدہ عورتیں یا ان کے لواحقین زنا بالجبر کے کیسوں میں رپٹ لکھوانے سے گریز کرتے ہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ حدود آرڈیننس کے باوجود چوری' ڈکیتی اور سفاکانہ قتل کی وارداتیں تو ملک میں خوب بڑھیں' مگر ایسا کوئی جرم کسی بھی اسلامی سزا سے نوازا نہ جاسکا' البتہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے زمانے میں زنا کے الزام میں تعزیر کے تحت اتنی عورتیں جیلوں میں سزا بھگتنے کے لیے گئیں کہ گمان ہوتا تھا کہ پاکستان میں زنا کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔

مختصراً جنرل ضیاء الحق کی ''اسلامائزیشن'' کے تحت مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کچھ اس طرح کی گئی کہ اس سے نہ صرف قومی یکجہتی کے بارے میں قائداعظم کے قائم کردہ اصول کی تحصیل ناممکن ہوگئی بلکہ اقلیتوں میں اپنے حقوق کی پامالی اور عدم تحفظ کا احساس بڑھ گیا۔ اسلامی عدالت (شریعت کورٹ) قائم ہوئی مگر اس کے اختیارات محدود تھے اور ججوں کو ضمیر کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اسلامی برکات کی بجائے تعزیرات کو مقدم سمجھتے ہوئے حدود آرڈیننس نافذ کیا گیا جس کے تحت تعزیر (انسان کے بنائے ہوئے قانون) کی سزا تو آسانی سے دی جاسکتی تھی لیکن ثبوت کے مشکل معیار کے سبب حد (خدا کے بنائے ہوئے قانون) کے تحت سزا دینا ممکن نہ تھا۔ اس لیے آج تک ایسی سزا نہیں دی گئی۔ نیز ضابطہ قانونِ شہادت میں جو ترامیم کی گئیں ان کا اطلاق جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

پس یہ نام نہاد اسلامی اصلاحات دراصل کتابِ قوانین پر ''سرخی پاؤڈر'' (کاسمیٹک) لگانے کے مترادف تھیں۔ ان اسلامی قوانین کے ''دانت'' تو تھے مگر ''نمائشی'' وہ کاٹ سکنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ نیز اصلاحات کا زیادہ زور سزاؤں پر تھا۔ یعنی ''منفی'' پہلو پر۔ ''مثبت'' پہلو پر تبھی ہوتا جب اسلامی برکات سے متعلق اصلاحات نافذ کر کے ابتدا کی جاتی' جن سے غربت اور افلاس کے خاتمے کے لیے اقدام اٹھائے جاتے' مگر اس ضمن میں زکوٰۃ اور عشر وغیرہ کی وصولی سے متعلق جو اصلاحات نافذ کی گئیں' ان سے حاصل کردہ رقوم میں بھی غبن کی شکایات سننے میں آئیں اور مالی امداد مستحقین تک نہ پہنچ سکی۔

۱۹۷۸ء میں مجھے اور میری بیوی ناصرہ کو حکومت ترکی کی دعوت پر ترکی جانا پڑا۔ اس زمانے میں بلند ایجوت ترکی کے وزیراعظم تھے اور ترکی میں پاکستانی سفیر میرے کلاس فیلو شیخ الطاف تھے۔ بڑا شاہانہ سفر تھا۔ ہم لوگ انقرہ سے قونیہ اور قونیہ سے ازمیر اور بالآخر استنبول سے ہوتے ہوئے واپس لاہور پہنچے۔ قونیہ میں مولانا رومی کی برسی کے موقع پر ہم نے نہ صرف ان کے مزار کی زیارت کی بلکہ مزار کے احاطے میں

علامہ اقبال کی فرضی قبر پر بھی تصاویر بنوائیں۔ علامہ اقبال کی فرضی قبر کے متعلق یہی سننے میں آیا کہ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں علامہ اقبال کی تربت سے کچھ خاک اٹھا کر قونیہ لائی گئی اور اسے مولانا رومؒ کے مزار کے احاطے میں دفن کر کے اس پر باقاعدہ سنگ مرمر کی تربتِ اقبال بنادی گئی۔ اس تربت پر فاتحہ بھی پڑھی جاتی ہے۔

اس موقع پر کانفرنس میں میرے مقالے کا موضوع ''رومی کا تصورِ شیطان'' تھا جسے بہت پسند کیا گیا بلکہ میرے اس نکتے پر کہ بقول اقبال قوموں کو لڑانے کی خاطر بعض اوقات شیطان سیاستدانوں سے کام لیتا ہے' ترکی کے ایک سابق وزیراعظم سے جو سامعین میں موجود تھے' نہ رہا گیا اور فرمایا کہ ترک اپنے گزشتہ وزیراعظم میندارس کو موت کے گھاٹ اتار کر سخت پشیمان ہیں۔ پاکستان کو ترکوں سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس قسم کی حرکت سے باز رہنا چاہیے (تب ابھی بھٹو کی اپیل پر حتمی فیصلہ نہ ہوا تھا)۔

اسی کانفرنس میں میری ملاقات ٹیکساس کے کسی آئل فیلڈ کے کروڑ پتی مالک کی بیوہ مسز ڈی مینلز سے ہوئی جنہوں نے یوسٹن شہر میں ایک اپنے انداز کا کلیسا بنوا رکھا تھا جس میں ہر مذہب کے لوگ عبادت کر سکتے تھے۔ مسز ڈی مینلز کی ایک بیٹی کسی ترک سے بیاہی ہوئی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں۔ مسز ڈی مینلز سامی مذاہب میں شیطان کے کردار میں بڑی دلچسپی رکھتی تھیں' اس لیے میرے مقالے سے بے حد متاثر ہوئیں۔ خصوصی طور پر میری اس بات سے کہ رومی' گوئٹے اور اقبال کے نزدیک انسان کے اخلاقی ارتقاء کے لیے خدا کا شیطان کو وجود میں لانا اشد ضروری تھا۔ اس اعتبار سے شر ہی کے ذریعے خیر کا ارتقا ممکن ہے اور علامہ اقبال تو شیطان کو خدا کا راز دان سمجھتے ہیں۔

۱۹۸۱ء میں مسز ڈی مینلز نے مجھے یوسٹن (ٹیکساس) آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنے کلیسا میں ایک کانفرنس ''اسلام کا حاکمیت کے متعلق رویہ'' کے موضوع پر منعقد کر رکھی تھی اور اس میں بہت سے اسلامی اسکالروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں میں نے ''اسلام کے تصورِ حاکمیت'' پر مقالہ پڑھا اور یہاں سعودی عرب کے وزیر خارجہ سعود الفیصل (شاہ فیصل کے صاحبزادے) نے میرا تعارف الجزائر کے سابق قائد بن بیلا سے کرایا' جو اپنی بیوی کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے۔ بن بیلا نے مجھے بتایا کہ الجزائر کی جنگ آزادی کے ایام میں وہ سوشلسٹ اور دہریے تھے۔ بعد ازاں جب انہیں معزول کر کے فوج نے قید کر دیا تو ان کے وکیل کی ایک جونیئر خاتون وکیل' جیل میں آ کر ان سے بریف لیا کرتی تھیں۔ اس خاتون وکیل نے انہیں علامہ اقبال کے کلام کے فرانسیسی ترجمے سے متعارف کرایا اور وہ کلام اقبال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دوبارہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اب وہی خاتون وکیل ان کی بیوی ہیں۔ بن بیلا نے اپنی بیوی سے مجھے ملوایا۔ ہم ہفتہ بھر یوسٹن میں اکٹھے رہے' لیکن ایک دوسرے کے زیادہ قریب اس لیے نہ آ سکے کہ وہ انگریزی نہ بول سکتے تھے اور میں فرانسیسی اور عربی نہ جانتا تھا۔

۱۹۸۲ء میں میں پھر امریکہ گیا۔ اس مرتبہ مسلم سوشل سائنٹسٹوں کی ایک تنظیم نے مجھے انڈیانا پولس اپنی کانفرنس میں بلوایا۔ یہاں بھی موضوع ''اسلامی ریاست'' سے متعلق تھا۔ انڈیانا پولس میں میرے میزبان ایک امریکی پروفیسر تھے جو اردو بڑی روانی سے بولتے تھے اور جن کی بیوی پاکستانی تھیں۔ کانفرنس کے خاتمے کے بعد امریکہ کی بعض جنوبی ریاستوں کی سیر کی جہاں مجھے پہلے کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا' لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں شہر قریب قریب ایک ہی طرز کے ہیں۔

۱۹۸۲ء میں غالباً امریکہ جاتے ہوئے میں کراچی میں رکا اور شریف الدین پیرزادہ سے (جوان دنوں جنرل ضیاء الحق کی کیبنٹ میں لا منسٹر تھے) ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ باوجود اس کے کہ بعض شخصیات نے روڑے اٹکائے' جنرل ضیاء الحق نے سنیارٹی کی بنا پر مجھے ہی لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بات یہ تھی کہ مولوی مشتاق حسین کے سپریم کورٹ جانے کے بعد شمیم حسین قادری چیف جسٹس بنے۔ لاہور ہائی کورٹ کے دیگر سینئر جج صاحبان بھی سپریم کورٹ جا چکے تھے۔ اس لیے شمیم حسین قادری کے بعد اب میں ہی سب سے سینئر جج تھا۔

ہم میں سے بعض کے لیے یقیناً یہ نہایت کٹھن دور تھا۔ اس عہد میں بہت کچھ ہوا۔ مثلاً مولوی مشتاق حسین کو حلف کے لیے نہ بلوایا گیا۔ دوسری طرف چیف جسٹس انوار الحق نے مولوی مشتاق حسین کی ہمدردی میں یا احتجاجاً حلف لینے سے انکار کر دیا' لہٰذا دونوں فارغ ہو گئے۔ چند برس پیشتر شیخ انوار الحق اور مولوی مشتاق حسین' جنرل ضیاء الحق کے بہت قریب تھے۔ شیخ انوار الحق نے اپنے فیصلہ میں انہیں ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت نہ صرف جائز حکمران قرار دیا تھا بلکہ دستور میں ترامیم کے اختیارات بھی دے رکھے تھے جو انہوں نے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیے۔ مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کو پھانسی کی سزا دے کر جنرل ضیاء الحق کی سب سے بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ لیکن کام نکل چکنے کے بعد دونوں حضرات جنرل ضیاء الحق کے لیے بیکار تھے۔ یہی نہیں بلکہ شمیم حسین قادری نے مولوی مشتاق حسین کو خاصا تنگ بھی کیا اور اپنی میعاد کے ختم ہونے تک انہیں جوڈیشل کالونی میں پلاٹ دینے سے محروم رکھا۔ یہ حق انہیں میں نے ہی دلوایا۔ پاکستانی ہوائی جہاز جنرل ضیاء الحق کے دور میں اغوا ہوا اور مسافروں کو چھڑوانے کے عوض میں پیپلز پارٹی کے قیدی رہا کر کے ہائی جیکروں کو دینے پڑے (یہ لوگ بالآخر لیبیا میں مقیم ہوئے اور کوششوں کے باوجود اب تک پاکستان واپس نہیں آ سکے) بعد ازاں دہشت گردوں کے ہاتھوں مولوی مشتاق حسین زخمی ہوئے اور ان کے ساتھ کار میں سوار چودھری ظہور الٰہی ہلاک کر دیئے گئے۔

بہر حال خدا گواہ ہے' ۱۹۸۲ء میں چیف جسٹس بننے کی خاطر میں نے نہ تو کوئی بھاگ دوڑ کی' نہ گورنر جیلانی یا جنرل ضیاء الحق کو اپنی وفاداری کی کوئی یقین دہانی کرانے کی کوشش کی۔ جنرل ضیاء الحق کے

عہد میں ہر چیف جسٹس کو قائم مقام چیف جسٹس ہی رکھا جاتا تھا۔ اس لیے مجھے بھی گورنر جیلانی نے قائم مقام چیف جسٹس کے طور پر ہی اوتھ دی' البتہ دو سال بعد جب ۱۹۷۳ء کے دستور کو ترامیم کے ساتھ دوبارہ نافذ کیا گیا تو دوسری بار حلف کے موقع پر مجھے چیف جسٹس ہی بنایا گیا۔

ایک بات جس نے ہمیشہ مجھے حیرت میں ڈالا' یہ ہے کہ پاکستان کے حاکم خواہ وہ عسکری جرنیل ہوں یا سیاستدان' کسی اہم امریکی شخصیت کو (اگر چہ وہ اقتدار سے باہر ہو) دیکھ کر ان کی باچھیں کیوں کھل جاتی ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جب جنرل ضیاء الحق نے اسلام آباد میں کسنجر کی ضیافت کی' اس موقع پر مجھے لاہور سے خاص طور پر بلوایا گیا۔ دیگر مہمانوں میں آغا شاہی مجھے یاد ہیں۔ مجھ سمیت سب پاکستانی مہمانوں کو بطور جنرل ضیاء الحق کے خاص دوستوں کے ہنری کسنجر سے متعارف کرایا گیا۔ پھر کسنجر کو قائداعظم پر سٹینلے والپرٹ کی کتاب تحفے کے طور پر پیش کی گئی' حالانکہ اس کتاب پر پاکستان میں پابندی لگائی گئی تھی۔ مجھے کسنجر سے علامہ اقبال کے فرزند کی حیثیت سے ملوایا گیا' لیکن کسنجر کی پاکستان کے بارے میں لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے ہی علامہ اقبال سمجھا۔ (کسنجر کی ضیافت بھٹو نے بھی وزیراعظم بننے کے فوراً بعد گورنر ہاؤس لاہور میں کی تھی اور اپنی تقریر کے دوران اس بات پر پنجابیوں کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انہوں نے علامہ اقبال کے فرزند کے مقابلے میں بھٹو کو کامیاب کرایا۔ ان کی تقریر ریڈیو پر تو براہِ راست نشر ہوئی جو میں نے اتفاقاً سنی' مگر اخباروں میں علامہ اقبال کے فرزند والا فقرہ نکال دیا گیا تھا) ضیافت کے بعد کسنجر کے لیے جنرل ضیاء الحق نے کوئی ''کلچرل'' پروگرام بھی طے کر رکھا تھا جس پر میں اور آغا شاہی مدعو نہ تھے۔ میں نے جنرل ضیاء الحق کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا جتنے اس شب تھے بلکہ معلوم ہوتا تھا گویا وہ زمین پر نہیں ہوا پر چل رہے ہیں۔ ''کلچرل'' پروگرام کس قسم کا تھا؟ کہاں کیا گیا تھا؟ ہم کیوں نہ بلائے گئے؟ ان باتوں کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

میرے چیف جسٹس بن چکنے کے بعد ایک مرتبہ جنرل ضیاء الحق لاہور تشریف لائے اور گورنر ہاؤس میں مجھے لنچ پر بلایا۔ گورنر جیلانی بھی موجود تھے۔ فرمایا: ''آپ کے کورٹ میں بعض جج صاحبان کے متعلق میں نے اچھی خبریں نہیں سنیں۔'' میں نے کہا ''مجھے بتائیے اگر ممکن ہو سکا تو ان کا تدارک کرنے کی کوشش کروں گا۔'' فرمایا: ''میں نے سنا ہے کہ ایک جج صاحب کے چلے جانے کے بعد (جنہوں نے اوتھ لینے سے انکار کر دیا تھا) ان کے چیمبر کی الماری سے پچاس ہزار روپے نکلے تھے۔'' میں نے جواب دیا: ''ہر جج کے پاس ٹین کی ایک سیاہ رنگ کی صندوقچی ہوتی ہے جس میں وہ اہم کاغذات یا مسودات رکھتا ہے۔ یہ صندوقچی گھر سے اس کے ساتھ آتی ہے اور جاتے وقت اس کے ساتھ جاتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک جج جس نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا ہو' گھر جاتے وقت پچاس ہزار روپے اپنی صندوقچی میں ڈال کر

ساتھ لے جانے کی بجائے اپنے چیمبر کی الماری میں چھوڑ جائے گا؟ آپ کو جس کسی نے بھی یہ خبر دی ہے' اس نے جھوٹ بولا ہے۔'' پھر فرمایا: ''ایک جج صاحب کے خلاف یہ شکایت ہے کہ ان کے ذمہ تقریباً ستر فیصلے ہیں جو ابھی تک تحریر نہیں کیے گئے۔'' میں نے جواب دیا ''میں اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے انشاء اللہ یہ شکایت دور کر دوں گا۔''

میں نے جنرل ضیاء الحق کو کیسوں کے حوالے دے کر بتایا کہ کس طرح عورتوں سے متعلق حدود آرڈیننس کو غلط طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور اس ظلم کو روکنے کے لیے کوئی نہ کوئی لیجسلیٹو تدبیر کرنا ضروری ہے۔ مگر میری بات کا جنرل ضیاء الحق پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہوں نے بڑے مربیانہ انداز میں فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب! ہم نے تو علماء کے منشا کے مطابق اپنی طرف سے خلوصِ نیت سے اسلام نافذ کر دیا۔ اب اگر پولیس یا قوم اتنی کرپٹ ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔''

چیف ججی کے چار سالوں کے دوران میں نے چند انتظامی تبدیلیاں کیں' مثلاً ہائی کورٹ کے تمام انتظامی امور اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے میں نے انتظامی کمیٹی کے سینئر ججوں میں بانٹ دیئے۔ عموماً ہر نیا چیف جسٹس اپنی مرضی کا ماتحت عملہ چنتا تھا۔ میں نے یہ پریکٹس ختم کر دی اور جو ماتحت عملہ سابق چیف جسٹس نے مقرر کر رکھا تھا' اسی پر اعتماد کرتے ہوئے اسے کام جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ ہائی کورٹ کے عملے کے کسی بھی فرد کو اگر کوئی بھی شکایت ہو تو مجھ تک براہ راست پہنچ سکتا تھا۔ کورٹ کے جج صاحبان میں گروہ بندی تو پہلے سے ہی ختم ہو چکی تھی۔ میری کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ ہر معاملہ فل کورٹ کے ساتھ بحث مباحثہ کر کے طے کیا جائے۔ یہاں تک کہ نئے ججوں کے تقرر کے لیے سفارشات بھیجنے سے پیشتر میں اپنے ہر رفیق کار سے مشورہ کیا کرتا۔ کورٹ کا ماحول کسی طرح کے کھچاؤ یا آویزش سے پاک تھا۔ بعض اوقات گروہ بندی جج صاحبان میں باہمی آویزش کا باعث بنتی تھی۔ اب کسی جج کو سزا کے طور پر دوسری بنچوں پر لاہور سے باہر نہیں بھیجا جاتا تھا بلکہ اگر کوئی جج اپنی کسی مجبوری کے سبب لاہور سے باہر کسی بنچ پر بیٹھنے کے لیے نہ جا سکتا ہو تو میں اسے مجبور نہ کرتا تھا۔ کسی دوسرے جج کو ان کی جگہ جانے کی استدعا کرتا۔ یہ ایک ایسا مشکل مسئلہ تھا جس کے باعث رنجش پیدا ہونے کا امکان تھا' لہٰذا میں نے کوشش کی کہ وزارتِ قانون رُول میں ''کم از کم ایک سال'' کی بجائے ''زیادہ سے زیادہ ایک سال'' کی مدت تک لاہور سے باہر کسی بنچ پر کام کرنے کی گنجائش پیدا کر دے۔ مگر جنرل ضیاء الحق کو یہ تجویز منظور نہ تھی۔

میرے تجربے میں یہ بات بھی آئی کہ انتظامیہ کسی نہ کسی حیلے سے اپنا کنٹرول عدلیہ پر قائم رکھے ہوئے ہے۔ مثلاً مالی معاملات میں اور اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کی خاطر عدلیہ کا انحصار انتظامیہ پر تو تھا ہی' مگر جو بات مجھے بری لگی وہ یہ تھی کہ کسی ماتحت جوڈیشل آفیسر کو کرپشن کے الزام میں ہائی کورٹ کے

سینئر جج کی انکوائری کے بعد اگر ہٹا دینے کی سفارش کی جائے تو ایسے جوڈیشل آفیسر کی اپیل سننے کا اختیار انتظامیہ نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور اگر وہ اپیل منظور ہو جائے (جو عموماً ہو جایا کرتی) تو چیف جسٹس کو صوبہ کا چیف سیکرٹری کہہ دیتا کہ چونکہ اس کی اپیل منظور ہو چکی ہے' اس لیے اسے دوبارہ جوڈیشل سروس میں تعینات کیا جائے۔ میں نے ایسے کیسوں میں گورنر جیلانی کو صاف کہہ دیا تھا کہ جب ہائی کورٹ کا کوئی سینئر جج کسی ماتحت جوڈیشل آفیسر کو بدعنوانی کے تحت نکالے تو پھر اس کی اپیل اصولاً سپریم کورٹ کے ججوں کو سننا چاہیے۔ لیکن اگر انتظامیہ کا مقرر کردہ اپیلٹ کورٹ کوئی حکم جاری کرے گا تو میں ایسے شخص کو دوبارہ جوڈیشل سروس میں نہ لوں گا بلکہ بہتر ہوگا کہ اسے انتظامیہ ہی میں تعینات کیا جائے۔ گورنر جیلانی ایک شریف انسان تھے۔ میری بڑی عزت کرتے تھے۔ اس لیے میری بات مان لی۔ میرے خلاف بدعنوانی کے الزام میں نکالے گئے بعض جوڈیشل آفیسروں نے مقدمات بھی کھڑے کیے' لیکن وہ ناکام رہے۔

میرے مشاہدے میں بعض اوقات ایسے معاملات بھی آئے جب کوئی جوڈیشل آفیسر کسی نوجوان خاتون کی طلاق کا کیس یا اس کی اپیل محض اس لیے لٹکاتا ہے کہ وہ اس کی ناجائز خواہشات کو پورا کرے۔ ایسے کیسوں میں میں نے بعض جوڈیشل آفیسروں کو چوبیس گھنٹوں کے اندر ٹرانسفر کیے جانے کے احکامات جاری کیے۔ اس ملک میں اگر کوئی خاتون ہمت کر کے بذاتِ خود روزی کمانے کی خاطر نکلے تو اسے قدم قدم پر ''بھیڑیوں'' سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ چھوٹے قصبوں یا شہروں میں عموماً اسکولوں کی استانیاں' زنانہ کالجوں کی نوجوان لیکچرار' ہسپتال کی نرسیں وغیرہ اپنے مقدمات میں سول یا جوڈیشل آفیسروں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں۔ اگر کسی جوڈیشل آفیسر کے متعلق ایسی کوئی شکایت مجھ تک پہنچتی تھی تو میں فوری طور پر ایکشن لیا کرتا تھا۔

میں نے نچلی عدلیہ میں انتظامیہ' حکومت کے ایما یا سفارشی طور پر جوڈیشل آفیسر بھرتی کرنے کا سلسلہ بھی بند کرنے کی کوشش کی۔ اکثر یہ ہوتا تھا کہ چیف جسٹس' وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم یا گورنر یا فوجی صدر کی سفارش پر نچلی عدلیہ میں ان کے تجویز کردہ آدمی بھرتی کر لیا کرتے اور اس طرح میرٹ کی بنا پر امیدوار منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ میں نے سول یا ڈسٹرکٹ ججوں کی حکومت کی طرف سے جاری کردہ خالی آسامیوں پر اخباروں میں اشتہار دے کر امیدواروں کی درخواستیں طلب کیں اور امتحان لینے کا طریقہ جاری کیا۔ درخواست گزاروں کو فوجداری اور دیوانی قانون پر مبنی سوالات کے دو پرچے حل کرنے کے لیے دیئے جاتے۔ پرچے ہائی کورٹ کے سینئر جج ترتیب دیتے اور وہی پرچے مارک بھی کرتے۔ بعدازاں نمبروں کی تعداد کے مطابق لسٹ جاری کر دی جاتی۔ اگر دس آسامیاں خالی ہوتیں تو میرٹ کی بنا پر پہلے دس امیدوار لیے جانے کی حکومت کو سفارش کر دی جاتی۔ اس ضمن میں مجھے اپنے رفقائے کار اور خصوصی طور پر گورنر

جیلانی کا تعاون حاصل رہا اور میرے دور میں استحقاق (میرٹ) کی بنیاد پر ہی ایسی آسامیاں پُر کی گئیں۔ ہائی کورٹ کے نئے ججوں کے انتخاب میں بھی سب سے پہلے استحقاق ہی کا خیال رکھا گیا اور میرے رفقائے کار کے مشوروں سے تقرر کیا جاتا' لیکن ہائی کورٹ سے میرے رخصت ہونے کے بعد نچلی عدلیہ کے جوڈیشل آفیسروں کا امتحان کے ذریعہ طریقۂ انتخاب ترک کر دیا گیا اور وہی پرانا سفارشی طریق کار رائج ہوگیا بلکہ اس طریقہ کار کو رائج رکھنے کے حق میں اس وقت کے ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے سپریم کورٹ میں دلائل بھی دیئے۔

میرے زمانے میں لاہور ہائی کورٹ میں ''بیک لاگ'' میں کیسوں کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار تھی۔ روزمرہ سو سے زائد نئے کیس سننے کے لیے لگائے جاتے۔ دن بھر کام کرنے والے حصے کا بیشتر وقت تو متفرق درخواستیں سننے میں گزر جاتا لیکن پرانے فیصلہ طلب کیس سننے کی باری کم ہی آتی تھی۔ میں نے سفارش کی کہ ہائی کورٹ کے ججوں کی تعداد بڑھا دی جائے کیونکہ اس کے سوا فیصلہ طلب کیسوں کو ختم کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اعلیٰ عدلیہ کے مسائل نبٹانے کے لیے انتظامیہ کو اتنی جلدی نہ تھی۔ یہی صورتحال نچلی عدلیہ میں تھی۔

میں نے ماتحت عدلیہ کے حالات کا جائزہ لینے کی خاطر پنجاب بھر کے دورے کیے اور ضلع ہی نہیں بلکہ تحصیل ''لیول'' تک پہنچا۔ اکثر مقامات پر کمرۂ عدالت جس میں خصوصی طور پر سول جج بیٹھ کر کام کرتے تھے' اس قدر تنگ تھا کہ کھچا کھچ لوگوں سے بھرے ہونے کے سبب وہاں سانس لے سکنا دوبھر ہو جاتا۔ سول جج کو کیس سنتے وقت سارا ریکارڈ خود تحریر کرنا پڑتا اور اردو یا انگریزی ٹائپ رائٹر کی عدم موجودگی میں دن بھر لکھتے لکھتے اس کی انگلیاں ٹیڑھی ہو جاتیں۔ سول جج کے آرام کا کمرہ ہمارے غسل خانہ سے بھی چھوٹا تھا اور پیشاب گاہ' کمرۂ عدالت سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ سول جج یا ڈسٹرکٹ جج کے لیے ٹرانسپورٹ کا کوئی سرکاری انتظام نہ تھا۔ اکثر اوقات جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے بس میں بیٹھ کر ضلع سے تحصیل جاتا تو اسی پبلک ٹرانسپورٹ میں اس کے ساتھ اس کے سامنے پیش ہونے والے سائل بھی سفر کرتے اور یوں اس کے لیے رشوت کا دروازہ کھل جاتا۔ اگر سول جج ایک شہر سے ٹرانسفر ہو کر کسی دوسرے شہر جاتا تو اس کی رہائش کے لیے کوئی معقول سرکاری بندوبست نہ تھا۔ اسے عموماً عارضی طور پر واپڈا یا کسی ایسے ہی ادارے کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا جاتا' جن اداروں کے کیس اس نے سننا ہوتے' مگر اس کے برعکس انتظامیہ کے افسروں مثلاً ڈپٹی کمشنروں' اسسٹنٹ کمشنروں' تحصیلداروں وغیرہ کے استعمال کے لیے سرکاری موٹر کاریں یا جیپیں موجود ہوتیں اور رہائش کے لیے سرکاری انتظامات کیے جاتے۔ ان حالات میں نچلی عدلیہ کے جو جوڈیشل آفیسر رشوت نہیں لیتے تھے' میری نگاہ میں یا تو وہ لوگ روحانی طور پر ''پہنچی'' ہوئی بزرگ ہستیاں

تھیں یا انسانوں کی شکل میں فرشتے۔

سو پاکستان میں اعلیٰ عدلیہ کے تو اپنے مسائل ہوں گے جن کے سبب وہ شاید روز بروز نیچے ہی نیچے چلی جا رہی ہے مگر نچلی عدلیہ کی حالت تو نہایت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ انصاف کرنا تو کجا' کام کر سکنے کے لیے سکون کا ماحول ہی میسر نہ تھا۔ نہ مناسب عدالتی کمرے' نہ ضروریات کا سامان' نہ رہائش گاہوں کی سہولت' نہ ٹرانسپورٹ کا انتظام اور عجیب بات ہے جدید زمانے میں رشوت کی تحصیل کے طریقے بھی جدید ہو گئے۔ میرے مشاہدے میں ایک کیس ایسا لایا گیا جس میں سول جج خاص خاص کیسوں میں رشوت کا مطالبہ صرف فارن کرنسی میں کرتے تھے۔ یعنی رشوت دینے والا فریق ہنڈی کے ذریعہ رقم سٹرلنگ یا ڈالروں کی صورت میں کسی مقررہ شخص کو ملک سے باہر ادا کر دے اور جب اس کی طرف سے ٹیلیفون پر وصولی کی اطلاع آ جائے تو اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا جاتا۔ آج کل تو ہر کسی کا کوئی نہ کوئی عزیز یا رشتہ دار برطانیہ یا امریکہ میں بیٹھا ہے۔ اس لیے رشوت ستانی کے ایسے جدید کیسوں میں گرفت کرنا آسان کام نہ تھا۔ کسی اور کیس میں شکایت موصول ہوئی کہ ڈسٹرکٹ جج صاحب کے چپڑاسی دونوں حریف فریقین کی طرف سے علیحدہ علیحدہ روپے پکڑ لیتے ہیں۔ کیس کا فیصلہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق کیا جاتا ہے' مگر جو فریق کامیاب ہو اس کی ادا کردہ رقم تو رکھ لی جاتی ہے اور جو ہارے اس کی رقم واپس لوٹا دی جاتی ہے۔ ان کی انکوائری ہوئی مگر عدم ثبوت کی وجہ سے بچ نکلے۔ لیکن چونکہ ان کی ''شہرت'' ایک راشی جوڈیشل آفیسر کی تھی' اس لیے میں نے حکومت سے سفارش کی کہ انہیں جوڈیشل سروس سے فارغ کر کے انتظامیہ کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں۔

خدا کا شکر ہے کہ میرا چار سالہ چیف ججی کا دور ہیجانی دور نہ تھا۔ دراصل ہیجان اور اضطراب کے بادل چھٹ چکے تھے اور حالات رفتہ رفتہ عسکریت سے مائل بہ جمہوریت ہوتے جا رہے تھے۔ علاوہ اس کے میں نے کبھی دستوری ماہر یا کانسٹی ٹیوشنل جج ہونے کا دعویٰ نہیں کیا' نہ کسی ایک ہی دستوری مسئلے پر دو متضاد فیصلے تحریر کر کے جیب میں رکھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ میں تو سیدھا سادہ ''کریمنل جج'' تھا اور ''لبرل'' یا ''وسیع النظر'' جج کے طور پر مشہور تھا۔ شک کا فائدہ جہاں اور جس حد تک ممکن ہو سکے' مجرم کو دیتا تھا۔ غصہ میں کبھی نہ آتا تھا۔ صبر و تحمل سے ہر کسی کو سننے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی کوئی وکیل بہت دق کرے تو اس خیال سے کہ کہیں اسی سبب مجھ سے غلط فیصلہ نہ ہو جائے' کیس کسی اور جج کو منتقل کر دیتا تھا۔ عام طور پر پھانسی کی سزا دینے سے گریز کرتا تھا' کیونکہ ایک ڈرامہ نگار' ادیب اور فلسفہ کا طالبعلم ہونے کے ناتے سے میری نظر میں انسان بنیادی طور پر ایک کمزور مخلوق تھا اور اسی سبب جہاں کہیں بھی ممکن ہو سکے۔ رحم اور ''احسان'' کا مستحق تھا۔ میرے اس رویے کے متعلق ایک مرتبہ چیف جسٹس یعقوب علی خان نے ریمارک دیا تھا کہ جاوید اقبال کشمیری ہے' مجرم کو

پھانسی کی سزا دینے سے سمجھتا ہے' گویا اس نے بذاتِ خود مجرم کو موت کی گھاٹ اتارا ہے۔

میں نے بہت کم کیسوں میں مجرموں کو پھانسی کی سزا دی ہے۔ مگر ایک کیس جس میں پھانسی کی سزا سنائی اور سپریم کورٹ میں بھی سزا بحال رہنے پر اس پر عمل درآمد ہوا' مجھے آج تک کھٹکتا ہے کہ کہیں میں نے غلط فیصلہ تو نہیں دیا تھا۔ اس کیس میں شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ریلوے لائن پر نفیس ریشمی کپڑوں میں ملبوس ایک نہایت خوبصورت لڑکی کی لاش ملی جس کے ہاتھ اس کے آزار بند سے بندھے ہوئے تھے اور جسے اپنے دوپٹہ سے گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ چونکہ لاش کو علاقے کے لوگوں میں کوئی شناخت نہ کر سکا' اس لیے اس کی تصویر کھینچ کر اخباروں میں چھپوادی گئی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کو دفنا دیا گیا اور نامعلوم ملزم کے خلاف لڑکی کے قتل کا کیس رجسٹر ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد لڑکی کا والد موضع گڑھ مہاراجہ ضلع جھنگ سے شاہدرہ پولیس اسٹیشن پہنچا اور بتایا کہ تصویر اس کی بیٹی کی ہے۔ پولیس کے روبرو اپنے بیان میں اس نے واقعے کی تفصیل یوں دی:

''میری اپنے قصبے میں کریانہ کی دکان ہے۔ میں پڑھا لکھا ہوں اور اپنی اولاد کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ میری بیٹی اکثر بیمار رہتی تھی۔ کبھی کبھی اسے دورے پڑتے اور وہ بے ہوش ہو جایا کرتی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں سے علاج معالجہ کراتے رہے مگر کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا۔ میری بیوی کا خیال تھا کہ بیٹی پر کسی کا سایہ ہے۔ اس لیے ڈاکٹروں حکیموں سے اس کا علاج ممکن نہیں بلکہ کوئی عامل یا فقیر ہی اس کا صحیح علاج کر سکتا ہے۔ مجھے اس کی باتوں پر یقین تو نہ آتا تھا' مگر اس کے کہنے سننے پر جھنگ سے سیالکوٹ پہنچا کیونکہ میری بیوی کو کسی پڑوسن نے بتایا تھا کہ امام صاحب کے قبرستان میں ایک عامل پیر ''بے شاہ'' نامی بیٹھتے ہیں جن کے کئی مرید ہیں اور جن کے ہاتھوں اسی عارضے میں مبتلا کئی عورتیں شفا پا چکی ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے اڈے پر زیادہ تر مراقبے میں رہتے تھے۔ اپنی بیٹی کے کوائف بیان کرنے پر انہوں نے کاغذ کے پرزوں پر تحریر کردہ چند تعویذ مجھے عطا کیے اور فرمایا کہ بیٹی کو چٹا کر کاغذات کو دریا برد کر دینا۔ میں نے واپس آ کر ان کے حکم کی تعمیل کی' مگر بیٹی پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میری بیوی چونکہ پیروں فقیروں کی بڑی قائل تھی' اس لیے پھر میرے پیچھے پڑی کہ سیالکوٹ جا کر شاہ صاحب کو اپنے ساتھ لاؤں۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر میں دوبارہ سیالکوٹ پہنچا اور شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ میرے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئے۔ موضع گڑھ مہاراجہ پہنچ کر میں نے انہیں اپنے گھر پر ہی ٹھہرایا اور خاطر تواضع کی۔''

''ان کے حکم کے مطابق ایک علیحدہ کمرہ انہیں دیا گیا۔ شاہ صاحب سرِ شام اپنا جوتا باہر اتار کر کمرے میں داخل ہوتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ تہجد کی نماز کے بعد انہوں نے میری بیٹی کے

ساتھ مصلّے پر بیٹھ کر نو دن عمل کرنا تھا۔ معمول یہ تھا کہ رات کے دو بجے بیٹی ان کے مصلّے پر جا کر بیٹھتی اور دروازے کے کواڑ بھیڑ دیئے جاتے۔ عمل فجر کی اذان تک جاری رہتا۔ بیٹی اذان کے بعد باہر نکلتی اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتی۔ مگر شاہ صاحب تقریباً گیارہ بجے ''اشراق'' کی نماز ادا کر کے ایک خشک روٹی سالن کے ساتھ کھالیا کرتے۔''

''تین روز گزرنے کے بعد اپنی ماں اور میرے پوچھنے پر بیٹی نے بتایا کہ اسے پہلے سے بہت افاقہ ہے۔ پانچویں روز بیٹی نے بتایا کہ شاہ صاحب کی کرامت سے رات کو مصلّے پر بیٹھے اس پر روپوں کے سکّوں کی بارش ہوئی اور اس نے ہمیں جمع کیے ہوئے روپے دکھائے۔ میری بیوی نے بیٹی سے کہا کہ شاہ صاحب سے پوچھے کیا وہ نوٹوں کو دوگنا کر سکتے ہیں؟ شاہ صاحب کے کہنے پر میری بیوی نے سو سو روپے کے دس نوٹ مصلّے کے نیچے رکھ دیئے۔ اگلے روز یعنی ساتویں روز لڑکی نے دس کے بدلے بیس سو سو کے نوٹ لا کر اپنی ماں کو تھما دیئے۔ اب میری بیوی نے فرمائش کی کہ کیا سونے کے زیور بھی دوگنے ہو سکتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جو کچھ بھی دوگنا کروانا ہے مصلّے کے نیچے رکھ دیں۔ اس پر میری بیوی نے اپنا سارا زیور پوٹلی میں باندھ کر مصلّے کے نیچے رکھ دیا۔ اگلے روز فجر کی اذان کے بعد بیٹی کمرے سے باہر نہ نکلی۔ دن کے گیارہ بج گئے' شاہ صاحب نے بھی کھانے کو کچھ نہ مانگا۔ ہمیں بڑی تشویش ہوئی کہ کیا ماجرا ہے۔ کمرے کے باہر دروازے پر شاہ صاحب کے جوتے بمطابق معمول پڑے تھے۔ ہم نے دروازے کے کواڑ کو کھول کر اندر جھانکا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی لیکن اندر نہ تو بیٹی موجود تھی' نہ مصلّے کے نیچے زیور کی پوٹلی اور نہ شاہ صاحب کا کوئی نام و نشان تھا۔ ظاہر ہے شاہ صاحب زیور سمیت بیٹی کو اغوا کر کے کھڑکی کے رستہ نکل گئے تھے۔''

''میں نے گڑھ مہاراجہ پولیس اسٹیشن میں اغوا کی رپورٹ لکھوائی۔ مگر پولیس نے کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ لڑکی بالغ ہے' اپنی مرضی سے بھاگ گئی ہوگی۔ ہم میاں بیوی بے بسی کے عالم میں بیٹھ گئے۔ اتنے میں اخبار میں بیٹی کی تصویر دیکھ کر پہچان لی اور اس کے قتل کی خبر پڑھ کر آپ کے پاس پہنچا ہوں۔''

شاہدرہ پولیس نے گڑھ مہاراجہ میں موقع کا معائنہ کیا۔ لڑکی کی ماں کا بیان قلمبند کیا اور گواہوں کی موجودگی میں ملزم کا جوتا قبضہ میں لیا۔ پھر سیالکوٹ میں امام صاحب کے قبرستان پہنچ کر ملزم کی تلاش یا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی' مگر وہاں سے کوئی تسلی بخش شہادت نہ مل سکی۔ بالآخر پولیس نے اس لائن پر تفتیش کا رخ موڑا کہ جہاں لاش ملی ہے' اسی علاقہ کے اردگرد کی آبادی میں ممکن ہے قاتل کا کوئی سراغ مل سکے۔ دورانِ تفتیش پولیس کو معلوم ہوا کہ ملحقہ مسیحی آبادی میں ایک نوجوان عورت گئی

دنوں سے غائب ہے۔ وہ اپنے آٹھ سالہ ذہنی طور پر معذور بچے کو کوارٹر میں اکیلا چھوڑ کر کسی مقامی راہب سے اس کا علاج کروانے گئی تھی مگر واپس نہیں لوٹی۔ پولیس نے راہب کا اتا پتا معلوم کر کے قریب کی آبادی سے الگ تھلگ اس کی جھونپڑی پر چھاپہ مارا اور مسیحی عورت کو برآمد کر لیا۔ عورت نے بیان دیا کہ راہب نے بچے کے علاج کے بہانے اس کا زیور اور پیسے ہتھیا لیے ہیں۔ چونے کے دائرے کے اندر اُسے چارپائی پر رسیوں سے باندھ کر جادو کا عمل کرتا تھا۔ عمل کے دوران اس پر جنسی حملے بھی کرتا تھا۔ کھانے کو بہت کم دیتا تھا۔ کہتا تھا چالیس روز کے چلے کے بعد بچہ بالکل روبصحت ہو جائے گا۔ پولیس نے راہب کو گرفتار کر لیا۔ اسے گواہان کے روبرو جوتا پہنایا گیا جو نہ صرف اسے فٹ آیا بلکہ اس کے پاؤں میں ''چنڈی'' بھی اسی مقام پر تھی جہاں سے جوتا پھٹا ہوا تھا مگر ملزم نے شروع سے لے کر آخر تک جرم سے انکار کیا۔ اس سے کوئی زیور برآمد نہ ہو سکا۔

ٹرائل کورٹ نے اسے مجرم گردانتے ہوئے سزائے موت دی تھی اور شہادت کے جن اجزا پر انحصار کیا گیا' وہ یہ تھے: (1) مجرم کی شناخت پریڈ میں اسے مقتولہ کے باپ نے شناخت کر لیا کہ راہب ہی دراصل عامل ہے' حالانکہ بقول اس کے عامل کی تو داڑھی تھی اور پگڑی باندھتا تھا مگر راہب داڑھی منڈا اور ننگے سر تھا۔ بہرحال مقتولہ کی ماں اس کے نئے بہروپ میں اسے پہچان نہ سکی۔ (2) مجرم کو جب موقع سے حاصل کردہ جوتا پہنایا گیا تو نہ صرف فٹ آیا بلکہ مجرم کے پاؤں کے انگوٹھے پر جہاں چنڈی تھی وہیں سے جوتا پھٹا ہوا تھا۔ (3) مجرم اگرچہ بہروپیا تھا مگر اس کے طریقہ واردات میں یکسانیت تھی' یعنی وہ خصوصی طور پر عورتوں کو اپنے دام میں پھنساتا اور روحانی یا کالے جادو کے زور سے علاج معالجہ کا ڈھونگ رچاتا تھا۔

اس کیس میں قتل کا عینی شاہد کوئی نہ تھا سارے کا سارا کیس واقعاتی شہادت پر مبنی تھا اور مجرم کا آخر تک یہی موقف رہا کہ وہ بے گناہ ہے' اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ بہرحال مقتولہ کو آخری بار عامل کے بہروپ میں مجرم کے ساتھ اس کے والدین نے دیکھا اور راہب کے بہروپ میں مقتولہ کے باپ نے اسے شناخت کر لیا۔ پھر جوتا نہ صرف مجرم کو فٹ آیا بلکہ اس کے پاؤں کی ''چنڈی'' کے مقام پر وہ پھٹا ہوا بھی تھا' پس جوتا اسی کا تھا جس کے پاؤں پر ''چنڈی'' تھی اور وہی مجرم تھا۔ میں نے اس کی سزا بحال رکھی اور سپریم کورٹ میں اس کی اپیل خارج ہو گئی۔

مجھے جو یہ کیس آج تک کھٹکتا رہا ہے' اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اگر شناخت پریڈ میں باپ کے مجرم کو شناخت کر لینے کا ثبوت مشکوک سمجھ کر رد کر دیا جائے (مجرم کا کہنا تھا کہ اسے پریڈ سے پیشتر پولیس نے مقتولہ کے باپ کو دکھا دیا تھا) تو پھر صرف خالصتاً واقعاتی شہادت (جوتا فٹ آنا یا ''چنڈی'' کی جگہ جوتے کا پھٹا ہونا) باقی رہ جاتی ہے' جو پھانسی کی سزا دینے کے لیے شاید ناکافی تھی۔ مگر یہ کیس ایسا تھا جس میں پھانسی

کی جگہ عمر قید دے سکنے کی گنجائش نہ تھی اور بری کر دینا میرے ضمیر کو گوارا نہ تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ تجربہ میرے قلب اور ذہن کے درمیان ایک طرح کی کشمکش تھی۔ دل کہتا تھا کہ یہی مجرم ہے لیکن دماغ وسوسے پیدا کرتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جج کمپیوٹر مشین نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اسے اپنا ذہن پورے طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ فیصلہ بالآخر اس کا قلب یا ضمیر ہی کرتا ہے' مگر مشکل تو یہ ہے کہ قلب پر کس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

میری چیف ججی کے دوران مجھے پانچ چھ بار ملک سے باہر جانا پڑا۔ مثلاً ۱۹۸۳ء میں میں اور ناصرہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے جزائر مالدیپ گئے۔ یہ جزیرے بحرِ ہند میں سری لنکا سے قدرے ہٹ کر خطِ استوا پر واقع ہیں۔ خاصی تعداد میں ہیں' لیکن آبادی صرف چند ہی میں ہے۔ دارالحکومت ''مالے'' ہے جو غالباً پانچ یا چھ مربع میل رقبے پر مشتمل ایک جزیرے پر واقع ہے۔ اسی طرح ایئرپورٹ بھی اتنے ہی بڑے ایک جزیرے میں واقع ہے' جتنی زمین ایئرپورٹ کے لیے درکار ہو۔ ہوائی جہاز کے اترتے وقت بڑا خوف آتا ہے کہ کہیں سمندر ہی میں نہ ڈوب جائے اور کامیابی سے جہاز اتارنے پر مسافر تالیاں بجا کر کیپٹن کو داد دیتے ہیں۔ یہاں نوے فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ ان جزیروں کی اپنی دلکشی ہے۔ ہر طرف سمندر ہی سمندر ہے اور موجوں کا شوروغل۔ ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک پہنچنے کے لیے موٹر بوٹ یا موٹر لانچوں پر سوار ہو کر جانا پڑتا ہے جو یہاں کی پبلک ٹرانسپورٹ ہے۔ ہم کولمبو اور کینڈی (سری لنکا) کی سیر کرتے ہوئے مالے پہنچے تھے اور دیگر مندوبین کی طرح سرکاری مہمان تھے۔ کانفرنس ''جنوبی ایشیا میں اسلام'' کے موضوع پر تھی اور اس کا اہتمام لیبیا یا معمر قذافی نے کیا تھا۔

خطِ استوا پر واقع ہونے کے سبب جزائر مالدیپ میں جنوری کے مہینے میں خاصی گرمی تھی۔ کانفرنس تقریباً ایک ہفتہ تک جاری رہی اور ہمیں مختلف جزیروں کی سیر بھی کرائی گئی۔ حکومت کی آمدنی کے ذرائع سیاحت اور سمندر سے مچھلیاں پکڑنا ہے۔ ان جزیروں کی ریت نہایت نرم اور سنہری ہے۔ زیادہ تر سیاح جو یہاں آتے ہیں یورپین ہیں اور ان کے لیے چند جزیروں میں فرانسیسی یا جرمن یا اطالوی کمپنیوں کے ہوٹل ہیں جو جھونپڑیوں کی شکل میں ہیں۔ ٹورسٹ دن بھر ساحل سمندر کی ریت پر برہنہ لیٹے رہتے ہیں اور سمندر میں تیراکی کرتے ہیں یا پانی کی گہرائیوں میں اتر کر لطف اٹھاتے ہیں۔ رات کو شراب یا ناچ رنگ کی محفلیں جمتی ہیں' لیکن سب کچھ یورپی اسٹائل میں۔ ان جزیروں میں مقامی لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں اور ویسے بھی حکومت کی طرف سے (سوائے سیاحوں کے مخصوص جزیروں کے) شراب رکھنے یا پینے پر پابندی ہے۔ (مگر درحقیقت یہاں شراب بھی ملتی ہے اور ممنوعہ علاقوں میں مقامی لڑکیوں کی سپلائی بھی ہوتی ہے۔ گو انہیں سیاحت کے لوازمات سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا جاتا ہے) جن جزیروں میں ہمیں سیر کرنے کا

اتفاق ہوا' وہاں صرف میں اور ناصرہ ہی کپڑوں میں ملبوس تھے' باقی سب یورپین لوگ ننگے تھے اور ہمیں بڑی حیرت سے گھورتے تھے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے۔ چند غیر آباد جزیرے محض ٹاپو ہیں' یعنی سمندر سے ابھری ہوئی چٹانیں' البتہ بعض پر گھاس پھوس اُگی ہے۔

دارالحکومت مالے میں چند بڑی سرکاری عمارتیں ہیں۔ ایک بڑا بازار ہے جس میں ہر قسم کی دکانیں ہیں۔ اکثر لوگ پیدل چلتے ہیں یا سائیکلیں استعمال کرتے ہیں۔ دارالحکومت میں ایک آدھ موٹر کار ہے جو شاید صدر کے استعمال کے لیے ہے۔ تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ عورتیں پردہ نہیں کرتیں' لمبے لمبے لبادے سے پہنتی ہیں۔ ان کے حقوق کے تحفظ کی خاطر بہت سے قوانین ہیں۔

کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں کے سب باشندے ایک سمندری عفریت کو پوجتے تھے جو ہر سال سمندر سے نکل کر جزیرہ مالے پر آ بیٹھتا تھا اور جس کی خاطر کنواری لڑکیوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ پھر کسی مسلم برگزیدہ ہستی کا جہاز وہاں لنگر انداز ہوا۔ انہوں نے نہ صرف سمندری عفریت کو مار ڈالا بلکہ یہاں مسجد تعمیر کی۔ (مالے کی خوبصورت جامع مسجد اسی بزرگ کے نام پر ہے) اور ساری کی ساری آبادی نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ابن بطوطہ اپنے سمندری سفر کے دوران یہاں پہنچے تھے اور کسی مقامی خاتون سے شادی کر کے بیس اکیس برس یہیں گزارے تھے۔

اسی سال یورپین ڈپلومیٹس کی کانفرنس سالسبرگ (آسٹریا) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں بھی میں اور ناصرہ نے سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے شرکت کی۔ کانفرنس کا مقصد یورپین ڈپلومیٹس کو مسلم ممالک کے دانشوروں سے ملوانا اور ان ممالک کے دساتیر پر بحث کرنا تھا۔ میرے مقالے کا موضوع تھا "اسلام بحیثیت ایک قومیت ساز قوت" مندوبین کو ایک پرانے محل میں ٹھہرایا گیا جو اب ہوٹل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہیں میری ملاقات ایک بار پھر الجزائر کے سابق صدر بن بیلا سے ہوئی اور ان کی معیت میں کچھ وقت گزارا۔ ہمارے میزبان یو این کے سابق سیکرٹری جنرل کرک والڈائیم تھے جو ان دنوں آسٹریا کے صدر تھے۔

سالسبرگ ایک نہایت خوبصورت چھوٹا سا شہر ہے۔ معروف زمانہ پیانو نواز موزارٹ کی جائے ولادت ہے اور شہر میں اس کا گھر اب میوزیم ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔ سالسبرگ اپنے اوپیرا ہاؤس کے سبب بھی بڑا مشہور ہے اور یہاں ہمیں اوپیرا دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ آسٹرین لوگ اوپیرا مذہبی عقیدت سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً بہترین کپڑے پہن کر ہال میں جاتے ہیں۔ مجمع نہایت خاموشی کے عالم میں اوپیرا کی موسیقی سنتا ہے اور اگر کسی کو کھانسی آ جائے تو اسے فوری طور پر باہر نکلنا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریا کے لوگوں میں بچے پیدا کرنے کا رواج نہیں' اس لیے آبادی میں اضافہ صفر ہے۔ صرف بوڑھے یا جوان ہی نظر آتے ہیں۔

کانفرنس سے فراغت کے بعد ہم وی آنا پہنچے۔ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا کیونکہ طالبعلمی کے زمانے میں اپنے دو انگریز یہودی دولتمند دوستوں کے ساتھ موٹر کار میں جرمنی میں دریائے رائین کے کنارے کنارے ڈرائیو کرتے آسٹریا میں داخل ہوا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ہم نے راستے میں ایک رات ہمبرگ میں گزاری تھی اور چونکہ جنگ کے بعد جرمن شہروں کی تعمیر نو جاری تھی' میں رات بھر ہوٹل میں تعمیر کے کام کے شور وغل کے سبب سو نہ سکا تھا۔ میرے لیے اس وقت یہ انتہائی تعجب کی بات تھی کہ جرمن قوم دن رات کام کر کے کس طرح اپنے کھنڈر اور ویران شہروں کو از سرِ نو زندہ شہروں میں منتقل کر رہی ہے۔ ہم لوگ سالسبرگ سے ہوتے ہوئے وی آنا پہنچے تھے۔ اس زمانے میں آسٹریا میں فلاحی حکومت قائم تھی اور ٹریڈ یونینوں میں طوائفوں نے بھی اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر ٹریڈ یونین بنا رکھی تھی۔ ہم لوگ وی آنا پہنچتے ہی دریائے ڈینیوب دیکھنے گئے تھے کیونکہ اس دریا کا یورپی ادب اور تاریخ میں خاص مقام ہے۔ بعد ازاں ہم نے اس محل اور باغ کی سیر بھی کی تھی جو یہاں کے مقامی کیتھولک بشپ نے اپنی مسٹرس (داشتہ) کے لیے بنوائے تھے۔ ظاہر ہے قرونِ وسطٰی یا "تاریک ادوار" میں یورپ میں پاپائیت یا تھیاکریسی کی کرپشن اس حد تک پہنچ گئی تو تبھی "تحریکِ اصلاحِ دین" کے سبب مذہب ریاست سے الگ کر دیا گیا۔ پھر بھی آسٹریا کے باشندے زیادہ تر کیتھولک مذہب ہی کے تھے۔

وی آنا سے میں اور ناصرہ بذریعہ بس ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ پہنچے۔ یہ "آہنی پردے" کے پیچھے جانے کا ہمارا پہلا موقع تھا۔ ہنگری کیمونسٹ ملک تھا۔ کیمونزم کا کمال یہی ہے کہ ان ممالک میں تعلیم کا معیار بہت بلند ہے' کھانے پینے کی اشیاء آسٹریا کے مقابلے میں بے حد سستی تھیں اور پبلک ٹرانسپورٹ بھی نہایت سستی تھی۔ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں ہنگری سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا' اس لیے یہاں مسلم اقلیت بھی موجود ہے۔ پھر آسٹرو ہنگرین سلطنت کا حصہ بنا۔ بالآخر سوویٹ روس کے زیرِ اثر کیمونسٹ ریاست کی صورت اختیار کی۔ دارالحکومت دریا کے کنارے بوڈا اور پسٹ نامی دو شہروں پر مشتمل ہے۔ اس شہر کے لوگ ہمیں زیادہ تر تماش بین اور نڈر سے لگے۔ زیادہ وقت کھانے پینے' ناچنے گانے میں صرف کرتے تھے اور یہاں ریاستی دہشت یا خوف کی وہ فضا نہ تھی جو مشرقی یورپ کے کیمونسٹ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

ہم بوڈاپسٹ سے واپس وی آنا آئے اور پھر بذریعہ ریل پراگ (چیکوسلواکیہ) پہنچے۔ چیکوسلواکیہ میں ریاستی دہشت کی فضا قائم تھی کیونکہ یہاں کچھ عرصہ پہلے کیمونسٹ حکومت کے خلاف مظاہرے ہو چکے تھے' جن کو ختم کرنے کے لیے روسی ٹینک بلوائے گئے اور روسی فوجیوں کے ہاتھوں خاصی تعداد میں لوگ مارے بھی گئے۔ پراگ پہنچنے سے پیشتر ایک چھوٹی سی بستی میں سب مسافروں کو اتار کر ٹرین

کی مکمل تلاشی لی گئی' کیونکہ وہ وی آنا سے آئی تھی۔ پراگ ریلوے اسٹیشن پر ہمارے استقبال کے لیے اقبال شناس پروفیسر جان مارک آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ''جاوید نامہ'' کا چیک زبان میں ترجمہ کر رکھا ہے۔ وہ ہمیں اس ہوٹل میں لے گئے جہاں انہوں نے ہمارے لیے کمرہ بک کروا رکھا تھا۔ پروفیسر جان مارک نے کوشش کی تھی کہ ہمیں پراگ میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرایا جائے' لیکن حکومت نے اس بنا پر ہمیں ایسا اسٹیٹس نہ دیا کیونکہ پاکستان امریکہ کے ساتھ مل کر افغانستان میں سوویٹ روس کے قبضہ کے خلاف مجاہدین کی امداد کر رہا تھا۔ ہوٹل میں ہمیں ملنے کی خاطر آنے پر جان مارک کو ہر دفعہ استقبالیہ ڈیسک پر اپنا شناختی کارڈ چھوڑنا پڑتا اور کمرے میں وہ ہمارے ساتھ کھل کر کوئی بات کرنے سے بھی گریز کرتے تھے کیونکہ کمرہ ''بگڈ'' تھا۔ ناصرہ نے مجھے دو تین بار اردو میں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہاں ''پسو'' ہیں' مگر میں ان کی بات نہ سمجھ سکا اور یہی جواب دیتا رہا کہ مجھے تو رات کو بستر پر کسی ''پسو'' نے نہیں کاٹا۔

جان مارک اپنی ''سکوڈا'' موٹر کار پٹرول کی مہنگائی کے سبب بہت کم استعمال کرتے تھے' لہٰذا ہمیں شہر کی سیر پیدل یا ''زیرزمین'' ٹرین کے ذریعہ کرائی۔ کھل کر بات چیت بھی کھلی فضا ہی میں کرتے تھے۔ بتایا کہ انہوں نے اور ان کی بیوی نے کوئی اولاد پیدا نہیں کی کیونکہ اس ''بند'' معاشرے میں وہ اپنے بچوں کے لیے کوئی اچھا مستقبل فراہم نہیں کر سکتے تھے۔ جان مارک کی بیوی بھی ان کے ساتھ ایک بار پاکستان آ چکی تھیں' اس لیے ہم انہیں جانتے تھے۔ وہ پراگ یونیورسٹی کے کسی سابق چانسلر کی بیٹی تھیں جو چیکوسلواکیہ کی ایک معروف علمی شخصیت تھے۔ اس لیے وفات پر انہیں اہم شخصیات کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ ہم ان کی تربت پر بھی گئے۔ مجھے یہ بات بڑی پسند آئی کہ چیکوسلواکیہ کی رسم کے مطابق قوم کی اہم شخصیات کی عزت افزائی کی خاطر انہیں علیحدہ قبرستان میں دفنایا جاتا ہے۔

جان مارک ہمیں اپنے گھر بھی لے گئے۔ یہ گھر دراصل ایک عالیشان وِلا تھا جو ان کی بیوی کو اپنے والد کی وراثت میں ملا تھا مگر کمیونسٹ حکومت کے قائم ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی کو ذاتی رہائش کے لیے اس وِلا کا صرف ایک کمرہ دیا گیا تھا۔ اسی کمرے میں وہ دونوں سوتے یا آرام کرتے تھے' یہیں کھانا کھاتے اور یہیں ان کا کتب خانہ یا پڑھنے لکھنے کا سامان تھا۔ کچن اور باتھ روم اس وِلا کے دیگر مکینوں کے ساتھ ''شیئر'' کرنے پڑتے تھے۔ اپنی اس زندگی سے وہ نہایت بیزار تھے۔ کبھی کمرے کی گھٹن سے تنگ آ جاتے تو کرسیاں نکال کر باہر لان میں بیٹھ جاتے۔ ہم نے جان مارک سے پوچھا کہ پراگ میں سڑکوں اور چوراہوں میں اینٹیں سیمنٹ بجری وغیرہ کے ڈھیر پڑے نظر آتے ہیں' لیکن تعمیر یا مرمت کا کوئی کام نہیں ہو رہا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بتایا کہ یہاں کوئی بھی شخص دل لگی سے کام نہیں کرتا۔ مزدور شمالی کوریا سے منگوائے گئے ہیں اور ان کی تعداد بھی کم ہے' اس لیے کام کی رفتار نہایت سست ہے۔

جان مارک کے بقول پراگ یونیورسٹی میں چند پاکستانی طلباء بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ میں نے انہیں پوچھا کہ انہیں یہاں یونیورسٹی میں داخلہ کیسے ملتا ہے؟ بتایا کہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کی سفارش پر انہیں داخلہ دیا جاتا ہے' رہائش مفت ہوتی ہے اور فیس معاف' البتہ کرایہ اپنا خرچ کر کے افغانستان کے راستے آتے ہیں۔ میں نے جان مارک سے کہا کہ پاکستان میں کسی کمیونسٹ پارٹی کے وجود یا اس کی قیادت کے بارے میں میں نے تو کبھی نہیں سنا۔ اس پر انہوں نے اپنے میز کی دراز سے ایک نوٹ بک نکالی اور فرمایا کہ تین افراد پر مشتمل پارٹی کا ایک بورڈ ہے جو طلباء کے داخلے کی سفارش کرتا ہے۔ ان کے نام ہیں: سی آر اسلم' عابد حسن منٹو اور بیگم طاہرہ مظہر علی۔

جان مارک کے بغیر بھی ہم پراگ میں پھرتے رہے۔ تھیٹر میں "بیلے" دیکھا۔ زیادہ لوگ نہ تھے۔ رات کے تقریباً دس بجے شو ختم ہونے پر واپس لوٹے تو سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر کسی سے راستہ پوچھیں تو وہ بات کرنے سے ہچکچاتا یا ڈرتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی شہر میں اتنے خوفزدہ لوگ نہیں دیکھے جیسے پراگ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے یہاں وہ پرانا محل بھی دیکھا جہاں زانیہ عورتوں کو سزا کے طور پر اندھے کنویں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ دراصل جب مسیحی مجاہد صلیبی جنگوں میں لڑنے کی خاطر اپنے ملک سے باہر نکلتے تھے تو بیویوں کو آہنی جھنگیے (یا لنگوٹ) پہنا کر تالوں کی چابیاں ساتھ لے جایا کرتے تا کہ شوہروں کی عدم موجودگی میں وہ زنا کاری نہ کر سکیں' مگر جو ایسا کرنے سے باز نہ آتی تھیں' انہیں سزا ملتی تھی۔

پراگ سے ناصرہ ریل پر نیورمبرگ سے ہوتی ہوئی فرینک فورٹ (جرمنی) پہنچیں۔ سرحد پار کرنے سے پیشتر یہاں بھی مسافروں کو اتروا کر ٹرین کی تلاشی لی گئی۔ اسٹیشن پر انہیں انگریزی بولتے دیکھ کر ایک چیک باشندے نے انگریزی میں واویلا کرنا شروع کر دیا کہ آزاد دنیا کو بتاؤ ہم کس حال میں ہیں۔ خدارا ہماری مدد کو آؤ۔ ہمیں چھڑاؤ وغیرہ۔ میں بذریعہ ہوائی جہاز انہیں فرینک فورٹ میں آملا۔

ایک بات جس نے خصوصی طور پر مجھے حیرت میں ڈالا' وہ مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک میں روحانی علاج معالجے کی مقبولیت تھی۔ باوجود اس کے کہ کمیونسٹ اسٹیٹ دہریت اور مادہ پرستی پر قائم تھی اور ان ملکوں میں تعلیم کا معیار اس قدر بلند تھا' ان کی توہم پرستی واقعی میری حیرانی کا باعث تھی۔ یونانی' آریہ ویدک یا ایلوپیتھک طریقہ علاج تو قابل فہم ہے' مگر روحانی طریقہ علاج تو شاید جاہلوں ہی میں مقبول ہو سکتا ہے۔ بہرحال ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میرا اپنا مشاہدہ اس کے برعکس ہے۔ میرے والد میرے دادا کی اجازت سے پان پر قلم اور کالی سیاہی کے ساتھ کوئی آیت تحریر کر کے باری کے بخار کے مریض کو دیا کرتے تھے جس کے چاٹنے سے اس کا بخار اتر جاتا تھا۔ میرے اپنے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ مالدیپ میں پیش

آیا۔ میں اور میرے دوست جسٹس سید محمد کرم شاہ مرحوم (سجادہ نشین بھیرہ) کسی غیر آباد جزیرے میں سیر کر رہے تھے کہ میرے بازو پر کسی مچھر نما شے نے کاٹا اور اچانک میرا بازو سوج کر سرخ ہو گیا۔ اس کے ساتھ سوزش اس قدر ناقابل برداشت کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسی صورت میں کچھ کر سکنا بھی ممکن نہ تھا۔ شاہ صاحب نے کچھ پڑھ کر میرے بازو پر دم کیا اور آناً فاناً سوجن اور سوزش دونوں غائب اور میں بھلا چنگا ہو گیا۔ میری سمجھ میں جو بات آج تک نہیں آ سکی وہ یہ ہے کہ بعض عارضوں سے شفا حاصل کرنے کی خاطر ہر مذہب میں روحانی طریقہ علاج موجود ہے اور شفا بھی ممکن ہے۔ علاوہ اس کے بسا اوقات مذہب یا روحانیت سے عاری، مثلاً افریقی جادو کے ذریعہ بھی شفا ممکن ہے۔ تو پھر اس میدان میں حق و باطل یا ایمان و کفر کی تمیز کیا ہوئی؟

۱۹۸۴ء میں مجھے اور ناصرہ کو ویلانووا یونیورسٹی کی دعوت پر پان سلوینیا (امریکہ) جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے میزبان پروفیسر حفیظ ملک تھے اور ہم انہی کے پاس ٹھہرے۔ (ہمارا بڑا بیٹا منیب ستمبر ۱۹۸۳ء ہی میں لاہور میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ویلانووا یونیورسٹی میں داخل ہو چکا تھا۔) اس یونیورسٹی میں میرے لیکچر کا موضوع ''پاکستان میں اسلامائزیشن'' تھا۔ جب میں نے پاکستان میں شریعت کورٹ کے قیام، حدود آرڈیننس کا نفاذ اور قانون شہادت میں تغیر و تبدل کا ذکر کیا تو اس پر قائداعظم کے فرمودات کی روشنی میں شدید تنقید کی گئی۔

اسی سال مجھے حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ کے زیرِ اہتمام ''مذہبی عدم رواداری'' کے موضوع پر ایک سیمینار میں شرکت کے لیے جنیوا (سوئزرلینڈ) بھیجا۔ مجھے احساس تھا کہ اس سیمینار میں پاکستان نے احمدی اقلیت سے متعلق جو قانون سازی کر رکھی ہے، اس پر بین الاقوامی برادری کے سامنے کوئی نہ کوئی تسلی بخش جواب دینا پڑے گا۔ اس لیے میں نے وزارتِ خارجہ سے بریف مانگی۔ مگر وہ مجھے کچھ نہ دے سکے بلکہ جواب دیا کہ وزارتِ قانون سے پوچھوں۔ میں نے شریف الدین پیرزادہ صاحب سے رابطہ کیا۔ مگر وہاں سے بھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ بالآخر میں نے سیمینار میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے فرمودات کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بانیانِ پاکستان مذہبی رواداری سے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے مگر جنیوا میں احمدیوں کا مشن بھی سیمینار میں ابزرورز کے طور پر حصہ لے رہا تھا۔ انہوں نے مجھے احمدیوں سے متعلق جنرل ضیاء الحق کی مخصوص قانون سازی پر خوب لتاڑا، بلکہ مجھ سے بین الاقوامی برادری کے روبرو اپیل کی کہ اپنی حکومت کو علامہ اقبال اور قائداعظم کے مذہبی رواداری سے متعلق اصول اپنانے کی تلقین کروں۔ میرا موقف یہی تھا کہ یہ قانون سازی احمدی برادری کے خلاف نہیں بلکہ ان کے تحفظ کی خاطر کی گئی ہے تاکہ وہ مسلم اکثریت کے غیظ و غضب کا نشانہ نہ بنیں۔ مگر بین

الاقوامی برادری نے میرے دلائل مسترد کر دیئے اور اس مسئلہ پر جو بھی قرار دادیں پاس ہوئیں، سب کی سب پاکستان کے خلاف تھیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے زمانے ہی سے بین الاقوامی برادری میں پاکستان کا امیج مذہبی طور پر ایک تنگ نظر اور متشدد ریاست کے ابھرا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا کہ جب بانیانِ پاکستان کی نگاہ میں پاکستان کو ایک وسیع النظر اور روادار ریاست بننا تھا تو پھر مذہبی طور پر وہ تنگ نظر اور متشدد ریاست کیونکر بن گئی؟

۱۹۸۵ء میں میں، چیف جسٹس سندھ عبدالحیٰ قریشی، چیف جسٹس بلوچستان منور مرزا اور پشاور ہائی کورٹ کے سینئر جج علی حسین قزلباش عدلیہ میں فیصلہ طلب مقدموں کی مینجمنٹ اور التوا کے مسائل کے حل کے سلسلہ میں ایک کانفرنس میں شرکت کی خاطر رینو (نواڈا، امریکہ) گئے۔ اس کانفرنس میں مقدموں کی مینجمنٹ اور التوا کے مسائل اور ان کے حل پر خوب بحث مباحثہ ہوا۔ مگر اس ضمن میں جو سفارشات کی گئیں وہ پاکستان کی عدلیہ میں اصلاحات کی صورت میں نافذ کرنا مشکل تھا۔ ایک تو ہمارے وسائل ایسی اجازت نہ دیتے تھے، دوسرے ہمارے معاشرے میں خصوصی طور پر التوا مانگنے والے وکلاء کے طبقے میں اخلاقی نظم وضبط کا فقدان تھا۔ ہم رینو سے سان فرانسسکو اور پھر واشنگٹن پہنچے۔ یہاں ایک بار پھر فیڈرل سپریم کورٹ کے جج صاحبان سے ملاقات ہوئی۔ ابھی تک جسٹس وارن برگر ہی چیف جسٹس تھے اور انہوں نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ واپسی پر میں چند دن ڈاکٹر حفیظ ملک اور منیب کے ساتھ ویلانووا میں گزارنے کے بعد لندن سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچ گیا۔ اس سال ہمارا چھوٹا بیٹا ولید بھی لاہور میں اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد وارٹن اسکول (پان سلوینیا) میں داخل ہو گیا۔

وکالت ایک طرح سے ہمارا خاندانی پیشہ بنتا چلا جا رہا تھا۔ ایک روز ناصرہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ دونوں لڑکے باہر پڑھنے کے لیے چلے گئے ہیں اور لڑکوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے ایل ایل بی اور بعد میں ایل ایل ایم کی ڈگریاں حاصل کر لیں۔ اب ان کا ارادہ ہے کہ اگر ہارورڈ لاء اسکول میں داخلہ مل جائے تو سال بھر میں وہاں سے ایل ایل ایم کر لیا جائے۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے والد کے انتقال کے باوجود انہیں اپنا ارادہ بدلنے نہ دیا۔ دونوں لڑکوں کی خواہش تھی کہ ماں ان کی یونیورسٹیوں میں داخلہ نہ لے۔ بہر حال ناصرہ کو ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور انہوں نے ایک سال سخت محنت کر کے وہاں سے ایل ایل ایم کی سند آنرز کے ساتھ حاصل کر لی۔ لاہور واپس آ کر انہوں نے چیمبر پریکٹس شروع کی کیونکہ کورٹ میں پیش ہو کر وہ مجھے بحیثیت چیف جسٹس شرمندہ نہ کرنا چاہتی تھیں۔

اسی سال نومبر کے مہینے میں سرکاری طور پر یوم اقبال کی تقریبات میں شرکت کی خاطر مجھے مصر

جانے کا اتفاق ہوا۔ جسٹس سید محمد کرم شاہ صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔ ان ایام میں راجہ ظفر الحق مصر میں ہمارے سفیر تھے۔ ان کی اور وزیر ثقافت کی معیت میں ہم نے وہ تمام مقامات دیکھے جہاں علامہ اقبال اپنے سفر مصر کے دوران گئے تھے۔ دریائے نیل پر رواں کشتی میں ایک سرکاری لنچ کا اہتمام کیا گیا جہاں ہماری خاطر سازندوں نے معروف مصری گلوکارہ امّ کلثوم کے گائے ہوئے ''شکوہ'' کی دھن بجائی۔ میں نے فکر اقبال کے موضوع پر قاہرہ، عین الشمس اور الازہر یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے۔ جامعہ الازہر کے ریکٹر سے میں نے علامہ اقبال کے شعر ؎

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کا حوالہ دے کر پوچھا کہ کیا شریعت کی رو سے جو مال ضرورت سے زائد ہو اسے حکومت ٹیکس کی صورت میں مجھ سے رفاہِ عامہ پر صرف کرنے کی خاطر وصول کر سکتی ہے؟ ان کا جواب تھا ''نہیں۔ اضافی مال صرف رضا کارانہ طور پر ہی دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ مسلم ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی میں تو کوئی بھی شخص ایک پائی بھی رضا کارانہ طور پر ادا کرنے کو تیار نہ ہوگا۔ اس لیے رفاہِ عامہ کی خاطر کسی حد تک ریاستی جبر استعمال کرنے کو علامہ اقبال غیر معقول نہ سمجھتے تھے۔ وہ تو امیروں کو مسجد میں دیکھنے تک کے روادار نہ تھے ؎

اے شیخ امیروں کو مسجد سے نکلوا دے
ہے ان کی نمازوں سے محراب ترش ابرو

مارچ ۱۹۸۶ء میں تہران یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الاقوامی اقبال کانگرس میں شرکت کی خاطر مجھے ایران مدعو کیا گیا۔ ایران عراق جنگ جاری تھی اور امام خمینی بقید حیات تھے۔ کانگرس کا افتتاح امام خمینائی نے کیا۔ انہوں نے علامہ اقبال پر اپنی زبانی تقریر میں تقریباً دو گھنٹے لیے اور سینکڑوں اشعار کے حوالے دیئے۔ کانگرس کے شرکاء نے مجھے ان کا شکریہ ادا کرنے کی ذمہ داری سونپی اور میں نے فارسی میں لکھی ہوئی تقریر پڑھ کر ان کی اقبال شناسی پر انہیں خوب داد دی۔ (امام خمینائی کے دورۂ لاہور کے دوران جنرل ضیاء الحق نے گورنر ہاؤس میں ڈنر کے موقع پر ان سے میرا تعارف کرایا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں فارسی نہیں جانتا تو انہوں نے جنرل ضیاء الحق سے ازراہِ مذاق کہا تھا کہ جاوید کو ایران بھیج دیں۔ وہ اس کی شادی کسی شیرازی حسینہ سے کرا دیں گے اور تین ماہ کے اندر اندر ایسی فارسی بولیں گے جو لہجہ کے اعتبار سے شیریں ہوگی۔ مجھے علامہ اقبال کے حوالے سے ''میوزیم پیس'' کی طرح پاکستان کے اکثر حکمران بیرونی مہمان شخصیات سے متعارف کراتے رہے ہیں۔ مثلاً بھٹو کے زمانہ میں لاہور میں انڈونیشیا کے صدر

سکارنو سے ملوایا گیا۔ اسی طرح ایک موقع پر امریکہ کے سابق صدر نکسن سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات بھی گورنر ہاؤس لاہور میں ہوئی۔ نکسن بذات خود ایک اچھے ادیب بھی تھے۔ مجھے ان سے باتیں کرتے ہوئے حیرت ہوئی کہ لاہور کے گورنر ہاؤس یا دیگر تاریخی عمارتوں سے متعلق ان کی معلومات کتنی وسیع ہیں۔ پرنس کریم آغا خان سے تو اچھے خاصے مراسم پیدا ہو جانے کی امید تھی۔) میں نے کانگرس میں ''اقبال کے تصورِ اسلامی اتحاد اور تیسری دنیا'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور واضح کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے کیوں ''تہران'' کو مشرق کی پس ماندہ اقوام کا ''جنیوا'' بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا یا اسلامی و تیسری دنیا کے اتحاد سے متعلق اقبال کے خواب میں ایران کی کیا مرکزی حیثیت تھی۔ بعدازاں میں نے مشہد میں علی شریعتی یونیورسٹی میں ''اقبال اور علی شریعتی'' کے موضوع پر لیکچر دیا اور امام رضا کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ وہاں بڑی تعداد میں جنگ میں شہداء کی لاشیں لائی جا رہی تھیں۔ مزار کی فضا نوحوں سے لبریز تھی۔ افسردگی اور آہ وزاری کا ایسا سماں میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

جنوری ۱۹۸۶ء میں رباط (مراکو) میں مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی میٹنگ میں مجھے او آئی سی کے تحت قائم اسلامی تہذیبی میراث کے تحفظ کی خاطر مرکز کی گورننگ کونسل کا تین سال کے لیے رکن منتخب کیا گیا۔ بعدازاں جولائی ۱۹۸۶ء میں استنبول (ترکی) میں مجھے گورننگ کونسل کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔ سنٹر کی عمارت کی تعمیر کے لیے ترکی کے وزیر اعظم ترگت اوزال نے ہمیں یورپی ترکی اور ایشیائی ترکی کو ملانے والے نئے پل کے قریب اراضی عطا کی اور پرنس کریم آغا خان تعمیری کام کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کو بھی تیار تھے۔ میں نے شریف الدین پیرزادہ (جو ان ایام میں او آئی سی کے سیکرٹری جنرل تھے) کو استنبول سے جدہ ٹیلی فون کیا۔ مگر انہوں نے پرنس کریم آغا خان سے مالی امداد لینے سے مجھے اس لیے منع کر دیا کہ سعودی عرب کے حکمران ان کے مذہبی عقائد کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یہ کہ عمارت صرف سعودی عرب کی مالی امداد سے تعمیر کی جائے، مگر ایسی کوئی امداد نہ ملی، لہٰذا میری تین سالہ رکنیت (۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۹ء تک) کے دور میں مرکز ایک پرانے ترکی محل ہی میں قائم رہا۔ (جو غالباً سلطان عبدالمجید نے جرمن بادشاہ قیصر ولیم کی استنبول میں چند روزہ رہائش کے لیے پہلی جنگ عظیم سے قبل تعمیر کروایا تھا اور اب خاصی بوسیدہ حالت میں تھا۔) استنبول میں اراضی پر تو ہمارا قبضہ ہو گیا، مگر عمارت مذہبی اختلاف کی بنا پر نہ بن سکی۔ (میں نہیں جانتا کہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد اب کیا صورتِ حال ہے۔)

۴۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں باسٹھ برس کی عمر میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے منصب سے میری ریٹائرمنٹ سے پیشتر مجھے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے بلوا بھیجا۔ فرمایا: ''ہم آپ کو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے طور پر بدستور رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ کو سپریم کورٹ بھیج کر واپس لاہور ہائی کورٹ

لے آیا جائے تو کیسا رہے گا؟'' میں نے جواب دیا: ''میں اس کیفیت میں واپس چیف جسٹس کے طور پر لاہور آنا نہ چاہوں گا۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں کہ سپریم کورٹ میں میرا بطور جج تقرر ہو تو مجھے منظور ہے۔ لیکن واپس لوٹ کر اپنے کسی جونیئر رفیق کے چیف ججی کا حق مارنا مجھے پسند نہ ہوگا۔'' پھر فرمایا: ''آپ اپنی جگہ چیف جسٹس بننے کی سفارش کس کے لیے کریں گے؟'' میں نے کہا ''میرے بعد سب سے سینئر جج سعد سعود جان ہیں' جو لائق بھی ہیں اور قابلِ ستائش بھی۔'' ''مگر وہ تو قادیانی ہیں۔'' جونیجو نے اعتراض کیا۔ ''سر! اوّل تو وہ اعلانیہ کہتے ہیں کہ میں قادیانی نہیں ہوں۔ دوم وہ جمعہ کی نماز بھی ہمیشہ اسی جی او آر کی مسجد میں پڑھتے ہیں جہاں دیگر مسلمان پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ قادیانی ہوں بھی تو کیا مذہبی عقائد کے سبب ان کی سنیارٹی اور میرٹ کو نظر انداز کر کے ان کا حق مارنا جائز ہے؟'' اس سوال کا جواب جونیجو کے پاس کوئی نہ تھا۔

میری ریٹائرمنٹ کے روز ہی سے مجھے سپریم کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ میں میرا رخصتی ریفرنس ہوا۔ میرے رفقاء نے بڑے تپاک اور محبت سے مجھے الوداع کہا۔ جسٹس سعد سعود جان کا تقرر بھی سپریم کورٹ کے جج کے طور پر کر دیا گیا۔ مگر انہیں اپنی لیاقت اور سنیارٹی کے باوجود لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے سے اس لیے محروم رکھا گیا کہ وہ قادیانی سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ جو ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتا' وہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی منصب پر ''غیر مسلم'' کا استحقاق ہو تو اسے محروم رکھنا کہاں کا اسلام ہے؟ میں جب کبھی بھی اس بات پر غور کرتا ہوں تو ندامت سے مجھے پسینہ آنے لگتا ہے۔ ہمارے یہاں ماضی میں اپنی سنیارٹی کے لحاظ سے غیر مسلم ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ مگر وہ قائداعظم کی تعلیمات کا اثر تھا۔ اب ہم پر ضیاء الحق کے متعصب قسم کے اسلام کا نفاذ تھا جس کے سامنے کوئی بول سکنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا کیونکہ ہم ضمیر کی آزادی سے محروم تھے۔ بلکہ بقول اقبال سلطانی و ملائی و پیری کا ''کشتہ'' بن چکے تھے

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقاید کی بنا پر تعمیر!
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقاید سے تہی جس کا ضمیر

باب ۱۰

عدالتِ عُظمٰی کے تین برس

عدالت عظمٰی میں بھی وہی کچھ ہوا جو لاہور ہائی کورٹ میں ہوا تھا۔ یعنی چیف جسٹس انوار الحق کا جسٹس مولوی مشتاق حسین سے ہمدردی میں حلف نہ اٹھا کر سپریم کورٹ سے نکل جانے کے بعد چیف جسٹس کے خالی منصب پر حق تو سنیارٹی میں سب سے سینئر جج جسٹس دراب پٹیل کا تھا جو ویسے بھی ایک نہایت قابل جج تھے' مگر چونکہ وہ پارسی مذہب کے تھے' انہیں چیف جسٹس بنائے جانے کی امید نہ تھی۔ پس وہ استعفٰی دے کر رخصت ہو گئے۔ ان سے اگلے نمبر پر جسٹس حلیم تھے۔ سو جنرل ضیاء الحق نے بطور صدر انہیں چیف جسٹس مقرر کر دیا۔ بھٹو کی پھانسی کے خلاف اپیل کے موقع پر جسٹس حلیم نے باقی ججوں کی سزا برقرار رکھنے کی رائے سے اختلاف کیا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے واضح کیا کہ بطور "کریمنل جج" آپ جانتے ہوں گے کہ صرف قتل کی سازش کرنے کے الزام میں ماخوذ مجرم کو وہی سزا نہیں ملتی جو عموماً قاتل کو دی جاتی ہے۔ لیکن ان کی رائے کے مطابق اس کیس میں تو شہادت سے یہ الزام بھی ثابت نہ تھا۔ علاوہ اس کے انہیں اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کا صرف ایک بیٹا ہے اور بھارت سے ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہونے کے بعد انہوں نے سندھ ہی میں جینا اور مرنا ہے۔ بہرحال ابتداً سپریم کورٹ میں جسٹس حلیم کا تقرر بھی بطور قائم مقام چیف جسٹس ہوا اور انہوں نے دستور کے احیاء کے بعد چیف جسٹس کی اوتھ لی۔

سپریم کورٹ میں میرے پرانے دوست جسٹس اسلم ریاض حسین' جسٹس غلام مجدّد مرزا' جسٹس ایس ایس جان' جسٹس ظلہ اور جسٹس نسیم حسن شاہ کے علاوہ جن جج صاحبان سے میرے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے وہ تھے: جسٹس عبدالقادر شیخ' جسٹس ظفر مرزا' جسٹس نعیم الدین اور جسٹس علی حسین قزلباش۔ سپریم کورٹ میں چیف جسٹس حلیم سمیت ہم سب ایک دوسرے کے خاصے قریب تھے اور ماحول نہایت ہی دوستانہ تھا۔

مجھے اس بات کا رنج تھا کہ انتظامیہ کی ریشہ دوانیوں کے اور رائے عامہ کی عدلیہ کے حق میں عدم موجودگی کے سبب عدلیہ رفتہ رفتہ رو بہ تنزل ہے۔ بھٹو کے زمانہ میں خصوصی طور پر چیف جسٹس لاہور

ہائی کورٹ سردار اقبال کو فارغ کر کے بہت ناانصافی کی گئی۔ اتفاق سے ایک دن میرے اور مجید نظامی کے درمیان یہی بحث کا موضوع تھا۔ مجید نظامی کو خیال آیا کہ جنرل ضیاء الحق سے اس زیادتی کا ذکر کرنا چاہیے۔ شاید اس کا ازالہ ہو سکے۔ بہرحال ان کے کہنے پر یا ویسے ہی جنرل ضیاء الحق نے جسٹس سردار اقبال سے ملاقات کی اور انہیں پاکستان کا سب سے پہلا محتسب مقرر کر کے ان کے ساتھ ہونے والی گزشتہ زیادتی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی۔

۱۹۸۷ء میں مجھے کئی بار ملک سے باہر جانا پڑا۔ اسلامی تہذیبی میراث کے تحفظ کی خاطر گورننگ کونسل کے اجلاس کے لیے تو مجھے ہر سال استنبول جانا پڑتا تھا۔ اس بار اجلاس دمشق (شام) میں منعقد ہوا اور مجھے یہاں کے اقبال شناسوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ شام میں حافظ الاسد کی آمریت کے تحت لا اینڈ آرڈر پوری سختی سے قائم تھا۔ ملک میں اگر کوئی جرم کرے اور پولیس اسے پکڑ لے تو پھر وہ شخص ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا تھا' لہٰذا مجھے بتایا گیا کہ دمشق میں شاذ و نادر ہی کسی جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ دمشق اموی خلفاء کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں کی اموی جامع مسجد اور دیگر آثار دیکھنے کے لائق ہیں۔ جامع مسجد میں مرد اور عورتیں عموماً اکٹھے نماز پڑھتے نظر آتے ہیں' حسن بن صباح کی فردوس شام ہی میں تھی۔ اسی ملک میں حشیشین دہشت گردی کرنے کے لیے نکلتے اور اہم شخصیات کو قتل کر کے اپنی طرف سے جنت میں چلے جاتے تھے۔ اسی ملک میں نسوانی حسن اور خوبصورتی کا یہ عالم تھا (اور ہے) کہ فراعین مصر یہیں کی نازنینوں سے شادیاں رچاتے۔ آبادی علوی' سنی اور دروز فرقوں پر مشتمل ہے۔ دمشق یورپی شہروں کی طرح ماڈرن ہے' مگر بعض زیارات دیکھے بغیر طبیعت نہیں بھرتی۔ مثلاً بی بی زینب کا مزار اور اس کے احاطے میں علی شریعتی کی تربت جس پر جلی حروف میں لکھا ہے ''خدا محبت است'' جامع مسجد میں وہ مقام جہاں حضرت امام حسینؓ کا سر دفن کیا گیا' ابن عربی کا مزار وغیرہ۔ اسلامی تمدن اور تاریخ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ممالک اسلامیہ کا سفر ہر طالبعلم کے لیے نہایت ضروری ہے۔

پاکستانی سفارتخانے نے علامہ اقبال پر میرے ایک لیکچر کا اہتمام حافظ الاسد ہال میں کیا۔ اس ہال میں لیکچر کے لیے حکومت سے خصوصی اجازت لینی پڑتی ہے۔ لیکچر انگریزی میں تھا اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ مردوں اور عورتوں نے کھڑے ہو کر لیکچر سنا۔ مجھے شامیوں کی علامہ اقبال کے افکار میں دلچسپی دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہیں ایک اقبال شناس سے میرا تعارف کرایا گیا جنہوں نے ''بال جبریل'' کا اردو سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ''دارالاقبال'' نامی ایک پرنٹنگ پریس بھی ہے۔ میری اردو میں تحریر کردہ علامہ اقبال کی سوانح عمری ''زندہ رود'' کے عربی ترجمے پر نظر ثانی بھی شامی اقبال شناسوں نے ہی کی ہے۔ مگر ابھی تک اس کتاب کا عربی ترجمہ شائع نہیں ہو سکا۔

مجھے اسی سال دوسری بار ناصرہ کے ہمراہ پھر استنبول جانا پڑا جب استنبول بار ایسوسی ایشن نے کمیونسٹ بلغاریہ میں مسلم اقلیت پر مظالم کے موضوع پر بین الاقوامی کانفرنس کا اہتمام کیا۔ بلغاریہ میں مسلم اقلیت زیادہ تر ترک مسلمانوں کی ہے۔ انہیں بلغار قوم میں مدغم کرنے کی خاطر عجیب وغریب قسم کے قوانین بنائے گئے۔ مثلاً انہیں اپنے مسلم نام بدل کر بلغاری نام رکھنے پر مجبور کیا گیا اور اگر انہیں اپنے مسلم نام سے کوئی خط لکھے تو وہ خط انہیں نہ ملتا تھا۔ بازاروں اور گلیوں کے مسلم نام بدل دیئے گئے۔ لیبر فورس میں ترک مسلم اقلیت کی لڑکیوں کو بلغاری لڑکوں کے ساتھ شریک کیا جاتا تا کہ وہ آپس میں جنسی تعلقات قائم کرلیں یا شادیاں کرلیں۔ ترک مسلم اقلیت کے اراکین کو بلغاریہ سے ہجرت کر کے ترکی جانے کی اجازت نہ تھی۔ یوں ترک مسلم اقلیت کی مکمل نسل کشی کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس بین الاقوامی کانفرنس میں سوائے پاکستان کے کسی اور مسلم ملک کا کوئی نمائندہ موجود نہ تھا' البتہ یورپی ممالک' امریکہ اور اسرائیل کے یہودی پیش پیش تھے کیونکہ انہیں یورپ میں بطور اقلیت اسی قسم بلکہ اس سے بھی بدتر آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا۔ مگر ایسے اقدام سے اقلیتیں ختم نہیں کی جاسکتیں۔ بالآخر بلغاریہ میں کمیونزم کے خاتمہ اور مغربی سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے نفاذ کے ساتھ یہ مسئلہ خود بخود ختم ہوگیا۔

تیسری بار مجھے ترکی کا دورہ تب کرنا پڑا جب استنبول اور انقرہ کی یونیورسٹیوں نے مجھے علامہ اقبال' کمال اتاترک اور جدید اسلامی ریاست کے موضوعات پر لیکچروں کے لیے بلوایا۔ جدید اسلامی ریاست کے موضوع پر لیکچر کا اہتمام استنبول میں ترکی کے انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز نے کیا تھا اور علامہ اقبال وکمال اتاترک کے سیاسی افکار پر لیکچر انقرہ یونیورسٹی میں ترکیات کے شعبے میں کیا گیا۔

اس زمانے میں جنرل ایورن ترکی کے انقلابی صدر تھے۔ ان کے حکم کے تحت کوئی لڑکی سکارف پہن کر استنبول یونیورسٹی یا سٹریٹیجک سٹڈیز کے انسٹی ٹیوٹ میں داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ سکارف پہنے ہوئے چند لڑکیوں نے مجھ سے شکایت کی کہ انہیں لیکچر ہال میں داخل ہونے کی اجازت نہیں' مگر وہ میرا لیکچر سننا چاہتی ہیں۔ میں نے ڈائریکٹر سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہے۔ ان کا جواب تھا کہ ایران ترکی میں اسلامی انقلاب لانے کی کوشش میں بڑا سرمایہ لگا رہا ہے اور یہ لڑکیاں ایرانی پراپیگنڈے کے زیر اثر ہیں۔ بہرحال انہوں نے لڑکیوں کو لیکچر سننے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنے لیکچر کے دوران بتایا کہ کسی طرح علامہ اقبال ترکی میں کمال اتاترک کی اصلاحات سے متاثر تھے اور یہ کہ ترکی کے ''سیکولرازم'' سے اس کا اسلامی تشخص نہیں بدلا۔ سوال جواب کے سیشن میں ان لڑکیوں میں سے بعض نے اس خیال کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال بعد میں کمال اتاترک سے مایوس ہوگئے تھے اور اسی سبب انہوں نے اپنے اشعار میں ان اصلاحات پر نکتہ چینی کی۔ مثلاً ۔

لادینی و لاطینی! کس پیچ میں الجھا تو؟
دارو ہے ضعیفوں کا لاغالب الاّ ہو

اس مرحلہ پر میں نے انہیں بتایا کہ علامہ اقبال کی وفات سے چند ہفتے قبل جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے اطلاع دی کہ ان کی صحت یابی اور درازیٔ عمر کے لیے ڈربن کی تمام مساجد میں دعا کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے انہیں جواب دیا کہ میں تو اپنا کام اب ختم کر چکا ہوں۔ اگر درازیٔ عمر کی دعا کرنی ہے تو کمال اتاترک اور جناح کے لیے کرو۔

میں لیکچر ختم کر کے باہر نکلا تو استنبول کے اخبار ''جمہوریت'' کے نمائندے نے سوال کیا کہ کیا آپ کی رائے میں اسلام میں عورت کے لیے پردہ کرنا لازم ہے؟ میں نے جواب دیا کہ قرآن میں زینتوں کو چھپانے کا حکم ہے۔ جس سے مراد ہے کہ باحیا لباس زیب تن کیا جائے۔ سکارف وغیرہ پہننے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ سوال کیا گیا کہ کیا پاکستان میں یونیورسٹی کی لڑکیاں پردہ کرتی ہیں؟ میرا جواب تھا کہ اس مسئلہ پر کوئی جبر نہیں، جس کی مرضی ہے پردہ کرے، جو چاہے پردہ نہ کرے۔

جب میں پاکستان واپس آیا تو لاہور میں مجھے ایرانی قونصل جنرل ملنے کی خاطر سپریم کورٹ تشریف لائے۔ فرمایا کہ ایران کی وزارتِ اطلاعات (ارشاد) نے استنبول میں میرے بیان کا نوٹس لیا ہے اور یہ کہ اس بیان سے ایران میں میرے امیج کو نقصان پہنچا ہے۔ میں نے جواب دیا: کہ میرے اپنے ملک کی حکومت نے تو میرے بیان پر ایسا کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایران کے لیے میں پریشانی کا باعث کیوں ہوں؟ فرمایا: ''ہم سب آپ کو پسرِ ایران سمجھتے ہیں۔ اس لیے وزارتِ اطلاعات ایران میں آپ کا صحیح امیج برقرار رکھنے کے لیے فکر مند ہے۔'' میں نے کہا: میری طرف سے وزارتِ اطلاعات کو تحریر کر دیں کہ تاریخی اعتبار سے ترکی کا انقلاب ایرانی انقلاب سے قبل آیا۔ ترکوں کو دنیائے عرب اور ایران کے مسلمانوں نے آزمائش کے دور میں تنہا چھوڑ دیا بلکہ عربوں نے تو ان کے خلاف باقاعدہ سازش کی۔ پس انہوں نے اپنوں کے دغا کرنے پر بہ عالم مجبوری یورپی اقوام کے پریشر کے تحت ''سیکولرازم'' قبول کیا۔ اب انہیں رفتہ رفتہ پیار و محبت ہی سے واپس اپنوں میں لایا جا سکتا ہے، جبر یا نکتہ چینی سے نہیں، کیونکہ اپنوں پر انہیں اعتماد نہیں رہا۔ اس اعتماد کو بحال کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

اسی سال ڈنمارک، ناروے اور سویڈن میں مقیم پاکستانیوں نے ۱۵-اگست کو یومِ آزادی کی تقریب میں شرکت کے لیے مجھے اور ناصرہ کو اوسلو (ناروے) بلوایا۔ اس سفر میں میری بہن منیرہ اور ان کے شوہر میاں صلاح الدین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بدقسمتی سے آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے سردار عبدالقیوم بھی اپنے بیٹے کے ہمراہ اس تقریب میں مدعو تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے افکار کی روشنی میں

اسلام سے متعلق میرے خیالات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے مجھ پر تبصرے کے دوران اپنی تقریر میں کہیں کہہ دیا کہ جو کوئی بھی اقبال کو پڑھتا ہے وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔ اس پر خاصی لے دے ہوئی' بلکہ بعد میں ''خطباتِ ناروے'' کے موضوع پر لاہور کے اخبارات میں طویل بحث چھڑ گئی۔ ''نوائے وقت'' نے سردار عبدالقیوم کو خوب رگیدا۔ جب انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تو ناروے کی پاکستانی انجمن نے میرے اور سردار عبدالقیوم کی تقاریر کے ٹیپ پاکستان بھیج دیئے' جن سے ان کا جھوٹ ثابت ہو گیا۔ مجھے بخوبی احساس ہے کہ پاکستان میں جھوٹ بولنا خصوصی قسم کے بڑے سیاستدانوں کا شیوہ ہے اور وہ جھوٹ بول کر بغیر ڈکار مارے اسے ہضم بھی کر سکتے ہیں۔ مگر سردار عبدالقیوم سے ایک کشمیری لیڈر کی حیثیت سے کم از کم مجھے ایسی توقع نہ تھی۔ شاید ''نوائے وقت'' نے انہیں ضرورت سے زیادہ اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنایا۔

اسی سال شمالی یورپ سے واپس آ کر مجھے ''عالمی دہشت گردی'' کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے جنیوا (سوئزرلینڈ) جانا پڑا۔ اس کانفرنس کا اہتمام او آئی سی (آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس) نے کیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی تک یو این کا ادارہ ''دہشت گردی'' کی کوئی ایسی تعریف متعین نہیں کر سکا جو سب اقوام کے لیے قابل قبول ہو۔ یورپی ممالک امریکہ سمیت ہر قسم کی انتہا پسندی یا عسکریت کو ''دہشت گردی'' کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ مگر تیسری دنیا کے بیشتر ممالک ''دہشت گردی'' اور ''حق خود ارادیت کے حصول کے لیے جنگ'' میں امتیاز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حق خود ارادیت کے حصول کی خاطر جنگ کو ''جہاد'' کہا جائے یا ''قومی جدوجہد'' اسے کسی بھی صورت میں ''دہشت گردی'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقوام عالم میں مدت سے یہ بحث جاری ہے اور اس پر ابھی تک کوئی معقول فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ بھارت اس بحث میں ''دہشت گردی'' کی مغربی تعریف کا اس لیے حامی ہے تاکہ وہ آزادی کے لیے مقبوضہ کشمیر کے کشمیریوں کی ''قومی جدوجہد'' کو ''دہشت گردی'' کا نام دے کر وہاں اپنی ''ریاستی دہشت گردی'' اور انسانی حقوق کی پامالی پر پردہ ڈال سکے اور اپنے آپ کو ''دہشت گردی'' کا نشانہ ظاہر کر کے مغربی اقوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر چونکہ حقِ خود ارادیت کے حصول کے لیے ''جدوجہد'' میں زیادہ تر مسلم اقوام ''ملوث'' ہیں' اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بحث زیادہ تلخ ہوتی جا رہی ہے اور اس نے مسیحیت اور اسلام کے درمیان ایک طرح کی صلیبی جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

۱۹۸۸ء میں ویلانووا یونیورسٹی (امریکہ) میں ڈاکٹر حفیظ ملک نے ''جدید اسلامی ریاست'' کے موضوع پر ایک سیمینار میں مجھے اور ناصرہ کو مدعو کیا۔ سیمینار سے فراغت کے بعد کینیڈین پاکستانی ایسوسی ایشن

کی دعوت پر ہم دونوں کینیڈا کے دورے پر نکلے۔ اس دورے میں ہم مونٹریال' کیلگری' وینکوور' ٹورنٹو وغیرہ پھرے اور چند یونیورسٹیوں میں پاکستان کے موضوع پر لیکچر بھی دیئے۔ اس ملک میں بحیثیت مجموعی پاکستانی نژاد کینیڈینز نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔ مگر خصوصی طور پر وینکوور میں سکھوں نے اور دیگر شہروں میں اسماعیلی مسلمانوں نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ یہاں کی سکھ برادری زیادہ تر خالصتان کی حامی ہے۔ جہاں تک اسماعیلیوں کا تعلق ہے' ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بھٹو کے دورِ حکومت میں سوشلزم کے خوف کے سبب اپنا سرمایہ کراچی سے نکال کر کینیڈا لے آئے تھے اور یہاں نہ صرف کینیڈا کی اکانومی کو بہتر بنانے میں حکومت کی مدد کی بلکہ مالی طور پر خود بھی پاکستان سے زیادہ آسودہ حال ہو گئے۔ قدرت نے یقیناً پاکستان کے ساتھ بھونڈا مذاق کر رکھا ہے' جس طرح بھٹو کے "سوشلزم" سے ملک میں غربت ڈھیروں بڑھی' اسی طرح جنرل ضیاء الحق کی "اسلامائزیشن" سے پاکستان ایک انتہا پسند' متشدد اور آگے کی بجائے پیچھے کی طرف دوڑنے والے ملک کے روپ میں ظاہر ہوا۔

اس سال اسلامی تہذیبی میراث کے تحفظ کی گورننگ کونسل کا اجلاس ریاض (سعودی عرب) میں ہوا۔ ایک دراز قد خوش شکل سعودی شہزادے (جو غالباً کھیلوں وغیرہ کا وزیر تھا) نے صدارت کی۔ مجھے وہ کھجور کے ایک طویل قامت درخت کی طرح لگا جو پھل سے تو آراستہ ہے مگر جس کا کوئی سایہ نہیں ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ شہزادہ فیصل السعود کے علاوہ مجھے تو سب سعودی شہزادے طویل قامت کھجور کے درختوں کی طرح ہی لگتے ہیں۔ مال دار ضرور ہیں مگر سایہ اس لیے نہیں ہوتا کہ شاید دانش سے عاری ہیں اور اس کمزوری کو چھپانے کی خاطر تکبر کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ ریاض شہر ٹکساس (امریکہ) کا کوئی شہر لگتا ہے۔ بہت سی نئی بلند عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں' لیکن ان میں رہتا کوئی بھی نہیں۔ چھ رویہ سڑکوں پر موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں' مگر شہر میں کم ہی لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بہر حال اجلاس کے اختتام پر ہمیں عمرہ کرایا گیا۔ یہ میرا دوسرا عمرہ تھا' البتہ ہم مدینہ منورہ نہ جا سکے۔

۱۹۸۹ء سپریم کورٹ میں میرا آخری سال تھا۔ مگر اس سال میں بھی تین بار ملک سے باہر گیا۔ جون میں ویلانووا یونیورسٹی (امریکہ) نے مجھے آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرنے کی خاطر مدعو کیا اور میں ناصرہ کے ساتھ ویلانووا پہنچا۔ ہمارے میزبان بمطابق معمول ڈاکٹر حفیظ ملک تھے۔ میں اس یونیورسٹی میں کئی بار پاکستان اور جدید اسلامی ریاست کے موضوعات پر لیکچر دے چکا تھا اس لیے یونیورسٹی کے اربابِ بست و کشاد مجھے جانتے تھے۔ اس سے پیشتر ہارورڈ یونیورسٹی نے ایک سال کے لیے وہاں قیام کر کے مجھے جدید اسلامی ریاست کے موضوع پر ایک کورس دینے کی دعوت دی تھی۔ لیکن سپریم کورٹ میں جج کے فرائض انجام دیتے ہوئے میں سال بھر کے لیے ایسی ذمہ داری قبول نہ کر سکتا تھا' لہٰذا میں نے

معذرت کر دی۔ آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کرتے وقت جو ریفرنس پڑھا گیا اس کا لب لباب یہ تھا کہ انسانی برادری کی بہتری کے لیے میری خدمات کے اعتراف میں مجھے ''ڈاکٹر آف ہیومن لیٹرز'' کی اعزازی ڈگری عطا کی جاتی ہے۔

گزشتہ سال غالباً ستمبر میں میں اور ناصرہ اردن کی حکومت کی دعوت پر عمان گئے۔ اس زمانہ میں لیفٹیننٹ جنرل (ر) صغیر حسین وہاں ہمارے سفیر تھے۔ میں ان کے ساتھ شاہ حسین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وقت کے ولی عہد شہزادہ حسن بن طلال سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ (شہزادہ حسن کی بیگم شہزادی ثروت پاکستانی نژاد ہیں اور محترمہ شائستہ اکرام اللہ کی صاحبزادی ہیں۔) شاہ حسین نے میری بڑی عزت افزائی کی اور سرکاری طور پر مجھے اسلامی تمدن پر تحقیق کے لیے رائل ایکاڈیمی کا مستقل رکن بنایا گیا۔ اس شاہی تقریب میں جو ریفرنس میرے حق میں پڑھا گیا' اس کے الفاظ یہ تھے: ''جدید اسلامی تمدنی زندگی کو منظم و مستحکم کرنے میں ان کے کردار' ان کی دانشورانہ صلاحیتوں اور اسلام کی اخلاقی اقدار سے دنیا کو روشناس کرانے میں ان کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر انہیں اردن کی شاہی ایکاڈیمی کا مستقل رکن مقرر کیا جاتا ہے۔''

اس مستقل رکنیت کی بنا پر مجھے ہر دوسرے سال رائل ایکاڈیمی کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے عمان جانا پڑتا ہے۔ میں جس سال رکن نامزد کیا گیا' اجلاس میں زیر بحث موضوع ''سنتِ نبوی بطور ذریعہ تحصیلِ علم'' تھا۔

اردن میں بے شمار رومن آثار ہیں جو دیکھنے کے لائق ہیں۔ علاوہ ان کے ہماری دلچسپی کا باعث بحیرۂ مردار (یا بحیرۂ لوط) تھا جس کی ایک جانب اردن ہے اور دوسری جانب اسرائیل۔ بحیرۂ مردار میں کسی تیراک کا ڈوب سکنا ممکن نہیں مگر اس کے کنارے شہر ''سڈوم'' واقع تھا جو لواطت پسندی کے سبب بدنام تھا اور بالآخر قہرِ الٰہی کے نتیجہ میں بحیرۂ مردار میں غرق کر دیا گیا۔ بحیرۂ مردار سطح سمندر سے ہزاروں فٹ گہرائی میں واقع ہے اور اس کا پانی اس قدر نمکین اور بھاری ہے کہ ہر شے اس پر تیرتی رہتی ہے مگر کوئی جاندار اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

اسی سال آخری بار میں حج کی خاطر پاکستان سے باہر گیا۔ ناصرہ کی خواہش تھی کہ میں ریٹائر ہونے سے پہلے چلتے پھرتے حج کی سعادت حاصل کر لوں۔ ہم نے عام کوٹے پر حج کے لیے درخواست دی جو منظور ہوئی۔ اس زمانہ میں محترمہ بینظیر بھٹو وزیر اعظم تھیں اور پاکستان میں پی پی پی کی حکومت تھی۔ مکہ معظمہ میں ہم نے پاکستان ہاؤس میں قیام کیا جہاں ہمیں دو مزید میاں بیویوں کے ساتھ ایک ہی کمرہ میں فرشی بستر بنا کر رہنا پڑا' مگر جس شخص کی توجہ اور مہمان نوازی کے سبب میں اور ناصرہ حج کے مشکل مراحل

طے کرنے میں کامیاب ہوئے وہ شیخ نذیر احمد تھے جن کا سعودی عرب' لیبیا' ملیشیا وغیرہ میں وسیع کاروبار ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نعمتوں سے نوازتا رہے اور انہیں مہمان نوازی کا اجر دے۔

ہم نے مکہ معظمہ میں تمام مناسکِ حج ادا کیے۔ مگر نظم وضبط کی عدم موجودگی اور ہر طرف غلاظت کے ڈھیروں میں ہجومِ مومنین کو دیکھ کر مجھے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ وسائلِ دولت ہونے کے باوجود مسلمانانِ عالم دنیا بھر کی اقوام میں اس قدر پسماندہ اور ذلیل وخوار کیوں ہیں۔ ایک اور بات جو مجھے بری طرح کھٹکی وہ یہ تھی کہ حج کا اصل مقصد تو مسلم اُمہ کے درمیان یکجہتی پیدا کرنا تھا' مگر یہ شاید تبھی ممکن تھا جب اموی یا عباسی خلافتوں کے تحت مسلم امہ بظاہر متحد تھی یا کم ازکم اس کی زبان عربی تھی اور تمدن بھی عربی تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ مسلم اُمہ اب متفرق ''مسلم قومی ریاستوں'' میں منتشر ہو چکی ہے جن کی زبانیں مختلف ہیں اور کلچر بھی ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ ایسی صورت میں اب ہر مسلمان انفرادی طور پر ایک دوسرے سے اجنبیت کے عالم میں مناسک حج ادا کرتا ہے اور جو خطبہ مسلم اُمہ کے لیے عربی میں دیا جاتا ہے' اسے عربوں کے سوا نہ تو کوئی غیر عرب مسلمان سمجھتا ہے اور نہ اس کا ترجمہ دوسری مسلم زبانوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے حج کا بنیادی اجتماعی مقصد تو کب کا فوت ہو چکا ہے۔ ہم محض رسمِ دین کے اس فریضے کو ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ہفتہ بھر گزارنا البتہ کچھ تسکین قلب کا باعث بنا مگر اپنے خیالات کے پس منظر میں حج کرنے سے وہ پوری روحانی تسکین مجھے حاصل نہ ہو سکی جس کی مجھے توقع تھی۔

جس طرح پاکستان سے باہر میں کئی کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں جن کا ذکر نہیں کیا گیا' اسی طرح پاکستان کے اندر بھی کئی کانفرنسوں یا عسکری تربیت دینے والے اہم اداروں میں بلایا جاتا رہا ہوں۔ پنجاب اور کراچی کی یونیورسٹیوں نے بھی ایک آدھ بار فکرِ اقبال سے متعلق موضوعات پر لیکچر دینے کی دعوت دی۔ چند یوم گورنر جیلانی کی عدم موجودگی میں پنجاب کا قائم مقام گورنر بھی رہا جس تجربے سے عدلیہ کی سوتیلی بہن انتظامیہ کے اندر جھانک سکنے کا موقع ملا۔ میں نے ایسے اکثر واقعات کو غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز کر دیا ہے مگر اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ۱۹۸۶ء میں قائداعظم کے یومِ ولادت کے روز (یعنی ۲۵ دسمبر) جنرل ضیاء الحق نے اپنی زیرِ صدارت قصر صدارت میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا جس کا موضوع تھا: ''آج وطنِ عزیز کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ اور آپ کے خیال میں اسے کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔'' اس زمانے میں ۱۹۷۳ء کا دستور ''ضیائی'' ترامیم کے ساتھ لاگو ہو چکا تھا اور محمد خان جونیجو وزیراعظم تھے۔ اس کانفرنس کی دلچسپ بات یہ تھی کہ وزیراعظم کے ہوتے ہوئے اس کانفرنس کا اہتمام صدر پاکستان نے بذاتِ خود کر رکھا تھا۔

کانفرنس میں شرکت کے لیے ہر کسی کو دعوت جنرل ضیاء الحق نے بذاتِ خود بھیجی تھی اور اس میں

صحافی، دانشور، علماء، مشائخ، سیاستدان، مرد، خواتین سب شامل تھے۔ ٹیلی فون پر میری بات صدر صاحب کے ملٹری سیکرٹری کے ساتھ ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں سپریم کورٹ میں بیٹھے جج کی حیثیت سے اس کانفرنس میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا اور یہ کہ میں آ تو جاؤں گا مگر مجھے تقریر کرنے کے لیے نہ کہا جائے۔ سو طے یہی ہوا کہ مجھے تقریر کرنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ جنرل ضیاء الحق کانفرنس کی سربراہی کر رہے تھے۔ ہر مقرر کو بذاتِ خود بلاتے اور تقریر کرنے کو کہتے۔ بعض نہایت اہم شخصیات مثلاً بیگم شائستہ اکرام اللہ، اے کے بروہی وغیرہ مقررین میں موجود تھے اور ان کی تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ مگر جنرل ضیاء الحق نے اپنے ریمارک دیتے ہوئے اعلان فرما دیا کہ ہم جاوید اقبال کے خیالات بھی ضرور سنیں گے۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میرے پہلو میں مجید نظامی بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ طے تو یہی ہوا تھا کہ میں صرف تقاریر سنوں گا، نیز میرے پاس تو تقریر بھی لکھی ہوئی نہیں۔ بہر کیف ان کے کہنے پر میں نے وہیں بیٹھے جلدی سے اپنی تقریر لکھی اور جب مجھے بلوایا گیا تو میں نے وہی تقریر پڑھ ڈالی۔ تقریر اردو میں تھی اور میرا مؤقف مختصراً یہ تھا: وطن عزیز کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ہم نے قائداعظم کے نظریات سے انحراف کیا اور اب اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ بانیٔ پاکستان کے نظریات کی طرف ازسرِنو رجوع کیا جائے۔ اپنی تقریر کے دوران میں نے جنرل ضیاء الحق کی ''اسلامائزیشن'' کو تنقید کا نشانہ بنایا اور خصوصی طور پر حدود آرڈیننس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ اس کے تحت (ثبوت کے مشکل معیار کی بنا پر) کسی مجرم کو سزا دے سکنا ممکن نہیں، لہٰذا یہ قانون نمائشی ہے۔ ہمارے ضابطوں پر محض سرخی پاؤڈر لگانے کے مترادف ہے اور ایسے قانون کو نافذ کر کے احکامِ الٰہی کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ تقریر کے اختتام پر علماء حضرات نے شور و غل مچانا شروع کر دیا کہ گزشتہ چودہ سو سالوں میں کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ احکامِ الٰہی کو ''کالعدم'' قرار دیا جائے۔ (میں نے یہ کب کہا تھا کہ احکامِ الٰہی کو ''کالعدم'' قرار دیا جائے، لیکن بدقسمتی سے ہمارے علمائے کرام جب کوئی منطقی دلیل پیش نہ کر سکیں تو ایسی ہی تخیلی جذباتیت کا اظہار کر کے آپ کے پاؤں کے نیچے سے دری کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔) جنرل ضیاء الحق پہلے تو چند لمحے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے رہے اور علماء حضرات کے شور و غل سے لطف اٹھاتے رہے، پھر یکدم اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سنجیدہ لہجے میں فرمایا: ''علماء حضرات اطمینان رکھیں، ڈاکٹر جاوید اقبال کی سفارشات پر عمل درآمد نہیں کیا جائے گا۔'' (یعنی قائداعظم کے نظریات کی طرف رجوع نہیں ہوگا) اس پر تمام علماء حضرات خاموش ہو گئے اور کانفرنس کی کارروائی جاری رہی۔

ظہر کی نماز کے وقفے میں جنرل ضیاء الحق نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آپ کی وجہ سے تو آج کی محفل میں خوب جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ میں نے عرض کیا کہ طے تو یہی ہوا تھا کہ آپ مجھے تقریر

کرنے کے لیے نہیں کہیں گے۔ ''میں نہ کہتا تو محفل میں جوش وخروش کیسے پیدا ہوتا؟'' انہوں نے شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے فرمایا۔ ظہر کی نماز کے وقت علماء حضرات علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں بٹ گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے مجھ سے کہا کہ آیئے نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے جواب دیا: ''سر! میں بقول علامہ اقبال ان دو رکعتوں کے آئمہ کے پیچھے تو نماز نہیں پڑھوں گا۔ البتہ آپ چونکہ پاکستان میں قوت' شوکت اور اقتدار کا سرچشمہ ہیں' آپ کے پیچھے نماز پڑھنا ضرور پسند کروں گا۔'' مگر جنرل صاحب امام بننے کو تیار نہ ہوئے۔ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ میرا بازو پکڑ کر صف میں کھڑے ہو گئے اور ہم نے ظہر کی نماز یاد نہیں کس کی امامت میں ادا کی۔

چند دنوں کے بعد میرے نام گمنام خطوط آنے شروع ہو گئے کہ تم نے اللہ کے قوانین کو ''کالعدم'' قرار دیا ہے' لہٰذا اس کی عدالت میں تمہیں موت کی سزا مل چکی ہے۔ پس تم فلاں دن کا سورج چڑھتے نہ دیکھ سکو گے۔ وغیرہ۔ میں نے یہ خطوط جنرل ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری کو انہیں دکھانے کے لیے اپنے عریضہ کے ساتھ ارسال کر دیئے کہ آپ نے میرا منہ کھلوا کر پنجابی کے ایک نہایت ہی ''غلیظ'' محاورے کے مطابق مجھ سے ایسا گناہ سرزد کروایا ہے جس کی پاداش میں مجھے مرنا قبول نہیں۔ جواب میں ان کے ملٹری سیکرٹری نے تحریر کیا۔ جنرل صاحب فرماتے ہیں کہ آپ اپنا مشن جاری رکھیں' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

ایک ماہ گزرنے کے بعد موٹر سائیکل پر سوار دو نوجوانوں نے جاتے جاتے لاہور میں میرے گھر کے مین گیٹ پر لگی شیشے کی بتیاں پتھر مار کر توڑ دیں' حالانکہ سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے مجھے پولیس گارد ملی ہوئی تھی۔ میں نے ایس ایس پی لاہور کو اپنے چیمبر میں طلب کیا اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ کہنے لگے کہ خفیہ کی رپورٹوں کے مطابق ملک میں غربت وافلاس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی' لسانی اور نسلی انتہا پسندی روز بروز نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ خدا جانے وہ آئندہ کیا صورت اختیار کرے۔ اس لیے آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔ میں فی الحال آپ کے تحفظ کی خاطر کمانڈو فورس کا تقرر کر دیتا ہوں۔ سو اسلحہ بردار کمانڈو فورس کا تقرر کر دیا گیا' مگر چند ماہ بعد میں اس کمانڈو فورس سے اتنا بیزار ہو گیا کہ اسے رخصت کر دیا۔

جنرل ضیاء الحق سے میری آخری ملاقات لاہور میں لڑکیوں کے کنیئرڈ کالج میں ہوئی۔ وہ کالج کی کانووکیشن کی صدارت کی خاطر گورنر سجاد حسین قریشی کے ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں بھی ناصرہ کے ساتھ اس تقریب میں شریک تھا اور پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ جنرل صاحب اپنی لکھی ہوئی تقریر سے کبھی کبھار ہٹ کر ایک آدھ مذاقیہ جملہ منہ زبانی جڑ دیتے تھے جس پر قہقہہ پڑ جاتا۔ ایک مرحلے پر اسی طرح عینک اتار کر انہوں نے لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''آپ مجھے پاگل ملامت سمجھیں' میری بیٹی بھی

ڈاکٹر ہے اور شادی ہو چکنے کے باوجود اپنی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہے'' اس پر بڑی تالیاں بجیں۔ تقریب کے اختتام پر چائے کے دوران چند لڑکیوں کے ساتھ میری موجودگی میں کھڑے تھے۔لڑکیاں ان کے غیر متوقع ''لبرل ازم'' پر تعجب کا اظہار کر رہی تھیں۔ آپ نے اچانک ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا اور لڑکیوں سے کہا ''میں نے یہ بات اس لیے نہیں کی کہ ڈاکٹر جاوید اقبال وہاں بیٹھے تھے۔'' مجھے معاً احساس ہوا کہ جنرل صاحب اتنے ہی مسلمان ہیں جتنے بھٹو صاحب تھے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایک نے اسلام کو اپنے اقتدار کی ڈوبتی کشتی کے تحفظ کی خاطر استعمال کیا اور دوسرے نے اسے اپنے اقتدار کے چڑھتے سورج کے استحکام کے لیے۔ مجھے پہلا مارشل لا لگنے پر سکندر مرزا کے اعلان کی یاد نے شرمندہ کر دیا۔ ہم سیاسی مقاصد کی خاطر کب تک اسلام کو بطور ''طوائف'' استعمال کرتے رہیں گے۔ کیا ہمارے نصیب میں اپنے قائدین کے ہاتھوں سدا الو بنتے رہنا ہی لکھا ہے؟

سپریم کورٹ میں میرے تین برس کے قیام (۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۹ء) کے دوران کوئی اہم کیس ہمارے ہاتھ سے نہ گزرا۔ ہم اسلام آباد لاہور' کراچی یا پشاور بیٹھے عام قسم کی اپیلیں سنتے رہے اور ان کے فیصلے کرتے رہے۔ دراصل دستور کی احیا اور غیر جماعتی انتخابات کے بعد محمد خان جونیجو کی مسلم لیگی حکومت کے دوران اتنی دیر کوئی معرکتہ الآ را دستوری مسئلہ نہ اٹھا' جب تک کہ جنرل ضیاء الحق نے بطور صدر پہلی مرتبہ اپنا اختیار دستور کے آرٹیکل ۵۸ (۲) (ب) کے تحت استعمال کرتے ہوئے محمد خان جونیجو کی حکومت کا خاتمہ اور اسمبلیوں کو تحلیل نہ کر دیا جب یہ مسئلہ سپریم کورٹ میں اٹھایا گیا تب جنرل ضیاء الحق زندہ تھے' مگر معاملہ ابھی زیرِ بحث تھا کہ جنرل ضیاء الحق ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ (ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اگر حادثہ دہشت گردی کے سبب رونما ہوا تو اس کا محرک کون تھا: روس یا امریکہ یا اسلامی انتہا پسندی؟)

معاملہ پورے کورٹ کے سامنے پیش تھا اس لیے میں بھی اس اہم کیس کی سماعت میں شریک تھا۔ ججوں کا بحیثیت مجموعی قیاسی رجحان یہی تھا کہ آرٹیکل ۵۸ (۲) (ب) کے تحت اختیار کے استعمال کا انحصار صدر کی ''داخلی تسلی'' پر نہیں بلکہ کورٹ کو ایسے اختیار کے استعمال کے ''خارجی ریویو'' کا حق حاصل ہے۔ لیکن اس کیس میں محمد خان جونیجو نے اسمبلی سے باہر نکلتے وقت یہ اعلان کر دیا تھا کہ ان کی جماعت دوبارہ انتخابات لڑنے کو تیار ہے۔ ہم میں سے بعض ججوں کا خیال تھا کہ جونیجو صاحب کو بلا کر پوچھا جائے کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ مگر زیادہ تر ججوں کی رائے یہی تھی کہ جب انہوں نے بذاتِ خود الیکشن لڑنے کا اعلان کر دیا ہے تو پھر ان سے مزید پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بالآخر یہی رائے ہم سب نے اختیار کر لی۔ یعنی اختیار کا استعمال تو درست نہ تھا مگر جب لیڈر آف دی ہاؤس نے خود ہی الیکشن میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے تو پھر از سر نو الیکشن ہی ہونے چاہئیں۔

اس کیس کے بارے میں بعد میں ''ہوائی'' بھی اڑائی گئی کہ اس وقت کے آرمی چیف یعنی جنرل مرزا اسلم بیگ نے بذریعہ وسیم سجاد سپریم کورٹ کو کہلوا بھیجا تھا کہ مقدمہ کا فیصلہ جونیجو صاحب کے حق میں نہ کیا جائے۔ مگر وسیم سجاد نے ایسا کوئی پیغام چیف جسٹس حلیم تک پہنچانے سے انکار کیا۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے کیس کی سماعت کے دوران ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ پس ظاہر ہے یہ ''ہوائی'' جنرل مرزا اسلم بیگ نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اڑائی اور ہوائی ہی کے طور پر اڑتی ہوئی ختم ہو گئی۔

۴-اکتوبر ۱۹۸۹ء کو میں سپریم کورٹ سے ریٹائر ہوا۔ ریفرنس میں دیگر احباب کے تعریفی کلمات کے جواب میں میں نے جو کچھ کہا وہ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی تروتازہ ہے۔ میں نے عرض کیا:

آپ میں سے شاید بعض احباب کو علم ہو کہ میں دراصل جہانِ عدلیہ میں داخلے کا امیدوار نہ تھا بلکہ ابتدا ہی سے میں نے اپنی تعلیم و تربیت اس نہج پر کی کہ ملک و ملت کی خدمت سیاسیات کے میدان میں کروں گا اور وکالت کا پیشہ محض اس لیے اختیار کیا کہ آزادی سے روزی کما سکوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کی انفرادی زندگی کے ساتھ مختلف قسم کی تقدیرات اس کی آئندہ زندگی کے لیے اچھے یا برے امکانات کی صورت میں وابستہ ہیں۔ انسان کو چونکہ انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے' لہٰذا وہ حالات کے زیرِ اثر اپنی دانست کے مطابق اپنی تقدیر خود بدلتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے انسانی زندگی کوئی پہلے سے کھنچا ہوا خط نہیں بلکہ ایک ایسی لکیر ہے جو ولادت سے لے کر مرگ تک کے سفر میں ہماری اپنی اپنی منشا کے مطابق کھنچ رہی ہے۔ بعض فیصلے غلط ہو جاتے ہیں' ان کا خمیازہ کہیں نہ کہیں بھگتنا پڑتا ہے۔ بعض صحیح نکل آتے ہیں اور یہاں یا وہاں اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔ بعض کے متعلق انسان کا اپنا ذہن صاف نہیں ہوتا۔ یعنی فیصلہ اتفاق یا حادثہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان اپنی مختصر ارضی زندگی میں کبھی خوشی و مسرت اور کبھی تذبذب یا پیچ و تاب کے عالم میں گزار دیتا ہے۔

اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے کچھ مدت تک سیاسیات کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ ملک کی سالمیت کے تحفظ اور قومی یک جہتی کی بقا کی خاطر اس کی نظریاتی اساس کی اہمیت پر زور دیتا رہا۔ لیکن اس زمانے میں ہم میں سے اکثریت کی توجہ کئی اور سمتوں کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ اس لیے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے فیصلہ بدلنے کی دو اہم وجوہ تھیں۔ اوّل یہ کہ مجھے انتخابات کے دوران ایک ایسی ہستی کے ساتھ مقابلے میں ناکامی ہوئی جو بعد میں وزیرِاعظم کی حیثیت سے عسکری استیلا کا نشانہ بنی اور اسی عدلیہ کے ہاتھوں اسے موت کی سزا دی گئی۔ دوم یہ کہ پاکستان ٹوٹ کر دو حصوں میں بکھر گیا اور آج تک

حتمی طور پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ ملک کے ٹوٹنے کا سبب عسکریت تھی یا جمہوریت۔ عسکریت واقعی ملک توڑ سکتی ہے۔ مگر اس حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ رواداری اور باہمی اعتماد کی عدم موجودگی میں غیر منظم' فاقہ کش اور بے روزگاری کے عارضے میں مبتلا پسماندہ ملکوں میں جمہوریت بھی معاشی تباہ حالی' سیاسی عدم استحکام اور قومی انتشار کا سبب بن کر اسی قسم کا کرشمہ دکھلا سکتی ہے۔ بہرحال یہ دو ایسے سانحے تھے جو کسی بھی داعئ جمہوریت اور محبِ وطن پاکستانی کو ہلا کر رکھ سکتے تھے۔ سو میں نے مایوسی اور نا اُمیدی کے عالم میں اپنا فیصلہ تبدیل کیا اور ۱۹۷۱ء میں سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک پناہ گزین کی حیثیت سے قصرِ عدل میں داخل ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت اس نوزائیدہ مملکت کی عدلیہ کا بڑا وقار تھا اور اس توقیر کا سبب اس کے ضمیر کی آزادی اور قانون کی بالادستی کا اصول تھے' جس کے سامنے انتظامیہ سمیت ہر کوئی سر تسلیم خم کرتا تھا۔ سو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابتدائی گیارہ برس کی مدت تک پاکستان میں عدلیہ کے طلوع کا مشاہدہ کیا گیا۔

۱۹۵۸ء سے وقارِ عدلیہ کے غروب کی داستان شروع ہوتی ہے۔ عدلیہ دراصل آئین کی مخلوقات میں سے ہے۔ اگر آئین ہی معطل کر دیا جائے تو اس کے وقار کا تہہ و بالا ہونا یا قانون کی بالادستی کا خاتمہ ہونا لازمی امر ہے۔ پس یہی کچھ ایوبی دورِ استبداد میں ہوا۔ ۱۹۵۸ء کے آئین کی فاتحہ پڑھی گئی اور ''دوسو'' کیس میں عدالت عظمیٰ نے اس کی تائید کرتے ہوئے فرما دیا کہ غصب اقتدار اگر کامیاب ہو تو بجائے خود ایک نئے قانونی نظام کے نفاذ کا محرک ہوتا ہے۔ یوں عدلیہ کے پر کترے گئے اور اس کا دائرۂ اختیار محدود کر دیا گیا۔ بالآخر پاکستان اپنی تاریخ میں ایوبی دورِ استبداد سے نکل کر یحییٰ خانی دورِ استبداد میں داخل ہوا۔

میں اس پر آشوب زمانے میں عدلیہ سے منسلک ہوا اور اب تک جو دیکھا یا محسوس کیا ہے' آپ کے روبرو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ انتظامیہ کا عدلیہ پر تسلط بدستور تھا۔ ضمیر کی آزادی اتنی ہی محدود تھی جتنا کہ دائرہ اختیار۔ وقار کو گہن لگ چکا تھا' کرسی انصاف پر بیٹھ کر عدل گستری کرتے وقت منہ کا ذائقہ کڑوا رہتا تھا۔

بہرکیف انتخابات اور ملک کے دولخت ہو جانے کے بعد بچے کھچے پاکستان میں ۱۹۷۳ء سے آئینی جمہوریت کے دور کا از سرِ نو آغاز ہوا۔ عدالت عظمیٰ نے کروٹ بدلی اور ''دوسو'' کیس کے متنازعہ اصول کو غلط قرار دیتے ہوئے جنرل یحییٰ خان کو غاصب ٹھہرایا۔ ججوں کو کئی مراعات عطا کی گئیں جن سے ان کی مالی حالت تو بہتر ہو گئی لیکن عدلیہ کے وقار کی بحالی

نہ ہوئی۔ مقدمات کی بھرمار' عدالتوں میں ججوں کی کمی' اہل کاروں کی بدعنوانی' فیصلوں میں تاخیر اور اخراجات کی زیادتی ایسے مسائل کے پس منظر میں سستے' جلد اور آپ کی دہلیز پر انصاف کا نعرہ بلند ہوا۔ مگر یہ مسائل حل کر کے قانون کی بالادستی کے اصول کو آگے نہ بڑھایا گیا۔ بلکہ عدلیہ پر انتظامیہ کا شکنجہ مضبوط رکھنے کی خاطر اصرار کیا گیا کہ روایتی عدالتیں ناکام ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ ''پیپلز کورٹ'' یا عوامی عدالتیں ہی مخلوقِ خدا کو ارزاں' فوری اور آسان انصاف مہیا کر سکیں گی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ایسی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جاتا' ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو عسکری آمریت نے ایک بار پھر آئینی جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا اور ملک کی گردن پر تیسرا مارشل لا آ سوار ہوا۔ ۱۹۷۳ء کا آئین معطل ہونے پر وہی پرانا سوال پھر اٹھا کہ مارشل لا کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ یہ مقدمہ بھی عدالتِ عظمیٰ نے سنا اور متفقہ طور پر فیصلہ صادر فرمایا کہ ملک میں نظم و نسق کی ابتری کے سبب اضطرار کی کیفیت میں محدود وقت کے لیے اقتدار کا غصب کیا جانا جائز ہے۔

غصبِ اقتدار کے جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق ہمارے معروف فیصلے بظاہر عدالتی تضاد مگر بباطن بے بسی کی ایک ایسی عجیب و غریب تصویر پیش کرتے ہیں جس کے دُہرائے جانے کے امکان کو مکمل طور پر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ فیصلے ایک مسلم ملک میں جمہوریت کے مسلسل بحران کی عکاسی ہے۔

تاریخ اسلام غصبِ اقتدار سے غیر مانوس نہیں۔ اسی سبب روایتی فقہ میں الماوردی جیسے فقہا نے استیلا کو شرعی طور پر جائز قرار دیا ہے' بشرطیکہ غاصب امیر مسلمانوں کی عبادات میں مداخلت نہ کرے اور قانونِ اسلامی کے نفاذ کا عہد کرلے۔ جناب شاہ ولی اللہ نے تو اسلامی حکومت کے قیام کے جائز طریقوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صاف ارشاد فرما رکھا ہے کہ وہ صرف تین ہیں: یعنی انتخاب' نامزدگی اور غصب۔

بہرحال یہ تصورات روایتی فقہ کے ہیں۔ لیکن جیسے کہ قرارداد مقاصد سے عیاں ہے بانیانِ پاکستان کا نقطہ نگاہ اصلاحی تھا۔ اس لیے انہوں نے اسلامی حکومت کے انعقاد کے لیے صرف انتخاب ہی کو صحیح طریقہ سمجھا اور جمہوری نظام کو اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع قرار دیا۔ پاکستان بجائے خود انتخاب ہی کی بنیاد پر وجود میں آیا اور یہاں اگر عدالتی ضمیر کی آزادی یا قانون کی بالادستی کا فروغ ممکن ہے تو صرف آئینی جمہوریت ہی کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ مگر پاکستان کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ اصلاحی اندازِ فکر اپنانے کے لیے جس تحمل اور برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ نہ اپنایا جا سکا۔ چنانچہ غصبِ اقتدار کے جائز یا ناجائز ہونے

کے بارے میں ہمارے فیصلے تو قوم کی اس پچپن سالہ کشمکش کا قانونی زبان میں اظہار ہے۔

ضیائی دورِ استبداد میں عدلیہ کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ اب تک تو اس کے زوالِ اقتدار کا مسئلہ پاکستان کا داخلی مسئلہ تھا مگر اس عہد میں بین الاقوامی معاشرے میں بھی اس کی آزادیٔ ضمیر پر نکتہ چینی کی گئی اور عام تاثر جو مہذب دنیا میں پھیلا وہ یہی تھا کہ یہاں کی عدلیہ انتظامیہ کی گود میں بیٹھ کر فیصلے صادر کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ عدالتوں کے کئی ججوں سے عدلیہ کو محروم کر دیا گیا۔ باقیوں کو مارشل لائی فرمانوں کے تحت متعدد بار قسمیں دلانے کے باعث ہر جج کی انفرادی ذات موضوعِ بحث بن گئی جو عدلیہ سے وابستہ رہے، وہ معتوب ٹھہرے کہ استبداد کا ساتھ دے رہے ہیں جو راندۂ درگاہ فارغ کر دیئے گئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو شہیدوں میں شمار کیا اور جو استعفیٰ دے کر رخصت ہوئے، وہ اپنے آپ کو غازی سمجھنے لگے۔ غرضیکہ اس امتیاز کے سبب نہ صرف عدلیہ پر سے عوام کا اعتماد اٹھ جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا بلکہ اہلِ عدل کی غیر جانبداری کے متعلق شبہ کا اظہار کیا جانے لگا اور الزام عائد کیا گیا (جس کی بازگشت وقتاً فوقتاً سنائی دیتی رہتی ہے) کہ ذاتی منفعت کا شیطان ان کے دلوں میں آ کر بیٹھ گیا ہے۔ ستم ظریفی کی حد تو یہ ہے کہ معتوبانِ عدلیہ کے چند اہم فیصلوں ہی سے بالآخر اس ملک میں جمہوریت کے انعقاد کی راہ ہموار ہوئی اور شہیدان و غازیانِ عدلیہ کی امید بھی بندھی کہ اب جمہوریت انہیں تاج پہنا کر واپس لائے گی۔

اس دور میں سستے، فوری اور آسان انصاف کی فراہمی کے لیے ''قاضی عدالتوں'' کے اجرا کا غوغا بلند کیا گیا اور ایک مرحلے پر تو یہ گمان غالب تھا کہ ملک میں قائم موجودہ عدالتی نظام کا کام مکمل طور پر تمام کر دیا جائے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ گولی کان کے قریب سے نکل گئی اور عدلیہ پر انتظامیہ کی گرفت مضبوط رکھنے کی خاطر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

اب گزشتہ دس ماہ سے اس ملک میں ایک بار پھر آئینی جمہوریت کا دور دورہ ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں عدالتِ عظمیٰ کے ان اہم فیصلوں میں شریک رہا ہوں جن کے ذریعے پاکستان میں جمہوریت کے انعقاد کی راہ ہموار ہوئی۔ مزید برآں اگر آتے وقت نہیں تو کم از کم جاتے وقت میں اسے ایک ایسے مرحلے پر الوداع کہہ رہا ہوں جب اس کی آزادیٔ ضمیر کے استحکام اور قانون کی بالادستی کے فروغ کے لیے فضا سازگار ہے۔ مجھے اس بات پر بھی خوشی ہے کہ ان فیصلوں میں آئین کی تعبیر صرف قانون ہی کی روشنی میں نہیں بلکہ پاکستان کے مفاد کو ملحوظ خاطر رکھ کر کی گئی ہے۔

آئین نافذ رہتا ہے تو عدلیہ کی آزادیٔ ضمیر اور قانون کی بالادستی کا اصول قائم رہ

سکتے ہیں۔ نیز انتظامیہ سے آزاد اور مکمل طور پر غیر جانبدار عدلیہ پر اگر اعتماد کو فروغ حاصل ہو تو جمہوری نظام میں مرکز اور صوبوں کے درمیان تمام نزاعی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ مختلف جمہوری ملکوں کی ابتدائی تاریخ اسی بات کی شاہد ہے کہ ان کی آئینی جمہوریت کو مستحکم کرنے اور قومی یک جہتی کو برقرار رکھنے میں اعلیٰ عدالتوں نے کتنی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ لیکن دوسری طرف آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب پاکستان ٹوٹا تو اُس وقت ہمارے ملک میں کوئی آئین نافذ نہ تھا۔ مارشل لا کی لاقانونیت البتہ موجود تھی، مگر اندھیرے کا اپنا کوئی مثبت وجود نہیں ہوتا، صرف روشنی کے نہ ہونے کو اندھیرا کہا جاتا ہے۔ سو ملک ٹوٹا تو ایسی ہی تاریکی کے عالم میں ٹوٹا۔ پس پاکستان کی سالمیت کے تحفظ اور قومی یک جہتی کی بقا کی خاطر وفاق اور صوبائی خود مختاری کے مابین ہر نزاعی مسئلہ کو عدلیہ ہی کے ذریعے سلجھانا چاہیے اور اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اس ملک میں آئینی جمہوریت کی تقویت اور تسلسل کا تمام تر انحصار عدلیہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے پر ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے انتظامیہ کے شکنجہ سے کلی طور پر آزاد رکھنے کی کوشش کی جائے اور ملک کے سیاسی قائدین پر رائے عامہ کا مسلسل دباؤ ہو کہ تنازعوں کے حل کے لیے باہمی تصادم کا رستہ اختیار کر کے کسی اور کو مداخلت کا موقع فراہم کرنے کی بجائے عدلیہ کا رخ کرنے کی عادت ڈالیں۔ قانون اپنے ہاتھ میں مت لیں بلکہ حق بجانب ہیں تو اپنے آپ کو قانون کے ہاتھ میں دینے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ قانون کی بالادستی سے یہی مراد ہے۔

میں نے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ میرا یہ روپ اب اختتام پذیر ہوتا ہے۔ آئندہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق کچھ کہہ سکنا ابھی ممکن نہیں۔ ماضی گزر چکا، مستقبل کو ہنوز وجود میں لانا ہے، البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میرے حال کی زندگی اس محبت اور شفقت کی خوشبو سے معطر ہے جو مجھے میرے رفقائے کار اور آپ سب کی طرف سے گزشتہ برسوں میں ملی اور جس کی یاد میرے دل میں ہمیشہ شگفتہ رہے گی۔ مجھے ورثے میں جو نظریۂ حیات ملا ہے، وہ یہی ہے کہ حیات خوب سے خوب تر کی تحصیل کے لیے تگ و دو کا نام ہے اور یہ تگ و دو صرف اسی جہان تک ہی محدود نہیں بلکہ حیات بعد موت کے عالم میں بھی جاری و ساری رکھی جانی چاہیے۔ اس لیے ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

باب ۱۱

مستقبل کی تعمیر

میرے منجم کے اندازے کے مطابق ۱۵ جولائی ۱۹۸۲ء سے لے کر ۲۱-اکتوبر ۱۹۸۴ء تک کا عرصہ ایسا ہوگا جس کے دوران میرے ستارے آپس میں ہم آہنگی کی بجائے ٹکراؤ کی صورت اختیار کرنے لگیں گے اور اس ٹکراؤ کے زیر اثر یہ وقت میری ارضی زندگی کا آخری دور ہوگا۔ مگر ظاہر ہے میرے منجم کا حساب کتاب درست نہیں نکلا یا ممکن ہے میں نے اس دور سے گزرتے ہوئے اپنی تقدیر بدل لی ہو۔

۴-اکتوبر ۱۹۸۹ء کو سپریم کورٹ سے ریٹائرمنٹ پر میں نے سامان اسلام آباد کے ریسٹ ہاؤس سے اٹھایا اور اپنے گھر لاہور آ گیا۔ میرا سب سے پہلا مقصد اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر کوئی کام تلاش کرنا تھا۔ میں نے سیاست چھوڑ کر ججی قبول کی تھی اور اب ججی کا چغا بھی اتار پھینکا تھا۔ اس سے پیشتر مصوری اور مجسمہ سازی کے شغل کو اس لیے خیر باد کہا کہ مجھ میں ایک اچھا آرٹسٹ بن سکنے کی اہلیت نہ تھی اور درمیانہ آرٹسٹ بننا میری فطرت کو قبول نہ تھا۔ البتہ ڈرامہ نویسی میں چند ایک نئے تجربے کرنے کی کوشش کی، لیکن پاکستان میں سنجیدہ ڈراموں کے لیے اسٹیج کی عدم موجودگی کے سبب اس صنف کا مستقبل مجھے دکھائی نہ دیتا تھا۔ جہاں تک ریڈیو یا ٹی وی کے لیے ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے تو ان اداروں کا سنسر نہایت مایوس کن تھا۔ عجیب وغریب قسم کے اعتراضات اٹھائے جاتے تھے اور جدّت پسندی کو بدعت سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً میں نے ٹی وی کے لیے ''محمد بن قاسم'' کے موضوع پر نئے انداز میں ڈرامہ لکھا۔ اعتراض ہوا کہ سندھ میں راجہ داہر کے قبیلے کے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ میں نے ''سم'' نامی ایک کھیل تحریر کیا جس میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ حیات بعد موت کی تحصیل ہر کسی کا حق نہیں بلکہ صرف وہی اس انعام کے مستحق ہوں گے جو اپنی موجودہ زندگی میں کوئی تخلیقی کام کر جائیں۔ تمثیل علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات بعد ممات پر مبنی تھی اور مقصد ایک بے حس قوم کو تخلیقی یا کارہائے نمایاں انجام دینے کی اہمیت کا احساس دلانا تھا۔ لیکن ٹی وی کا اعتراض تھا کہ یہ تصور اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ''سلطان مراد اور معمار'' نامی ڈرامہ (جو علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم سے ماخوذ تھا) عدلیہ کے روبرو مساوات اور قصاص کے اسلامی اصولوں پر مبنی تھا۔ تمثیل کا اہم نکتہ یہ

تھا کہ مجرم کو قصاص کے طور پر معاف بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر ڈرامہ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ٹیلی کاسٹ کیا گیا' حالانکہ ان کے ٹرائل کے دوران ٹی وی والوں نے ریکارڈ کیا تھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ بقول شاعرہ منصورہ احمد ''ٹی وی ایک غلام ادارہ ہے جہاں تخلیق کار کو ''پالِیسی'' کی قربان گاہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔'' اسی سبب میں نے بالآخر ڈرامہ نویسی سے توبہ کرلی۔ بہرحال بنیادی طور پر ایک لکھنے پڑھنے والے شخص کی حیثیت سے میں لکھنے پڑھنے کے سوا اور کس کام کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ میں نے کلام اقبال کے اردو حصے کی تشریح لکھنے کا ارادہ کیا اور اس پر کام بھی شروع کر دیا۔ مگر یہ کام اسی طرح ادھورا رہ گیا جیسے بڑی محنت سے میری تحریر کردہ ''رضیہ سلطان'' نامی تمثیل ادھوری رہ گئی تھی۔ (اس طویل یونانی المیہ کی طرز کے ڈرامے میں میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلامی تاریخ میں شیطان نے کیا کردار ادا کیا ہے اور کس طرح ہماری نہایت اہم تاریخی ہستیاں خلفائے راشدین کے زمانہ سے لے کر اب تک اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی مانند کھیلتی چلی آرہی ہیں۔ شاید بہتر تھا کہ یہ ڈرامہ مکمل نہ ہوسکا کیونکہ ہم تو اپنی بری بھلی تاریخ کو بھی مذہب کا حصہ قرار دیتے ہوئے مقدس سمجھتے ہیں۔)

میری جنم پتری میں ایک بات درست تحریر ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میری زندگی میں سفر ہی سفر ہے۔ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا جب مجھے ملک سے کسی نہ کسی بہانے باہر نہ جانا پڑے۔ میں سفر سے تنگ بھی آجاؤں تو سفر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہی صورت جنوری ۱۹۹۰ء میں پیدا ہوئی۔ جب حکومتِ عراق نے بین الاقوامی اسلامی معاملات کی سپریم کونسل کا اجلاس بغداد میں طلب کیا۔ میں اور ناصرہ اس اجلاس میں شرکت کے لیے بغداد پہنچے۔ (میری او آئی سی کے ساتھ وابستگی کی بنا پر مجھے مدعو کیا گیا تھا۔) اراکین کی ملاقات صدام حسین سے کرائی گئی اور بعد ازاں ان کی کیبنٹ کے ایک وزیر کی صدارت میں اجلاس کی کارروائی بمطابق معمول ہوتی رہی۔ مگر عراق میں جو زیارات ہیں انہیں دیکھے بغیر کسی بھی مسلمان کی دینی اور تمدنی تعلیم صحیح معنوں میں مکمل نہیں ہوتی۔ اے کاش! پاکستان کے تعلیمی ادارے اتنے آسودہ حال ہوسکیں کہ طلباء اور طالبات کے وفد مسلم ممالک میں زیارات کو دیکھنے کے لیے جانے لگیں۔ بغداد میں عباسی خلفاء کے تعمیر کردہ محلات کے کھنڈر مثلاً دریائے دجلہ سے ہٹ کر محل ''سر من را'' (خوش ہوا جس نے دیکھا) دریائے دجلہ اور دریائے فرات' دریائے دجلہ پر وہ مقام جہاں منصور حلاج کی لاش کی راکھ پھینکی گئی تھی۔ (یہاں کی روایت کے مطابق منصور حلاج کو سولی پر چڑھانے کے بعد ان کی لاش جلا دی گئی تھی۔ لیکن ہمیں ایک پاکستانی دوست منصور حلاج کے مزار پر بھی لے گئے جو بغداد کے ایک گمنام محلے میں واقع ہے) جنید بغدادی کی درسگاہ جس کے ایک حجرے میں بابا گورونانک نے چلا کاٹا تھا اور اب چند سکھ اس حجرہ کے مجاور ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا مزار' نجف میں حضرت علیؓ کا مزار' وہ چھوٹا سا گھر جس میں حضرت علیؓ شہادت سے قبل

مقیم تھے، وہ مسجد جس میں فجر کی نماز ادا کرنے کی خاطر حضرت علیؓ جا رہے تھے جب ان پر ابن ملجم خارجی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا، میدانِ کربلا، شہر بصرہ جس کی تاریخِ اسلام میں ایک خاص اہمیت ہے اور شمالی عراق کے شہر میں نہایت خوبصورت مسجد کے قریب بند گلی میں وہ مقام جہاں بارویں امام زمین میں غائب ہو گئے تھے۔

جیسے میں نے کہا کہ کسی مسلمان کی دینی اور تمدنی تعلیم عراق میں زیارات دیکھے بغیر مکمل نہیں ہوتی، اسی ضمن میں مزید کہوں گا کہ صرف عراق ہی نہیں بلکہ یمن، سعودی عرب، ایران، اردن، شام، فلسطین، ترکی، مصر، تیونسیہ، مراکو اور اندلس (جنوبی سپین) دیکھے بغیر بھی ایسا ممکن نہیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی دینی اور تمدنی تاریخ بکھری پڑی ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر ملک دیکھے ہیں۔ اگر تاریخِ اسلام کے موضوع پر چند مستند کتب کے مطالعہ کے بعد ان ممالک کا دورہ کیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے عظیم الشان تمدن کے زوال کے اسباب کیا تھے۔

جہاں تک عراق کا تعلق ہے، ہم بغداد کے معروف جدید ہوٹل الرشید میں ٹھہرے تھے۔ بغداد سے باہر ''سر من را'' نامی محل کے کھنڈرات ہیں جسے عباسی خلیفہ معتصم (برادر خلیفہ مامون) نے نویں صدی عیسوی میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ خوبصورت محل دریائے دجلہ کے نظارے کے سبب مشہور تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ معتصم کی حفاظت کے لیے محل کی بارکوں میں دو لاکھ پچاس ہزار ترکی سپاہی موجود رہتے تھے۔ اب اس کے کھنڈرات میں وہاں صرف ایک بلند مینار محفوظ رہ گیا ہے جس کی چکر کھاتی ہوئی اینٹوں کی سڑک پر گھوڑ سوار چالیس پچاس گز اوپر تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ کسی مسجد کا مینار نہیں بلکہ ''واچ ٹاور'' تھا تاکہ محل پر کسی حملہ آور کی حرکات کو دیکھا جا سکے۔

دجلہ اور فرات نامی دو دریاؤں کا ذکر تاریخ اسلام میں بار بار آتا ہے۔ ان کا درمیانی علاقہ بہت زرخیز تھا اور خلفاء راشدین کے زمانے میں ہی یہ تنازعہ چلتا رہا کہ اس زرخیز اراضی کا حقدار کون ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

منصور حلاج وہ صوفی شخصیت ہیں جنہیں ''اناالحق'' کہنے پر مصلوب کیا گیا۔ انہیں یہ سزا اس لیے دی گئی کہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ غالب نے منصور حلاج پر پھبتی کستے ہوئے کہہ رکھا ہے

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم میں وہ تنگ ظرفیٔ منصور نہیں

اقبال کے ''جاوید نامہ'' میں منصور حلاج ہی ان کا تعارف شیطان سے کراتے ہیں اور واضح کرتے

ہیں کہ اگر توحید کا سبق لینا ہے تو شیطان سے حاصل کر کیونکہ وہ عاشق اوّل تھا۔

جنید بغدادی ہی وہ معروف عالم اور مفتی تھے جنہوں نے منصور حلاج کے کفریہ کلمات کی بنیاد پر ان کے خلاف فتویٰ دیا اور انہیں موت کی سزا دی گئی۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ساتویں صدی عیسوی کے معروف عالم دین اور فقہ حنفی کے بانی تھے۔ (پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت حنفی مذہب ہی کی ہے) آپ بغداد میں بحالت اسیری فوت ہوئے۔ خلیفہ منصور نے انہیں بغداد کے قاضی القضات کا منصب سنبھالنے کا حکم دیا۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ خلیفہ منصور نے برہم ہوتے ہوئے کہا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ جواب دیا کہ ایک جھوٹا شخص اس منصب پر کیسے فائز کیا جا سکتا ہے۔ اس پر خلیفہ منصور نے انہیں قید کر دیا۔ بعد ازاں ان کے شاگرد امام ابو یوسف کو حکم ملا کہ قاضی القضات کا منصب قبول کرو۔ امام ابو یوسف جب اپنے استاد سے مشورہ کرنے کے لیے انہیں جیل خانہ میں ملنے گئے تو امام ابوحنیفہ نے انہیں یہ منصب قبول کر لینے کی ہدایت کی۔ فرمایا کہ اگر ہر اہلیت رکھنے والا شخص اس منصب پر فائز ہونے سے انکار کر دے گا تو غیر اہل فائز ہو جائیں گے جن کے سبب عام لوگوں کو انصاف فراہم نہ کیا جا سکے گا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کے حق میں میں نے دیگر جج صاحبان کے روبرو اپنی طرف سے حضرت امام کی یہی دلیل پیش کی تھی۔ مطلب یہ کہ جن جج صاحبان نے اصولاً حلف نہ اٹھایا وہ بھی اپنی جگہ درست تھے اور جنہوں نے آمر کے حکم پر حلف اٹھالیا' وہ بھی غلط نہ تھے۔

نجف میں حضرت علی کا مزار بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ علامہ اقبال نے تعظیماً مدینہ کے ساتھ نجف کی خاک کو بھی اپنی آنکھ کا سرمہ قرار دیا ہے۔ اسی خطے میں حضرت علی کا وہ چھوٹا سا گھر دیکھ کر میں اور ناصرہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے جہاں سے کچھ فاصلہ پر وہ مسجد میں صبح کی نماز ادا کرنے کی خاطر نکلے تھے اور بعد ازاں انہیں اسی گھر میں زخمی حالت میں واپس لایا گیا۔ یہ گھر تین چھوٹے چھوٹے حجروں' دالان اور رسوئی پر مشتمل ہے۔ بیت الخلا باہر ہے۔ یہ معمولی سا گھر حضرت علی کی رہائش گاہ تھا جنہوں نے بقول اقبال سلطانی اور فقیری کو باہم یکجا کر دیا تھا۔ اس مقام پر مجھے عراق کے آمر صدام حسین کا خیال آیا' جو بغداد میں ایک عظیم الشان محل میں رہتے ہیں اور جن کی حفاظت کے لیے محل کی چھتوں پر جا بجا اینٹی ایئر کرافٹ توپیں نصب ہیں۔

میدانِ کربلا دیکھ کر المیہ کربلا نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ یہ سب مقامات خاموشی سے آپ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر بات نہیں کرتے۔ بصرے کی تاریخ اسلام میں عجیب و غریب اہمیت ہے۔ یہاں حضرت علی اور حضرت عائشہ کی فوجوں کے درمیان عبرت ناک جنگِ جمل ہوئی۔ اس جنگ میں' بقول طبری' دونوں طرف سے تقریباً دس ہزار مسلمان مارے گئے جن میں سے اکثریت صحابیوں کی تھی۔ مدینہ میں اس کا

پتہ یوں چلا جب گدوں اور چیلوں نے لوگوں کے تلواروں سے کٹے اعضاء شہر پر پھینکے۔

بہرحال یہ تو عراق میں اسلامی زیارات کا مختصر تذکرہ تھا۔ مگر جب بابل اور نینوا کے کھنڈرات میں گھوما جائے تو موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی یاد آ جاتی ہے۔ ایک بات واقعی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ یہ کہ اس خطے میں اللہ تعالیٰ نے اتنے پیغمبر کیوں نازل کیے؟ کیا یہ خطہ دنیائے قدیم کا مرکز سمجھا جاتا تھا؟ قبل اسلام کی تہذیب بابل ونینوا نے ہی دنیا کا پہلا فقیہہ یا قانون دان ہمورابی (۱۷۹۲ تا ۱۷۵۰ قبل مسیح) پیدا کیا۔ اس تہذیب کے جو آثار اب باقی ہیں وہ ہیں اسدِ بابل کا مجسمہ، لٹکتے باغات کے کچھ معدوم حصے، مینارِ بابل کی بنیاد اور اشتر دروازہ۔ عہد قدیم کا ہر فرمارواا اپنے کارہائے نمایاں کا پتھر کی سلوں پر اعلان کرتے ہوئے اپنی خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ تاریخِ اسلام میں بھی کئی سلاطین نے اس روش پر چلتے ہوئے ظلِ الٰہی (خدا کا سایہ) ہونے کے دعوے کیے۔ مگر ان سب کے مقابلے میں غرناطہ (اندلس) کے اموی خلفاء کا محل الحمرا اپنی شان و شوکت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے روبرو عجز کی ایک تنہا مثال ہے کیونکہ وہاں ہر مقام پر یہی عبارت کندہ ہے: لاغالب الااللہ۔

بغداد ہی وہ شہر تھا جس کا ذکر الف لیلےٰ میں ایک عجیب وغریب شہر کی صورت میں آتا ہے جس کے بازار، حمام، محلات، باغات، کتب خانے اور مدرسے دنیا بھر میں مشہور تھے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہوا بلکہ جلا دیا گیا۔ آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ کو ہلاکو خان کے حکم پر غالیچے میں لپیٹ کر ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا، تاکہ اس کے خون کا کوئی قطرہ زمین پر نہ بہے کیونکہ ضعیف الاعتقاد منگولوں کو ان کے نجومیوں نے بتا رکھا تھا کہ اگر پیغمبر اسلامؐ کے خاندان کے کسی فرد کا خون زمین پر گرا تو زمین و آسمان تہہ وبالا ہو جائیں گے۔

اسی سال سلجوق یونیورسٹی (قونیہ) نے مجھے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کی خاطر ترکی مدعو کیا، چنانچہ میں قونیہ پہنچا۔ بمطابق معمول مولانا رومی کے مزار پر حاضری دی اور اسی احاطے میں علامہ اقبال کی فرضی تربت پر فاتحہ پڑھی۔ اس تربت کے قریب ترکی کے معروف شاعر عاطف کی قبر بھی ہے۔ سلجوق یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر جن چند بار پاکستان آ چکے ہیں اور ہم ایک دوسرے کو دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں مل چکے تھے۔ اس مرتبہ سلجوق یونیورسٹی کی کانفرنس میں ترکی کی تمام یونیورسٹیوں کے ریکٹر موجود تھے۔ کانفرنس شروع ہونے سے پیشتر مجھے اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ پروفیسر جن نے میرے حق میں دیئے گئے ریفرنس میں خصوصی طور پر ذکر کیا کہ مجھے ترکی کے اسلامی تمدن کے عمیق مطالعہ کی روشنی میں اسلام کی جدید تمناؤں سے دنیا بھر کو روشناس کرانے کے صلے میں ''اسلامک لٹریچر اور سائنس'' کی اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی جاتی ہے۔

کانفرنس کا موضوع ترکی ادبیات تھا۔ میں اس کی چند نشستوں میں شریک ہوا۔ مگر میری دلچسپی کا اصل سبب مولانا رومی کے جگری دوست شمس تبریزی سے متعلق نئی تحقیق تھا۔ مولانا، شمس تبریزی کے عاشق تھے۔ یہاں تک کہ اپنا ایک دیوان (دیوانِ شمس تبریز) ان کے نام سے تحریر کر دیا۔ ایک دن شمس تبریزی اچانک غائب ہو گئے اور مولانا ان کے فراق میں آنسو بہاتے رہے۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں چلے گئے ہیں۔ مولانا نے ساری عمران کے فراق میں روتے گزار دی۔ اب نئی تحقیق کے تحت یہ راز کھلا ہے کہ شمس تبریزی کو مولانا کے بیٹے سلطان ولد اور دیگر عزیزوں نے مل کر قتل کروا دیا تھا اور بعد ازاں ان کی لاش قونیہ شہر کے ایک کنوئیں میں پھینک دی گئی۔ میں نے خاص طور پر وہ کنواں جا کر دیکھا۔ مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ اس تحقیق میں کتنی صداقت ہے۔

قونیہ سے فارغ ہونے کے بعد میں گورنر کی دعوت پر ''اسکی شہر'' پہنچا۔ ''اسکی شہر'' ترکی کے معروف شاعر یونس امرے کا شہرِ ولادت ہے مگر اس کی قبر کا کسی کو علم نہیں۔ یہاں یونس امرے کے سلسلہ میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یونس امرے کی شاعری بہت حد تک ہمارے شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ملتی جلتی ہے اور اس کا پیغام بھی محبت اور انسان دوستی کے جذبات سے لبریز ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں سمرنا کی طرح ''اسکی شہر'' پر بھی یونانیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مگر کمال پاشا نے ان دونوں شہروں سے یونانی افواج کو شکست دے کر نکال دیا۔

اس سال میں تیسری بار میں اور رناصرہ ''قراردادِ پاکستان'' کی گولڈن جوبلی کی تقریب میں شرکت کے لیے کویت گئے۔ یہاں کی پاکستانی پروفیشنلز سوسائٹی نہایت منظم اور مالدار ہے۔ جلسہ بڑے اہتمام کے ساتھ کیا گیا اور ہم دونوں نے تقریریں کیں۔ میں کویت میوزیم کی کیوریٹر شیخا لطیفہ کو جانتا تھا کیونکہ وہ میری طرح اسلامی تمدن کے تحفظ کے سلسلہ میں بین الاقوامی کمیشن کی رکن رہ چکی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یمن کی کسی قدیم مسجد کے کھنڈر یا بنیاد سے قرآن مجید کے اجزا ملے ہیں جو حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ کے ہیں اور ان اجزا کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے انہیں جرمنی بھیجا گیا ہے۔ شیخا لطیفہ کی کوشش تھی کہ یہ اجزا کسی نہ کسی قیمت پر کویت کے میوزیم کے لیے حاصل کر لیے جائیں۔ مگر یمن کی حکومت نہ مانی۔ شیخا لطیفہ انگلستان سے تعلیم یافتہ ہیں اور فر فر انگریزی بولتی ہیں۔ ان کا تعلق کویت کے شاہی خاندان سے ہے۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب اور ایک اعتبار سے افسوس ہوا کہ وہ لوگ تعطیلات منانے کی خاطر عموماً گوا (بھارت) جاتے ہیں، مگر کراچی (پاکستان) کو اس قابل نہیں سمجھتے۔ یہ تب کی بات ہے جب کویت پر عراق کا قبضہ نہ ہوا تھا اور خلیج کی جنگ شروع نہ ہوئی تھی۔

چوتھی بار ''جنوبی ایشیا کے معماتی مسائل'' کے موضوع پر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے میں

ویلانووا (امریکہ) بلوایا گیا۔ اس یونیورسٹی کے سیمینار میں زیادہ تر ایسے امریکی پروفیسر شریک تھے جو جنوبی ایشیا کے معاملات کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ بمطابق معمول پروفیسر حفیظ ملک ہمارے میزبان تھے۔ ایک ماہر نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کم از کم پچیس طریقے ہیں' مگر سوال تو یہ تھا کہ جب تک بھارت گفت وشنید کی میز پر نہیں آتا اتنی دیر ایسے تمام حل محض مفروضے ہیں اور کشمیریوں کی مدافعانہ جنگ ہماری ''سیاسی اور اخلاقی'' امداد کے ساتھ جاری رہے گی۔

پانچویں بار میں اور ناصرہ لندن پہنچے۔ اس مرتبہ دعوت فیض کلچرل اکادمی لندن کی طرف سے مجاہد ترمذی نے دی تھی اور وہی ہمارے میزبان تھے۔ تقریب کو ''جشنِ اقبال'' کا نام دیا گیا تھا اور احمد ندیم قاسمی صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ میں نے بھی مقالہ پڑھا۔

سفر کا یہی حال ۱۹۹۱ء میں رہا۔ جنوری ۹ تا ۱۳ کے پانچ دن دُبئی اور ابوظہبی میں پاکستان تھنکرز فورم کی دعوت پر ''اقبال اور جناح کے تصورِ اسلامی ریاست'' پر لیکچر دیتے گزرے۔ اس سفر میں ایس ایم ظفر بھی ساتھ تھے۔ مارچ ۹ تا ۱۱ تک کی مدت شکاگو (امریکہ) میں گزری جہاں مجھے پاکستان امریکن کانگرس کے افتتاح کے لیے بلوایا گیا تھا (اب یہ کانگرس امریکہ میں ایک مضبوط پاکستانی فورم ہے) میں نے چند پاکستان دوست امریکی سینیٹروں کے سامنے ''پاکستان ماضی' حال اور مستقبل'' کے موضوع پر ایک مقالہ بھی پڑھا۔ اس دورے پر محترمہ طاہرہ سید میرے ساتھ گئی تھیں اور شکاگو میں موجود پاکستانیوں کی مجلس ان کی گائیکی سے بے حد مسحور ہوئی۔

اسی طرح غالباً جون میں اوورسیز پاکستانیوں کی دعوت پر میں لندن پہنچا۔ اس ادارے کے کسی رکن نے لندن میں ایک عمارت خریدی تھی جہاں قائداعظم نے کچھ مدت کے لیے قیام کیا تھا۔ اسی بنا پر عمارت کا نام جناح ہاؤس رکھ دیا گیا۔ مجھے جناح ہاؤس میں قائداعظم میوزیم اور لائبریری کے افتتاح کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔

اگلے ماہ رائل اکادمی اردن کے اجلاس میں شرکت کے لیے عمان جانا ہوا۔ اس دفعہ جو موضوع زیرِ بحث تھا' وہ تھا ''زبانوں نے اسلامی تمدن کے فروغ کے لیے کیا خدمات انجام دیں۔'' اس سیمینار میں میرا مقالہ بے حد پسند کیا گیا' جب میں نے سامعین کو بتایا کہ اردو ایک ایسی اسلامی زبان ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کو قومی تشخص دیا بلکہ ایک نیا وطن یعنی پاکستان قائم کرنے میں اُن کی تمدنی طور پر مدد بھی کی۔ نیز اب اردو ہی پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ اگرچہ وہ پاکستان کے کسی صوبے کی زبان نہیں۔ میرا مؤقف تھا جو خدمت اردو زبان نے ایک نئی مسلم قوم اور ایک نیا اسلامی ملک وجود میں لانے کے لیے انجام دی ہے' وہ آج تک کسی بھی اسلامی زبان نے انجام نہیں دی۔

بعد ازاں غالباً ستمبر میں مجھے کوالالمپور (ملیشیا) جانے کا اتفاق ہوا' جہاں ملیشیا کے وزیر اعظم نے ایک جدید اسلامی مرکز کا افتتاح کیا۔ اس مرکز کے منتظم توحید وجودی کے قائل میرے دوست العطاس مقرر ہوئے اور مرکز کا مقصد اسلام کی ایسی تعبیر پیش کرنا تھا جو وقت کے جدید تقاضوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔ یہ میرا ملیشیا کا پہلا دورہ تھا اور اس مسلم ملک کی ترقی کی رفتار سے میں بے حد متاثر ہوا۔

اس سال کا آخری دورہ (نومبر ۲۱ تا ۲۴) قرطبہ (سپین) میں ایک بین الاقوامی کانگرس بعنوان ''اقبال قرطبہ میں'' میرا اور ناصرہ کا شرکت کرنا تھا۔ میرے خیال میں گزشتہ صدی میں علامہ اقبال پر اس سے بڑی کانگرس یورپ کی سرزمین میں نہیں ہوئی۔ کانگرس کا اہتمام ایک فرانسیسی قانون دان پروفیسر فرانسس لیمان نے کیا تھا اور سرمایہ حکومت کویت نے لگایا تھا۔ کانگرس کے پس منظر کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ لیمان بعض خلیجی ریاستوں کے قانونی مشیر تھے۔ انہیں کویت نے کہا کہ یورپ میں کسی ایسی مسلم شخصیت سے منسوب کانگرس کا اہتمام کرنا چاہیے جس کا فکر مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہو' چونکہ انہیں کوئی ایسی عرب مسلم شاعر یا مفکر کی شخصیت نظر نہ آئی' اس لیے طے پایا کہ کانگرس علامہ اقبال کے نام سے منسوب کی جائے جنہوں نے یورپ میں سب سے پرانی اور خوبصورت ''مسجدِ قرطبہ'' پر اپنی معروف نظم بھی لکھ رکھی ہے۔ پس یورپ میں قرطبہ کے شہر کو کانگرس کے انعقاد کے لیے منتخب کیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ کانگرس کا افتتاح مسجدِ قرطبہ ہی میں کیا جائے۔ لیمان کی خواہش تھی کہ صدر پاکستان (ان ایام میں غلام اسحاق خان صدر پاکستان تھے) اور ہسپانیہ کے شاہ کارلوس کانگرس کا افتتاح کریں' لیکن خدا جانے کیوں غلام اسحاق خان نے معذرت کر دی جس کے سبب شاہ کارلوس کو شرکت کی دعوت نہ دی جا سکی۔ چنانچہ مجھے مسجدِ قرطبہ میں علامہ اقبال کی اردو نظم ''مسجدِ قرطبہ'' پڑھ کر کانگرس کا افتتاح کرنے کی دعوت دی گئی۔ میرے بعد اس نظم کے ہسپانوی' عربی' فرانسیسی اور انگریزی ترجمے پڑھے گئے اور یوں کانگرس کا افتتاح مسجدِ قرطبہ کے اسی محراب کے سامنے علامہ اقبال کی نظم اور اس کے مختلف زبانوں میں ترجمے پڑھ کر کیا گیا جہاں انہوں نے نماز ادا کی تھی۔ کانگرس کے انتظام کے سلسلہ میں اقبال اکادمی پاکستان نے بھی تعاون کیا۔ پاکستانی وفد میرے علاوہ فارن آفس کے توحید احمد' رفیع الدین ہاشمی' پروفیسر محمد منور اور محمد سہیل عمر پر مشتمل تھا۔ کانگرس میں تقریباً دو سو سے زائد اقبال شناس مدعو کیے گئے اور ان کا تعلق دنیا کے ان ممالک سے تھا بنگلہ دیش' برما' بلجیم' کینیڈا' چین' چیکوسلواکیہ' مصر' فن لینڈ' فرانس' جرمنی' بھارت' انڈونیشیا' ایران' اٹلی' جاپان' ملیشیا' مورٹیبیا' میکسیکو' مراکو' ہالینڈ' ناروے' پاکستان' رومانیہ' سعودی عرب' سینیگال' سپین' سویڈن' سوئزرلینڈ' شام' تونسیہ' ترکی' سوویٹ روس' یوکے' یو ایس اے اور یوگوسلاویہ۔

میڈرڈ کے گرینڈ ''ربائی'' نے احتجاج کیا کہ انہیں اس کانگرس میں کیوں مدعو نہیں کیا گیا' حالانکہ

ہسپانیہ میں مسلم حکومت کے دوران مسلمانوں نے یہودیوں کو عیسائیوں کے غیظ وغضب سے بچایا اور ان کی جانوں کی حفاظت کی تھی۔ پروفیسر لیمان نے مجھ سے پوچھا کہ انہیں بلایا جائے یا نہ۔ میں نے جواب دیا کہ اگر کانگرس کا اہتمام کرنے والوں کو ان کی شرکت پر کوئی اعتراض نہیں تو مجھے کیونکر اعتراض ہو سکتا ہے' چنانچہ وہ کانگرس میں شریک ہوئے۔

قرطبہ میں تمام اقبال شناسوں نے تقریباً سات دن اکٹھے گزارے۔ لندن سے آئے ہوئے پاکستانیوں نے ڈاکٹر درّانی کی قیادت میں گل جی کی بنائی ہوئی علامہ اقبال کی ایک آئل پورٹریٹ کی نقاب کشائی مجھ سے کرائی جو بعد میں ٹرینیٹی کالج کیمبرج کے ہال میں آویزاں کر دی گئی۔ قرطبہ کے مین بازار میں چلتے ہوئے ڈاکٹر این میری شمل کا ہینڈ بیگ بھی دو موٹر سائیکل سواروں نے چھینتے ہوئے انہیں گھسیٹا جس کے سبب انہیں ضربات آئیں۔ ان کے بیگ کے ساتھ کچھ ڈالر اور ان کا پاسپورٹ بھی چلے گئے۔ پولیس کو رپورٹ لکھوانے این میری شمل کے ساتھ ڈاکٹر شیلا میکڈونا (کینیڈا) اور توحید احمد گئے' مگر ہسپانوی زبان نہ جاننے کے سبب رپورٹ نہ لکھی جا سکی۔ بہرحال توحید احمد کی کوشش سے ان کے سفری کاغذات تیار کر لیے گئے تاکہ وہ بخیر وعافیت جرمنی واپس جا سکیں۔ پروفیسر جان مارک (چیکوسلوا کیہ) پیدل ہی چلتے رہنا پسند کرتے تھے تاکہ انہیں موٹر میں بیٹھ کر ادھر ادھر جانے کی عادت نہ پڑ جائے کیونکہ پراگ میں ایسا ممکن نہ تھا۔ سپین میں میرا یہ دوسرا دورہ تھا۔ ناصرہ اور میں کچھ دن اندلس کے مختلف شہروں غرناطہ وغیرہ میں گزارنے کے بعد پیرس سے ہوتے ہوئے واپس لاہور پہنچے۔

۱۹۹۲ء میں فروری کے مہینے کے چند دن تو دُبئی میں گزرے' مگر گرمیوں میں مجھے اور ناصرہ کو لیبیا جانے کا اتفاق ہوا۔ اسلام آباد میں لیبیا کے سفارتخانے نے اطلاع دی کہ لیبیا کی حکومت مجھے تین برس کی مدت کے لیے بین الاقوامی کمیشن برائے قذافی حقوقِ بشر ایوارڈ کا رکن بنانا چاہتی ہے اور اس کے لیے مجھے اور میری بیگم کو لیبیا آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان دنوں لیبیا پر یو این کی ''پابندیاں'' عائد تھیں اس لیے کسی ہوائی جہاز کو لیبیا کے ہوائی اڈوں پر اترنے کی اجازت نہ تھی۔ طرابلس (ٹریپولی) پہنچنے کے لیے قاہرہ سے بذریعہ روڈ جا سکتے تھے مگر یہ رستہ طویل اور دشوار گزار تھا' اس لیے ہم نے اسے رد کر دیا۔ دوسرا رستہ جو ہم نے اختیار کیا وہ خاصا دلچسپ تھا۔ ہم لاہور سے کراچی اور کراچی سے روم پہنچے۔ روم سے سمندری جہاز کے ذریعے جزیرہ مالٹا گئے۔ یہاں دو روز انتظار کرنا پڑا کیونکہ بحیرۂ روم متلاطم تھا اور ہم نے مالٹا سے روسی ساخت کے لیبین جہاز کے ذریعہ شام کو سفر کا آغاز کر کے صبح سویرے طرابلس پہنچنا تھا۔ بہرحال ہم دو دن مالٹا میں لیبیا کے سفارتخانہ کے مہمانوں کی حیثیت سے ہوٹل میں مقیم رہے اور جزیرے کی خوب سیر کی۔ بحیرۂ روم کے پرسکون ہونے پر ہمارے

جہاز نے لنگر اٹھایا اور رات بھر سمندری سفر کے بعد ہم صبح طرابلس پہنچ گئے۔

طرابلس کی بندرگاہ پر ہمارا خیر مقدم کرنے کے لیے لیبیا کی وزارتِ خارجہ کے افسر موجود تھے۔ بین الاقوامی کمیشن کے اراکین (جن میں سوویٹ روس، مشرقی یورپ کے ممالک، اٹلی، فرانس، سپین، برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے شامل تھے) کے ساتھ ہمیں بھی ایک نہایت عالی شان ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ کرنل قذافی نے ہمیں خطاب کیا۔ بعد میں کمیشن کے نئے اراکین کے ساتھ مجھے بھی اس کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پیشتر تین برس کی مدت کے لیے پاکستان سے خان عبدالولی خان اس کمیشن کے رکن رہ چکے تھے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ خان عبدالولی خان کو سوویٹ روس کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر کرنل قذافی نے اس کمیشن کا رکن نامزد کیا ہوگا۔ مگر ان کے بعد میرا تقرر کس بنا پر کیا گیا؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ بہر حال کانفرنس کے دوران مقررین نے واضح کیا کہ امریکہ نے لیبیا پر کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں۔ ہمیں وہ سب مقامات دکھائے گئے جہاں امریکی ہوائی جہازوں نے بمباری سے تباہی مچا رکھی تھی۔ ان عمارتوں میں کرنل قذافی کا گھر بھی تھا جو بمباری سے تباہ کر دیا گیا اور اگرچہ کرنل قذافی محفوظ رہے، ان کی ایک غریب منہ بولی بیٹی شہید ہو گئی۔

میری رکنیت سے پیشتر قذافی ہیومن رائٹس ایوارڈ کے لیے کسی ریڈ انڈین کو منتخب کیا گیا تھا۔ مگر اس مرتبہ ایوارڈ مرض "ایڈز" کے لیے طرابلس میں ریسرچ سنٹر کھولنے والے چند فرانسیسی اور افریقی ڈاکٹروں کو دیا گیا۔ لیبیا ایک عرب سوشلسٹ سیکولر ریاست ہے۔ یہاں کا سوشلزم کرنل قذافی کی تعلیمات پر مبنی ہے اور عجیب و غریب قسم کا ہے۔ مثلاً دیگر باتوں کے علاوہ اگر آپ کا شمار امیر لوگوں میں ہوتا ہے اور آپ کے پاس اپنی موٹر کار اور شوفر ہے تو ملک کے قانون کے مطابق آپ اگلی سیٹ پر شوفر کے ساتھ بیٹھیں گے، پچھلی سیٹ پر بیٹھنے پر آپ کو جرمانہ ہو سکتا ہے۔

ملک میں خصوصی طور پر ساحلِ سمندر کے قریب رومن آبادیوں یا تھیٹروں کے کھنڈر ہیں۔ طرابلس کوئی بڑا شہر نہیں۔ مگر اس کے بازاروں اور گلیوں میں گھومتے وقت عام لوگوں کی غربت اور افلاس کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ لیبیا پر اطالوی قبضہ رہا ہے، اس لیے یہاں کے تمدن اور زبان پر اٹلی کا خاصا اثر ہے۔ لیبیا کے عربوں نے اطالوی سامراج کا ڈٹ کا مقابلہ کیا اور بالآخر اپنے ملک سے اطالویوں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ علامہ اقبال کی نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" (عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی) اسی جنگِ آزادی سے متعلق ہے

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

ایک دلچسپ بات جس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں' یہاں ہماری ملاقات پی آئی اے کے اغواشدہ طیارے کے مسافروں کے تبادلے میں پاکستانی قیدخانوں سے رہا کروائے گئے پیپلز پارٹی کے کارکنان سے ہوئی۔ان لوگوں نے ہمیں کھانے پر بلایا اور بڑی آؤ بھگت کی۔ یہ لوگ مرتضیٰ بھٹو کی قیادت میں افغانستان اور شام سے ہوتے ہوئے بالآخر لیبیا میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں کی حکومت کرنل قذافی کی ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی کی بنا پر انہیں وظائف دے رہی تھی۔ مگر وہ مطمئن نہ تھے بلکہ پاکستان واپس آنے کے لیے ترس رہے تھے۔ مرتضیٰ بھٹو' ان کے بھائی اور بیگم بھٹو سے متعلق عجیب وغریب داستانیں سناتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے کہ ہمارے پاس ان کے خلاف بہت سے ثبوت ہیں۔اگر حکومت پاکستان ہمارے خلاف دائر کیس واپس لے لے اور ہمیں پاکستان آنے کی اجازت دے دے تو یہ ثبوت ان کے حوالے کر دیں گے۔ میں نے انہیں پوچھا کہ محترمہ بینظیر بھٹو طرابلس آئی تھیں اور تب مرتضیٰ بھٹو بھی یہیں تھے۔آپ لوگوں نے ان سے یہ فرمائش کیوں نہ کی؟ ان کا جواب تھا کہ وہ وعدہ تو کر گئی تھیں مگر اس پر عملدرآمد اب تک نہیں کیا۔ان کا خیال تھا کہ میں میاں نواز شریف سے کہہ کر ان کی معافی تلافی کرا دوں مگر میں ایسی پوزیشن میں نہ تھا۔

کانفرنس سے فراغت کے بعد اب مسئلہ واپسی کا تھا۔ہم نے پاکستانی سفارت خانے کے ذریعے تیونس کا ویزا بنوایا اور طرابلس سے سمندر کے کنارے کنارے سڑک پر سرکاری موٹر کار پر سفر کرتے ایک صحت افزا مقام جربہ پہنچے۔ صحرا کا شہد نہایت ہی خوشبودار اور لذیذ تھا۔ لہٰذا ہم نے رستہ میں شہد خریدا۔ تیونس اور لیبیا کے تعلقات خوشگوار نہ تھے اس لیے بارڈر پر سزا کے طور پر جان بوجھ کر تین چار گھنٹے ہمیں انتظار کرایا گیا۔ یہی سلوک لیبیا کے چند فرانسیسی مہمانوں کے ساتھ کیا گیا۔ بہرحال خدا خدا کر کے ہم صبح کے چلے رات گیارہ بجے کے قریب جربہ پہنچے۔ چند گھنٹے ہوٹل میں آرام کیا اور پانچ بجے صبح جربہ ایئرپورٹ سے ہوائی جہاز کے ذریعہ گھنٹہ بھر کے سفر کے بعد تیونس پہنچے۔ تیونس کے صدر بورقیبہ دنیائے اسلام کی ایک معروف شخصیت تھے اور انہیں بڑی مشکل سے صدارت کے منصب سے ہٹایا گیا۔ تیونس فرانس کے قبضے

میں تھا اور اسے آزادی دلانے کی خاطر پاکستان نے یو این میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ تیونس سمندر کے کنارے ایک نہایت ہی خوبصورت شہر ہے۔ فرانسیسی اور عرب کلچر کا عجیب و غریب ملغوبہ ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور خوش اخلاق ہیں۔ ہم نے سارا دن تیونس شہر کی سیر کرتے گزارا۔ اس کی مساجد بڑی خوبصورت اور اپنی طرز میں منفرد تھیں۔ مگر ان کے اندر ٹکٹ خرید کر داخل ہونا پڑتا تھا۔ (شاید نمازوں کے اوقات میں ٹکٹ نہیں لینا پڑتا تھا) ٹیکسی ڈرائیور، جس نے سارا دن ہمیں شہر دکھاتے گزارا تھا، نے شام کو ہمیں ہوائی اڈے پر پہنچا دیا۔ تیونس سے ہوائی جہاز پکڑ کر ہم استنبول پہنچے اور بالآخر استنبول سے دبئی کے رستے لاہور واپس آ گئے۔

۱۹۹۳ء میں بھی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے مجھے پانچ مرتبہ ملک سے باہر جانا پڑا۔ دبئی کا پروفیشنلز فورم ہر سال مجھے کسی نہ کسی موضوع پر لیکچر کے لیے بلاتا رہا۔ اس مرتبہ فروری میں موضوع ''پاکستان اور اسلامی لبرل تحریک'' تھا۔ مارچ میں ولٹن پارک کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن گیا۔ کچھ وقت اپنی یونیورسٹی کیمبرج میں گزارا۔

۲۴ مارچ ۱۹۹۳ء کو آنٹی ڈورس کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ یہ جرمن خاتون جس نے ہماری ماں کی وفات کے بعد میری چھوٹی بہن اور مجھے سنبھالا تھا اور والد کی وفات کے بعد بھی اسی گھر میں ہماری نگہداشت کرتی رہیں۔ منیرہ کی شادی کے بعد برلن چلی گئی تھیں اور پھر تقریباً ہر سال سردیوں میں لاہور آ جایا کرتیں، حتیٰ کہ زیادہ عمر ہونے کے سبب یہ بھی ممکن نہ رہا۔ بالآخر ایک دن منیرہ کو فون کر کے روتے ہوئے اپنی معذوری کے بارے میں بتایا جس پر منیرہ نے اپنے چھوٹے بیٹے اقبال کو انہیں برلن سے لاہور لانے کے لیے بھیجا اور وہ واقعی انہیں اپنے بازوؤں پر اٹھا کر لاہور لایا۔ یہاں بیماری کی کیفیت میں منیرہ نے ان کی ویسے ہی خدمت کی جیسے بیٹیاں ماؤں کی کرتی ہیں۔ جب وہ فوت ہوئیں تو انہیں گلبرگ کے مسیحی قبرستان میں دفنایا گیا۔ یہ انوکھا جنازہ تھا۔ میت مسیحی کی تھی، سوگوار سب کے سب مسلمان تھے۔ انہیں قبر میں اتارتے وقت میں نے اپنی تقریر میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پادری نے آخری رسومات ادا کیں۔ جرمنی کے قونصل اور اقبال اکادمی پاکستان کے ڈائریکٹر پروفیسر مرزا محمد منور کے علاوہ منیرہ کے سسرال اور میرے خاندان کے افراد موجود تھے۔ ہم اب بھی کبھی کبھار کرسمس کے موقع پر ان کی تربت پر پھول چڑھا آتے ہیں۔

مئی میں اقبال میموریل لیکچر کے سلسلہ میں میں علامہ اقبال کی یونیورسٹی ہائیڈل برگ (جرمنی) گیا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر این میری شمل نے کی اور میرے لیکچر کا موضوع ''اقبال اور اسلامی لبرل ازم'' تھا۔ وہ گھر بھی دیکھا جہاں علامہ اقبال نے قیام کیا تھا۔ بعد ازاں میونخ جانا ہوا جس یونیورسٹی سے

علامہ اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دریائے نیکر کے کنارے وہ چھوٹی سی سڑک جہاں علامہ اقبال سیر کیا کرتے تھے' اب ان کے نام سے منسوب ہے اور دریائے نیکر پر ان کی تحریر کردہ نظم کا جرمن ترجمہ سنگ مرمر کی ایک سل پر کندہ کر کے وہاں پر نصب کیا گیا ہے۔ جرمن ترجمہ این میری شمل کا ہے۔

ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران پاکستان کے سفیر نے اطلاع دی کہ میاں نواز شریف نے مجھے پاکستان کا ''رووِنگ کلچرل ایمبیسڈر'' مقرر کیا ہے۔ میں تو سرکاری طور پر ایسا سفیر مقرر کیے بغیر ہی کئی سالوں سے اپنے طور پر یہی خدمت انجام دے رہا تھا نیز یہ تقرر بھی مجھ سے پوچھے بغیر کیا گیا' اس لیے میں نے وہیں سے لاہور ناصرہ کو فون کیا کہ اخباروں میں میری طرف سے بیان دے دیا جائے کہ مجھے یہ منصب قبول نہیں۔

جون میں میں نے ویلانووا یونیورسٹی (امریکہ) میں ''سنٹرل ایشیا میں مسلم جمہوری ریاستوں کا قیام'' کے موضوع پر ایک سیمینار میں شرکت کی۔ اس سیمینار میں زیادہ تر وسطی ایشیا کے اسکالروں نے حصہ لیا۔ بمطابق معمول ڈاکٹر حفیظ ملک میرے میزبان تھے۔ وسطی ایشیا کے اسکالروں سے میرا رابطہ پہلی بار ہوا۔ جولائی میں عمان (اردن) میں رائل اکیڈمی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس دفعہ کانفرنس کا موضوع تھا ''انسان اور تمدن کے مستقبل کا اسلامی تصور''

۱۹۹۴ء میں بھی ایک مرتبہ ملک سے باہر جانا پڑا۔ جب میں نے ویلانووا یونیورسٹی (امریکہ) میں ''نئے ورلڈ آرڈر میں چین اور روس کا مقام'' کے موضوع پر کانفرنس میں حصہ لیا۔ لیکن اس سال کے دوران دو واقعات ایسے ہوئے جو اہم تھے۔ پہلا یہ کہ مارچ میں میں نے میاں نواز شریف کے عطا کردہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب سے سینٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور ٹیکنوکریٹ کی سیٹ پر کامیاب ہوا اور دوسرا یہ کہ اگست میں محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کے دوران میری بیوی ناصرہ ہائی کورٹ کی جج مقرر ہوئیں۔

میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف سے میری براہ راست ملاقات نہ تھی۔ ان کے والد میاں محمد شریف نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں میری امداد کی تھی اور میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ بعد ازاں بھٹو حکومت کے دور میں انہیں غالباً اس امداد کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس کے علاوہ مجید نظامی کے بھی میاں محمد شریف سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ شاید مجید نظامی اور میاں محمد شریف کے کہنے پر میاں نواز شریف نے مجھے مسلم لیگ کے ٹکٹ سے نوازا۔

میں نہیں جانتا کہ میاں نواز شریف سیاست میں کس طرح آئے' انہوں نے مسلم لیگ سے کب وابستگی پیدا کی یا ان کے تعلقات جنرل ضیاء الحق سے کیونکر استوار ہوئے' البتہ وہ پاکستان کا وزیراعظم بننے سے پیشتر پنجاب کے وزیر خزانہ اور بعد میں وزیراعلیٰ رہ چکے تھے۔ انہی ایام میں شاید مجید نظامی کے ساتھ کسی یوم اقبال کی تقریب کے موقع پر وہ میرے گھر کھانے پر بھی تشریف لا چکے تھے۔ زیادہ قریبی تعلقات تب

پیدا ہوئے جب وہ وزیراعظم کے عہدے سے ہٹائے گئے اور آخرکار محترمہ بینظیر بھٹو وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ میاں نواز شریف آج تک مجھے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے کہ جب سپریم کورٹ کے حکم کے تحت نیشنل اسمبلی بحال ہوگئی اور انہیں وزیراعظم کے عہدے سے ہٹائے جانے کا حکم کالعدم قرار دے دیا گیا تو پھر انہوں نے اپنے منصب سے استعفا کیوں دیا اور اسمبلی کی تحلیل کیوں قبول کی؟

بہرحال پنجاب میں تو مسلم لیگ ہی کا پلڑا بھاری تھا اور مرکز میں بینظیر حکومت کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح پنجاب میں جوڑ توڑ کر کے میاں نواز شریف کے اثر کو ختم کیا جائے۔ بالآخر کسی حد تک انہیں کامیابی حاصل ہوئی جب پنجاب کے وزیراعلیٰ وٹو بنا دیئے گئے اور گورنر چودھری الطاف حسین (جو نئے نئے پیپلز پارٹی میں شریک ہوئے تھے)

جب میں نے سینٹ کے اجلاسوں میں شریک ہونا شروع کیا تو مسلم لیگی احباب اپوزیشن میں بیٹھے تھے۔ سینٹ میں بحث مباحثہ کا معیار اگرچہ نیشنل اسمبلی سے بہتر تھا مگر جو بات مجھے اچھی نہ لگی وہ یہ تھی کہ بحیثیت اپوزیشن ہم بیشتر وقت حکومت کی ٹانگ ہی کھینچتے رہتے تھے اور اسے کوئی قانون سازی کرنے کا موقع نہ دیتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ملک صدارتی فرمانوں (آرڈیننسز) پر ہی چل رہا تھا۔ یہ صورت اس وقت بھی قائم رہی جب کچھ مدت بعد ہماری اپنی حکومت بنی اور پیپلز پارٹی اپوزیشن میں جا بیٹھی۔ پس وہ ہمیں قانون سازی نہ کرنے دیتے تھے۔ یعنی سینٹ محض ایک ڈیبیٹنگ سوسائٹی تھی جس کا کام ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا تھا اور بس۔ حزب اختلاف خواہ مسلم لیگ کی ہو خواہ پیپلز پارٹی کی...... دونوں کی حکمت عملی یہی ہوتی تھی کہ حزبِ اقتدار کو قانون سازی نہ کرنے دی جائے۔ میں نے کئی بار ایوانِ بالا کی توجہ اس طرف دلائی کہ رواداری اور قوتِ برداشت کی عدم موجودگی میں جمہوریت کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ مثلاً میں نے واضح طور پر کہا:

> ''یہاں پر قانون سازی، جو کہ ہمارا اصل کام ہے، وہ تو ہم کرتے نہیں، یہاں پارلیمینٹ کا سیشن ختم کر کے آرڈیننسز کے ذریعہ قوانین بنائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمبلیوں کی حیثیت یا پارلیمینٹ کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ ڈیبیٹنگ سوسائٹیاں ہیں۔ ان میں ہم صرف بحث کر سکتے ہیں، لیکن قانون سازی کا کام یہاں نہیں ہوتا۔ اس بنا پر خدشہ ہے کہ پارلیمانی نظام یہاں کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔'' (دیکھئے ریکارڈ سینٹ ۱۹۹۴ء-۱۹۹۶ء)

دوسری بات جو مجھے بری لگی وہ بحیثیت مجموعی اعلیٰ عدلیہ کی طرف حزبِ اقتدار کا رویہ تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے انتظامیہ تو ایک طرف رہی، مقننہ کو بھی اعلیٰ عدلیہ کی آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ظاہر ہے

جمہوریت خواہ پارلیمانی ہو یا صدارتی' جب تک عدلیہ مضبوط اور آزاد نہ ہو' کسی قسم کے جمہوری نظام کی کامیابی مخدوش ہے۔ لیکن پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران سپریم کورٹ میں محترمہ بینظیر بھٹو نے سب سے سینئر جج یعنی جسٹس سعد سعود جان کو چیف جسٹس بنانے کی بجائے ایک جونیئر جج جسٹس سجاد علی شاہ کو چیف جسٹس مقرر کیا۔ عام یہی مشہور ہے کہ جسٹس سعد سعود جان سے کہا گیا کہ پیپلز پارٹی کے ایک وکیل کو براہِ راست سپریم کورٹ کا جج بنائے جانے کی سفارش کریں۔ مگر جسٹس سعد سعود جان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے انہیں ''بائی پاس'' کر کے ان سے کئی درجے جونیئر جج کو چیف جسٹس بنا دیا گیا۔ جسٹس سجاد علی شاہ کو پاکستان کا چیف جسٹس بنانے کے تین واضح اسباب تھے۔ ایک یہ کہ انہوں نے (جسٹس عبدالشکور سلام سمیت) محترمہ بینظیر بھٹو کے بطور وزیراعظم نکالے جانے پر اکثریتی ججوں کے فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے ان کے حق میں اپنی رائے تحریر کی تھی۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے وزیراعظم نواز شریف کی بطور وزیراعظم بحالی کے سپریم کورٹ کے فیصلہ میں بھی دیگر ججوں سے اختلاف کرتے ہوئے بحالی کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ تیسرا یہ کہ محترمہ بینظیر بھٹو کے خیال میں شاید سندھی ہونے کے ناتے سے وہ ہمیشہ ان کی حمایت کرتے رہیں گے۔

بہرحال جب تک پیپلز پارٹی کی حکومت قائم رہی اور مسلم لیگ دیگر حمایتی جماعتوں کے ساتھ اپوزیشن میں بیٹھی' میں نے سینٹ کی کارروائی میں کوئی مثبت حصہ نہ لیا۔ جس طرح باقی احباب لعن طعن کی سیاست میں مصروف تھے' اسی طرح میں بھی کبھی کبھار یہی منفی شغل اختیار کرتا۔ مگر چونکہ یہ شغل فطرتاً مجھے قبول نہ تھا' اس لیے میں نے سوچا کہ اجلاس میں بیٹھے بیٹھے کوئی مثبت کام ہو سکے تو کیا مضائقہ ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ٹی وی والوں نے افکارِ اقبال کے موضوع پر مجھ سے پندرہ سولہ لیکچر ریکارڈ کروائے تھے جو تقریباً سال بھر ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بیکار بیٹھنے کی بجائے ان لیکچروں کے نوٹس کی بنیاد پر ایک کتاب ہی کیوں نہ لکھ دوں۔ یہ کتاب بعنوان ''افکار اقبال تشریحاتِ جاوید'' سینٹ کے اجلاسوں کے دوران تحریر کی گئی جبکہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کا دنگل جاری تھا۔

اس سال دوسرا اہم واقعہ ماہ اگست میں ناصرہ کا لاہور ہائی کورٹ کا جج مقرر ہونا تھا۔ اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ وزیراعظم بینظیر بھٹو نے خواتین وکلاء کو پاکستان کے مختلف صوبوں کے ہائی کورٹوں کے جج مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اس میں پیپلز پارٹی سے وابستگی رکھنے والی دو خواتین وکلاء اس مقصد کے لیے چنی گئیں محترمہ فخر النساء اور محترمہ طلعت یعقوب۔ مگر گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین کا اصرار تھا کہ اگر میرٹ کی بنیاد پر تقرر کیا جائے تو خواتین وکلاء میں ناصرہ کو نظرانداز کرنا سیاسی طور پر غیر مناسب ہوگا اور یہ مشورہ شاید اس اعتبار سے درست بھی تھا کہ ناصرہ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل

بی اور پھر ایل ایل ایم میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے کے بعد ہارورڈ لا اسکول (امریکہ) سے ایل ایل ایم ''کم لاڈے'' (یعنی غیر معمولی قابلیت کے ساتھ) کی ڈگری لے رکھی تھی جو پاکستان میں تب کسی خاتون تو کیا کسی مرد جج کے پاس بھی نہ تھی۔ علاوہ اس کے ان کی پریکٹس بھی کافی تھی۔ البتہ ناصرہ میں یہ کمی ضرور تھی کہ ان کا تعلق نہ تو پیپلز پارٹی سے تھا اور نہ مسلم لیگ سے۔ بہر حال چودھری الطاف حسین کی رائے مان لی گئی اور بینظیر بھٹو نے اپنی پارٹی سے تعلق رکھنے والی دو خواتین محترمہ فخر النساء اور محترمہ طلعت یعقوب کے ساتھ ایک تقرر خالصتاً میرٹ پر بھی کر دیا' بلکہ بعد میں اس کا کریڈٹ بھی لیا جب لندن میں کسی موقع پر بیان دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ میری حکومت پر جانبداری کا الزام سراسر غلط ہے۔ ہم نے تو ایک ایسی خاتون وکیل کو لاہور ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا ہے جن کے شوہر اپوزیشن پارٹی کے سینیٹر ہیں۔ دوسری طرف میری اپنی پارٹی مسلم لیگ کے بعض احباب نے اس تقرر کے بارے میں میرے متعلق کوئی اچھے خیالات کا اظہار نہ کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میاں نواز شریف بینظیر بھٹو کو اور بینظیر بھٹو میاں نواز شریف کو پاکستان کے لیے ''سکیورٹی رسک'' سمجھتے تھے اور مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے کارکنان کی ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت تھی کہ ایک دوسرے کو ''رقیب'' کی بجائے ''دشمن'' اور ''غداروں'' کا ٹولہ سمجھتے تھے۔ اسی پس منظر میں جب میرے ایک مسلم لیگی رفیق کار (جو آج کل بدعنوانی کے الزام میں مجرم قرار پا کر جیل میں سزا بھگت رہے ہیں) نے مجھے ''مونڈا'' مارتے ہوئے کہا تھا: ''ڈاکٹر صاب! تسی تے بالکل ساڈے ورگے ای نکلے'' تو مجھے یہ طعنہ سن کر رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ مگر کیا کیا جائے۔ ہمارے یہاں جمہوریت دراصل نفرت' دشمنی اور جانبداری کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ اس میں رواداری' قوتِ برداشت' اجتماعی قومی مفاد' میرٹ وغیرہ کا کوئی دخل نہیں۔ شاید اسی سبب یہ تجربہ بار بار ناکام ہو جاتا ہے۔ جب جمہوریت سے ہمارا جی بھر جاتا ہے تو فوج کے آنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں اور جب فوج آ جاتی ہے تو جمہوریت کے لیے ترستے ہیں۔

بہر حال لاہور ہائی کورٹ میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے مقرر کردہ تمام ججوں کے تقرر کے خلاف رٹ دائر ہوگئی جسے لاہور ہائی کورٹ نے تو خارج کر دیا مگر سپریم کورٹ نے اپیل کی اجازت دے دی۔ اس کارروائی میں دو برس بیت گئے اور پیپلز پارٹی کی حکومت نے ان سب ججوں کو کنفرم کر دیا۔

۱۹۹۵ء میں میرا زیادہ وقت ملک سے باہر ہی گزرا۔ ماہ جنوری میں میں اور ناصرہ ساتویں عالمی فلاسفی کانگرس میں شرکت کے لیے جزیرہ ہوائی (امریکہ) گئے۔ جاتے ہوئے ہم نے چند یوم بنکاک (تھائی لینڈ) اور سیول (جنوبی کوریا) میں گزارے۔ ہوائی یونیورسٹی میں کانگرس کا اہتمام روسی ایکاڈمی آف سائنسز کی پروفیسر مارانے کیا تھا اور موضوع ''جمہوریت اور عدل'' تھا۔ میرا مقالہ ''اسلامی جمہوریت اور عدل کا تصور'' پر تھا۔ واپسی پر ہم ٹوکیو (جاپان) اور سنگاپور میں رکتے ہوئے لاہور پہنچے۔ بحر اوقیانوس کے

تقریباً وسط میں جزیرہ ہوائی اتنی خوبصورت سرزمین ہے کہ بہشت کا گمان ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹوکیو کی ''بلٹ ٹرین'' اور دیگر ٹیکنالوجی کے معجزے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ٹیکنالوجی کے سحر پر صرف مغرب کی اجارہ داری ہی نہیں بلکہ مشرقی اقوام بھی جنوبی کوریا کی طرح محنت کریں تو اسے حاصل کر سکتی ہیں۔ سنگاپور شہر کی صفائی تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اگر آپ سڑک پر سگریٹ کا ٹکڑا یا کوئی فالتو کاغذ تک بھی پھینک دیں تو سو ڈالر جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

ماہ مئی میں میں اور ناصرہ نے ماسکو (روس) میں ایک سیمینار میں شرکت کی۔ اس سفر کے دوران سینٹ پیٹرز برگ بھی گئے اور واپسی پر ازبکستان کے شہروں تاشقند، سمرقند اور بخارا سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ انہی ایام میں تاشقند کی ایک معروف سڑک علامہ اقبال کے نام سے منسوب کی گئی۔ ماہ جون میں رائل اکاڈمی کے اجلاس میں شرکت کی خاطر عمان (اردن) گیا اور جون ہی میں ناصرہ کے ساتھ مرٹل بیچ (امریکہ) میں ایک کانفرنس میں شریک ہونا پڑا۔ اس کانفرنس کا اہتمام امریکن انسٹی ٹیوٹ فار پاکستان سٹڈیز نے کیا تھا اور موضوع تھا ''پاکستان میں قانون اور سوسائٹی'' اس موضوع پر خصوصی طور پر ناصرہ کا مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ چند امریکی اسکالروں کے علاوہ جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ، الطاف گوہر اور ڈاکٹر حفیظ ملک نے بھی مقالے پڑھے۔ ماہ جولائی میں مجھے یونائیٹڈ ریلیجنز (ادیانِ متحدہ) کی کانفرنس میں شرکت کے لیے سان فرانسسکو (امریکہ) جانا پڑا۔ اس ادارے کے بانی و سربراہ بشپ آف کیلی فورنیا تھے اور مقصد مذاہب عالم کے مابین محبت و اشتراک کے رشتے استوار کرنا اور غربت مٹانا تھا۔ اس ''انٹر فیتھ'' کانفرنس کے اجلاس تقریباً ہر سال سان فرانسسکو یا امریکہ کے اور بڑے شہروں میں ہونے لگے اور مجھے بنیادی رکن کی حیثیت سے ان میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ کے لیے مجھے میاں نواز شریف نے سان فرانسسکو سے اسلام آباد طلب کیا اور میں سان فرانسسکو سے نیویارک اور نیویارک سے اسلام آباد ٹیکسیوں کی طرح ہوائی جہازوں کو پکڑتے ہوئے منزلِ مقصود تک پہنچا، لیکن اسلام آباد پہنچ کر معلوم ہوا کہ بات تو معمولی سی تھی۔

ماہ اکتوبر میں میں اور ناصرہ برمنگھم (یوکے) میں اسلامی آرٹ سے متعلق ایک کانفرنس میں شریک ہوئے اور واپسی پر لزبن (پرتگال) اور ایتھنز (یونان) سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ بعدازاں دسمبر میں ایک پاکستانی ادارے کی دعوت پر میرا، ناصرہ اور ان کی والدہ کا مسقط (اومان) جانا ہوا اور وہاں سے عمرہ کے بعد لاہور واپس آئے۔

۱۹۹۶ء میں بھی سال کا بیشتر حصہ میں نے امریکہ میں لیکچر دیتے گزارا۔ میں نے سان فرانسسکو میں ''متحدہ ادیان'' کی کانفرنس میں شرکت کی۔ ہارورڈ لاء اسکول میں ''پاکستان میں عدالتی فعالیت'' کے

موضوع پر لیکچر دیا۔ ہیوسٹن (ٹکساس) میں ''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' پر لیکچر دیا اور اسی طرح کل ایولینڈ میں پاکستانی امریکنوں کی دعوت پر ان سے خطاب کیا۔

مگر اس سال کا اہم ترین واقعہ ججز کیس سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ تھا۔ اس فیصلہ کے ذریعے عدلیہ پر انتظامیہ کے کنٹرول کو ختم کرنے اور عدلیہ کی ساکھ کو بحال کرنے کے بارے میں دستور کی روشنی میں چند نہایت اہم اصول وضع کیے گئے۔ صوبائی ہائی کورٹوں کے چیف ججوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کے مقرر کردہ نئے ججوں کو ان اصولوں کی روشنی میں پرکھیں اور اگر وہ کسی نہ کسی سبب مقرر کردہ معیار کے مطابق نااہل قرار پائیں تو انہیں سبکدوش کر دیا جائے۔ مقرر کردہ معیار کے تحت ناصرہ اس لیے ''نااہل'' قرار پائیں کہ اگرچہ رجسٹریشن کے مطابق انہیں وکالت کرتے دس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور وہ سپریم کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے وہاں پیش بھی ہوتی رہی تھیں' انہوں نے دستور کی شرط' پورے دس سال عملی طور پر عدالت میں پیش ہو کر پریکٹس نہ کی تھی۔ ناصرہ نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خلیل الرحمٰن خان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ جو مدت ان کے ریکارڈ سے نکال کر عملی پریکٹس کا عرصہ دس برس سے کم شمار کیا جا رہا ہے' وہ ہے جس کے دوران انہوں نے چیمبر پریکٹس کی کیونکہ ان کے شوہر (یعنی میں) لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے اور وہ اسی عدالت میں بذاتِ خود پیش ہو کر میرے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث نہ بننا چاہتی تھیں۔ البتہ جب میں ریٹائر ہو گیا تو انہوں نے چیمبر پریکٹس کی بجائے عملی طور پر کورٹ میں پیش ہونا شروع کر دیا۔ لیکن چیف جسٹس خلیل الرحمٰن خان نے ان کی دلیل قبول نہ کی۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے اخلاقی طور پر اپنے شوہر کی شہرت پر حرف نہ آنے کی خاطر کیا' وہی بات ان کے خلاف گئی اور وہ فارغ کر دی گئیں۔

اس فیصلے میں یہ بھی طے پایا تھا کہ اعلیٰ عدلیہ میں سب سے سینئر جج کا چیف جسٹس بنائے جانے کا حق ہے اور اس حق سے اسے انتظامیہ محروم نہیں کر سکتی۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ اس اصول کی زد میں خود بھی آتے تھے' مگر انہوں نے اس اصول کا اطلاق اپنی ذات پر کرنے سے گریز کیا' جس کے سبب ان کے اپنے رفقائے کار ان سے دور ہو گئے۔ دوسری طرف محترمہ بینظیر بھٹو ان سے بے حد مایوس ہوئیں۔ آخر یہ کیسے ہو گیا ''ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں'' کرنے لگی؟ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی پارٹی کے مقرر کردہ ججوں میں سے اکثریت کو ہٹا کر ان کی ہتک کی گئی ہے۔ مگر پیپلز پارٹی کی حکومت کے لیے عجیب سی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ انتظامیہ سپریم کورٹ کا حکم نافذ کرتی اور جن نئے ججوں کو ''لے آف'' کیا گیا تھا ان کی سبکدوشی کی نوٹیفکیشن جاری کر دیتی۔ مگر وزیراعظم بینظیر بھٹو نے اس معاملے کو اپنی ذاتی انا اور اپنی پارٹی کی حکومت کی ہتک کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہٹائے جانے والے جج

سب کے سب استعفادے دیں اور یوں نوٹیفیکیشن جاری نہ کر کے سپریم کورٹ کی سبکی کی جائے یا اسے ذلیل کیا جائے۔ غالباً پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے ججوں نے اپنی لیڈر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے استعفے بھی دیئے۔ ناصرہ کو یہی پیغام پہنچانے کی غرض سے وفاقی لا سیکرٹری جسٹس چودھری محمد عارف تشریف لائے' مگر ناصرہ نے انہیں جواب دیا: ''چودھری صاحب! آپ کی لا منسٹری نے مجھے بطور ہائی کورٹ جج کنفرم کر رکھا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں آپ کے کہنے پر استعفادے دوں تو ظاہر ہے پھر میں لاہور ہائی کورٹ میں پریکٹس نہ کرسکوں گی۔ نیز آئندہ کسی مرحلہ پر میری پریکٹس کی مدت کی کمی پوری ہو جانے پر اگر مجھے دوبارہ جج بنائے جانے پر غور کیا جائے تو تب میرا استعفا رستہ میں حائل ہوگا۔ لہٰذا میں تو استعفا نہ دوں گی۔ آپ سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل میں بذریعہ نوٹیفیکیشن مجھے سبکدوش کریں۔'' چنانچہ ناصرہ نے استعفا دینے سے انکار کر دیا اور انتظامیہ کو سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

محترمہ بینظیر بھٹو کا چیف جسٹس سپریم کورٹ سجاد علی شاہ کے ساتھ تنازع صرف ججز کیس کے فیصلہ پر عملدرآمد نہ کرنے تک محدود نہ تھا۔ لاہور ہائی کورٹ کو سپریم کورٹ نے ہدایت دی تھی کہ وزیر اعلیٰ وٹو کے کیس کا فیصلہ تعطیلات سے پہلے کر دیا جائے۔ مگر وزیر اعظم بینظیر بھٹو کے کہنے پر لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خلیل الرحمٰن خان نے سپریم کورٹ کی ہدایت پر عمل نہ کیا' بلکہ اس کیس کی تاریخ چھٹیوں کے بعد یعنی ۱۵ ستمبر تک بڑھا دی۔ بعد ازاں چیف جسٹس خلیل الرحمٰن خان کو شاباش دینے کی غرض سے وزیر اعظم بینظیر بھٹو نے انہیں کھانا کھلوایا۔

ججز کیس میں سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل نہ کرنا اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خلیل الرحمٰن خان کو سپریم کورٹ کا حکم نہ ماننے کی تلقین کرنے پر میں نے سینٹ میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی سخت نکتہ چینی کی۔ میں نے کہا:

> ''عدلیہ کے آئینی اختیارات اور مقام کا تحفظ کیسے ہو؟ کیا حکومت نے ججز کیس میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر عملدرآمد کیا ہے؟ اس پر عملدرآمد نہیں کیا جارہا۔ اسی بنا پر فیصلہ کے اس حصے سے متعلق جس میں نااہل ججوں کو فارغ کر دیا گیا ہے' حکومت نے ابھی تک کوئی نوٹیفیکیشن جاری نہیں کی ...... جن جج صاحبان کو ''لے آف'' کیا گیا ہے (یعنی جنہیں کام کرنے سے روک دیا گیا ہے) وہ کوئی کام نہیں کر رہے لیکن تنخواہ لے رہے ہیں...... جن ججوں کو نااہل قرار دیا گیا ہے وہ استعفا نہیں دے سکتے' کیونکہ ایسا کرنے میں قانونی مشکلات ہیں۔ لہٰذا وہ کام کر رہے ہیں نہ واپس وکالت کے شعبہ میں جاسکتے ہیں کیونکہ حکومت کی طرف سے نوٹیفیکیشن جاری

نہیں ہو رہی...... یہ نہایت غلط بات ہے...... دوسری بات یہ ہے کہ اپوزیشن پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ ججوں کو لالچ دیتے ہیں...... انہیں آپس میں تقسیم کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، مگر وٹو صاحب کے کیس میں سپریم کورٹ نے لاہور ہائی کورٹ کو ہدایت کی تھی کہ کیس تعطیلات سے پہلے ختم کیا جائے۔ اس کے باوجود سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل نہیں کی گئی...... ہائی کورٹ کے بینچ نے اس کی تاریخ ۱۵ ستمبر ڈال دی۔ جس دن یہ حکم جاری ہوا، اس سے اگلے ہی روز پرائم منسٹر لاہور میں چیف جسٹس کو کھانے پر بلا لیتی ہیں...... ڈیڑھ گھنٹہ چیف جسٹس گورنر ہاؤس میں ان کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ آتی ہیں تو کھانا کھایا جاتا ہے۔ اخبار میں جب یہ خبر چھپتی ہے تو اس کی تردید ہوتی ہے کہ ایسی کوئی ملاقات لاہور کے چیف جسٹس کی پرائم منسٹر کے ساتھ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد تردید واپس لے لی جاتی ہے۔ جب پریس پرائم منسٹر سے سوال کرتی ہے تو وہ کہتی ہیں کہ یہ تو روٹین ملاقات تھی۔ چیف جسٹس سے تو ایسی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں...... لیکن اس کا تاثر یہی ہوا کہ چیف جسٹس لاہور نے سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل نہیں کی اور انہیں شاباش دینے کی غرض سے انہیں کھانا کھلوایا گیا...... اصولاً پرائم منسٹر کا کوئی تعلق چیف جسٹس کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے...... پرائم منسٹر کو انہیں کھانے پر بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اس کے باوجود اپوزیشن پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم عدلیہ کو تقسیم کر رہے ہیں...... عدلیہ کے تحفظ کے لیے ضروری ہے حکومت اس بات کا احساس کرے۔ اگر عدلیہ کے احکام کی تعمیل نہیں ہوگی تو اس سے یہی مراد لے جائے گی کہ اس ملک میں عدلیہ کو مفلوج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" (سینٹ کا ریکارڈ ۱۹۹۴ تا ۱۹۹۶)

درحقیقت مسئلہ یہ تھا کہ باوجود اس کے کہ محترمہ بینظیر بھٹو کے پاس بحیثیت پرائم منسٹر اتنی وونگ قوت نہ تھی، وہ پاکستان میں اصل "طاقت کی تکون" (یعنی عدلیہ، فوج اور پریذیڈنسی) پر حاوی ہونا چاہتی تھیں تاکہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جمہوری آمریت (ڈیموکریٹک ڈکٹیٹرشپ) قائم کر سکیں۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف تو کھلم کھلا اعلانِ جنگ ہو چکا تھا۔ فوج کے "ٹاپ براس" کے ساتھ بھی تعلقات اچھے نہ تھے۔ رہ گئی پریذیڈنسی تو اگرچہ جناب فاروق لغاری اُن کی اپنی پارٹی کے فرد تھے، ان پر کامل اعتماد کرنا اس لیے مشکل تھا کہ ان کے ہاتھ میں دستور کی دفعہ (۵۸) (۲) (ب) کی تلوار تھی اور وہ جب چاہیں فوج کو اعتماد میں لے کر اس کا وار کر سکتے تھے اور بالآخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ فاروق

لغاری ہی کے ہاتھوں محترمہ بینظیر بھٹو کا پتا کٹ گیا۔ سپریم کورٹ میں نکالے جانے کے خلاف درخواست چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اڑا دی اور فوج یہ سارا تماشا دور کھڑی خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہی۔

۱۹۹۷ء کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے' کیونکہ اسی سال الیکشن میں میاں نواز شریف کی مسلم لیگ نے پاکستان بھر میں بھاری مینڈیٹ کے ساتھ کامیابی حاصل کی اور پیپلز پارٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس غیر متوقع کامیابی سے میاں نواز شریف پھولے نہ سماتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے' اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کی عزت کرنا اور چھوٹوں سے شفقت کے ساتھ پیش آنا ان کا خاندانی شعار تھا' آپ اس کامیابی کے ذریعہ اقتدار پر ''بلاشرکت غیرے'' قبضہ کا خواب دیکھنے لگے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر دو باتیں بڑی ضروری تھیں۔ ایک تو یہ کہ اہم امور کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت اپنے ارادے کو خفیہ رکھا جائے اور دوسری یہ کہ دوسروں کے ساتھ مشورہ کرنے سے گریز کیا جائے۔ مگر یہ خصوصیتیں اپنانا تبھی کارگر ثابت ہوسکتا تھا جب پاکستان میں ''طاقت کی تکون'' پر حاوی ہوا جا سکے۔

عجیب اتفاق ہے کہ بھاری مینڈیٹ حاصل کرنے کے چند ہفتوں بعد میاں نواز شریف نے بطور وزیراعظم لاہور میں یومِ اقبال کے ایک جلسے کی صدارت کی۔ اس جلسے میں مقرر کی حیثیت سے اپنی تقریر میں میں نے میاں صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا پارلیمانی جمہوریتوں کے دساتیر میں ''چیک اینڈ بیلنس'' کی دفعات اس لیے رکھی جاتی ہیں کہ اقتدار کے نشے میں چور ہو کر کوئی لیڈر آف دی ہاؤس آمریت کا رستہ اختیار نہ کرلے۔ اس لیے اقتدار کے خزانے پر سانپ کی طرح اکیلے نہ بیٹھنا چاہیے بلکہ دوسروں کے ساتھ مشورہ کے ذریعے اسے بانٹ لینا چاہیے۔ میں نے اپنی تقریر علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کی ؎

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر
ہست شیطاں از جماعت دور تر

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھو کہ شیطان تنہا شخص کو آسانی سے مغلوب کر لیتا ہے مگر جماعت سے ہمیشہ دور بھاگتا ہے۔ یعنی آمر پر تو شیطان غالب آ جاتا ہے لیکن جو قدم شوریٰ کے ساتھ اٹھایا جائے اس کے سامنے اس کا زور نہیں چلتا۔)

خدا جانے میاں نواز شریف کو میری بات سمجھ میں آئی یا نہیں۔ انہوں نے مجھے کبھی اس قابل نہیں سمجھا کہ مشورہ لیا جائے۔ جب کبھی بھی میں نے محسوس کیا کہ انہیں مشورہ دینا چاہیے تو تب بھی مجید نظامی کے ذریعے ان سے وقت لینا پڑا اور پھر بھی (جیسے آگے جا کر بیان کیا جائے گا) میرے مشورے کو بیکار سمجھ کر قبولیت کا شرف نہ بخشا گیا۔

وزیراعظم نواز شریف نے پاکستان میں ''طاقت کی تکون'' کو قابو کرنے کی خاطر سب سے پہلا

قدم دستور میں اس ترمیم کے ذریعے اٹھایا جس کے تحت آرٹیکل ۵۸ (۲) (ب) کو ختم کر دیا گیا۔ اس ترمیم کو پارلیمینٹ نے اتفاق رائے سے منظور کیا۔ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف جائز طور پر خوش تھے کہ "خالص" جمہوریت بحال ہوگئی ہے۔ مگر اس اندیشے پر کسی نے غور نہ کیا کہ یوں ایک بار پھر فوج کے داخل ہونے کے لیے دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ ایک سوال جو ہم میں سے بہتوں کو تنگ کرتا ہے، یہی ہے کہ بھارت میں پاکستان سے کہیں زیادہ لچے لفنگے اور بدعنوان عوام کے نمائندے ہیں جو ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں۔ مگر وہاں جمہوریت کیوں چلتی رہتی ہے اور فوج کیوں مداخلت نہیں کرتی۔ اس کا جواب یہی ہے کہ بھارت پاکستان سے بہت بڑا ملک ہے اور وہاں فوج شمالی کمانڈ، جنوبی کمانڈ، مشرقی کمانڈ یا مغربی کمانڈ میں بٹی ہوئی ہے اس لیے وہاں فوج کو ایسی مرکزی پوزیشن حاصل نہیں جیسی پاکستان میں ہے۔ پاکستانی فوج کی تو ایک ہی مرکزی کمانڈ ہے جو جب مناسب سمجھتی ہے "ٹیک اوور" کر لیتی ہے اور عوام بھی اس کے ایسے اقدام سے مانوس ہو چکے ہیں۔ لہٰذا غصبِ اقتدار سے یہاں کوئی قیامت نہیں آ جاتی۔

جناب فاروق لغاری ابھی تک تو صدر پاکستان کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھے، مگر اس ترمیم کے ذریعے وہ تلوار ان کے ہاتھ سے چھن گئی جس کا وار وزیراعظم نواز شریف اور اسمبلیوں پر ہو سکتا تھا۔ دستور کی دوسری ترمیم کے ذریعے وزیراعظم نواز شریف نے "فلور کراسنگ" کا خاتمہ کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ ہر سیاسی پارٹی پر اس کی قیادت کی گرفت اتنی مضبوط ہوگئی کہ پارٹی کا کوئی بھی رکن پارٹی سے نکالے جانے یا سیٹ کھو دینے کے خوف سے قیادت کی پالیسی سے کسی قسم کا جائز اختلاف بھی کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ یہ ترمیم بھی اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

"پریذیڈنسی" پر قابو پا لینے کے بعد وزیراعظم نواز شریف نے "تکون" کے دوسرے زاویے یعنی "فوج" کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس مرحلہ پر نیوی وغیرہ کے معاملے میں چند ابتدائی کامیابیوں کے بعد کمانڈر ان چیف جنرل جہانگیر کرامت نے فوج کے نقطہ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہیں کوئی مقالہ پڑھ ڈالا جس کا ماحصل یہ تھا کہ "ہائی لیول" پر قومی مفاد سے متعلق اہم فیصلے سمجھ بوجھ کر کرنے کے لیے ملک میں نیشنل سکیورٹی کونسل کا قیام ضروری ہے۔ وزیراعظم نواز شریف کو ان کا اندازِ فکر پسند نہ آیا۔ انہیں اپنے آفس میں طلب کیا۔ ان کی آپس میں کیا بات ہوئی، اس کا تو مجھے علم نہیں، مگر جنرل جہانگیر کرامت نے، جو بنیادی طور پر ایک "دانشور" قسم کے جرنیل تھے، استعفا دے دیا۔ کیا ان کے استعفا کا مطلب یہ تھا کہ وزیراعظم نواز شریف نے "تکون" کے اس زاویہ پر بھی قابو پا لیا ہے؟ رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں۔ اس کے بعد میں تو یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے اپنے طور پر یا کس کے مشورے پر جنرل پرویز مشرف کو فوج کا کمانڈر ان چیف بنایا۔

جہاں تک ''تکون'' کے تیسرے زاویے ''عدلیہ'' کا تعلق ہے' ابتدا میں تو وزیراعظم نواز شریف کے تعلقات چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے ساتھ معمول کے مطابق تھے بلکہ محترمہ بینظیر بھٹو نے جو میاں نواز شریف کے مقرر کردہ جج کنفرم نہ کر کے ہٹائے تھے' ان میں سے بعض کا تقرر دوبارہ کر دیا گیا' نیز بدعنوانی یا سنگین جرائم کی عدالتوں کے قیام' ٹرائل یا ان کے فوری فیصلے سنانے سے متعلق ضابطہ پر بھی غور و فکر کرنے کے دوران ان سے مشورہ لیا گیا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا اصرار تھا کہ ان عدالتوں کے جج صاحبان سپریم کورٹ کی زیرنگرانی کورٹوں سے لیے جائیں اور وہ میاں نواز شریف کی تسلی کے مطابق اپیل کا مرحلہ بھی جلد طے کرا دیا کریں گے۔ سننے میں تو یہی آیا تھا کہ وزیراعظم نواز شریف نے ان کے ساتھ اتفاق کیا' مگر بعد ازاں ان کی بات ماننے کی بجائے ان عدالتوں کو چلانے کے لیے اپنا وضع کردہ طریق کار اختیار کر لیا اور اپنی پسند کے جوڈیشل آفیسر مقرر کیے۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اسے عدلیہ کی آزادی میں مداخلت قرار دیتے ہوئے ناپسند کیا۔ پس یوں وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان چپقلش کی ابتدا ہوئی۔

ججز کیس میں ناصرہ کو ٹیکنیکل گراؤنڈ پر ججی سے ہٹائے جانے کے بعد سپریم کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ کے اکثر سینئر ججوں کو قلق تھا۔ ناصرہ کا کوئی فیصلہ سپریم کورٹ نے اپیل میں کالعدم قرار نہ دیا تھا بلکہ ان کی محنت اور کاوش کا سبھی اعتراف کرتے تھے۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے انہیں دوبارہ لاہور ہائی کورٹ میں جج بنائے جانے کے لیے کوشش کی۔ دوسری طرف لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اعجاز نثار نے ان کے لیے وفاقی حکومت سے سفارش کی مگر اب میاں نواز شریف کی مسلم لیگی حکومت تھی' اس لیے اٹارنی جنرل چودھری محمد فاروق نے اعتراض کیا کہ ہم انہیں جج کیوں بنائیں' وہ تو پیپلز پارٹی کی مقرر کردہ جج تھیں جب ہٹائی گئیں۔ پس مسلم لیگی حکومت کے دوران ناصرہ کا جج بنایا جانا ممکن نہ تھا۔ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت ہوتی تب بھی یہی صورت ہوتی کیونکہ ان کا پیپلز پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ پولیٹیکل پارٹیوں کی آپس میں منافرت کے سبب میرٹ کا قتل تھا۔ مگر پاکستانی جمہوریت ہے ہی ایسی۔ کبھی کبھار آتی ہے' مگر جب بھی آئی ایسا ہی ہوا۔ جب بھی آئے گی ایسا ہی ہوگا۔

بہرحال اب سینٹ میں ہم حکومتی نشستوں پر بیٹھنے لگے تھے کیونکہ حکومت مسلم لیگ اور اس کے اتحادیوں کی تھی اور پیپلز پارٹی اپوزیشن میں چلی گئی۔ یوں میرے حصے میں سینٹ کی کلچرل کمیٹی کی چیئرمینی آئی۔ باقی سینٹ میں حسب معمول بحث مباحثہ جاری رہا۔ میرا زیادہ وقت تقریریں سنتے ہی گزرتا تھا۔

۱۹۹۷ء میں بھی مجھے کئی بار ملک سے باہر جانا پڑا۔ مارچ میں سید جمال الدین افغانی (یا اسد آبادی) پر ایک کانفرنس کے سلسلہ میں تہران (ایران) گیا۔ اس سفر میں میرے فرزند منیب اقبال بھی

میرے ہمراہ تھے۔ میں نے ''سید جمال الدین اور تحریک احیائے اسلام'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا اور ایران میں ان کے بارے میں جو کام ہو رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہم نے ابھی تک پاکستان میں اس عظیم مسلم شخصیت پر، جسے علامہ اقبال نے اپنے عہد کا مجدد قرار دے رکھا ہے، کام شروع ہی نہیں کیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سید جمال الدین ''افغانی'' نہ تھے بلکہ اسد آباد کے تھے، ہمیں ہمدان میں ان کے آبائی وطن اسد آباد لے جایا گیا اور ان کے رشتہ داروں سے ملوایا گیا۔ نیز ہم قم بھی گئے جہاں امام خمینی کے مزار کی زیارت کی۔ جدید انقلاب ایران کے قائد امام خمینی دینی مدرسوں کے شہر قم ہی میں دفن ہیں۔ ان کے پوتے نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی۔

اسی طرح ''اقبال اور احیائے ایشیا'' کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کرنے کی خاطر میں عزیز سہیل عمر ڈائریکٹر اقبال اکادمی کے ساتھ کوالالمپور (ملیشیا) گیا اور ہفتہ بھر وہیں گزارا۔ پھر ''ادیانِ متحدہ'' کے سیشن میں شرکت کے لیے کیلی فورنیا (امریکہ) جانا ہوا۔ اس مرتبہ ہمارا اجتماع سٹینفورڈ یونیورسٹی میں ہوا جہاں ہم نے ''ادیانِ متحدہ'' کے لیے چارٹر تیار کیا۔

اس سال قیام پاکستان کے پچاس برس ہونے پر ملک کے اندر اور باہر بہت سی تقاریب ہوئیں۔ اس موضوع پر ایک کانفرنس پروفیسر حفیظ ملک نے بھی ویلانووا یونیورسٹی (امریکہ) میں منعقد کی جس میں پاکستان سے میں، ایس ایم ظفر، شیخ منیر احمد خان، جنرل کے ایم عارف اور عبدالستار شریک ہوئے۔ میں نے اس کانفرنس میں ''عدلیہ کے کردار'' پر مقالہ پڑھا۔ (اس کانفرنس پر پڑھے گئے سب مقالات اب ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو گئے ہیں) ابھی مجھے اور ایس ایم ظفر کو اسی طرح کی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے کلی ایولینڈ جانا تھا کہ اچانک لاہور سے محترم میاں شہباز شریف کا فون آیا کہ فوراً واپس اسلام آباد پہنچوں اور مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں شریک ہوں۔ میں باقی سب کام چھوڑ کر نیویارک سے ہوتے ہوئے اسلام آباد پہنچا اور مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں شریک ہوا۔

وزیراعظم نواز شریف کی ذات اور ان کی حکومت کے لیے واقعی بہت بڑا ''کرائسس'' آیا ہوا تھا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے کسی معاملے میں میاں نواز شریف کے ذاتی طور پر سپریم کورٹ میں پیش نہ ہو سکنے پر ان کے خلاف توہین عدالت کا کیس بنا کر کارروائی شروع کر رکھی تھی اور انہیں جیل کی سزا دینے پر تلے ہوئے تھے تاکہ اس بنا پر انہیں منصب سے ہٹا دیا جائے۔ میاں نواز شریف کی گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ جیل جانے کی صورت میں پارٹی لیڈر کے انتخاب کے لیے صلاح مشورے کرنے لگے تھے۔ دوسری طرف چیف جسٹس سجاد علی شاہ یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ آپ ہی آپ دستور کی وہ ترمیم کالعدم قرار دے دیں جس کے تحت آرٹیکل ۵۸ (۲) (ب) خارج کر دیا گیا تھا اور جونہی وہ شق اپنی اصلی شکل میں بحال

ہو جائے' صدر فاروق لغاری اسی وقت اس کے تحت کارروائی کر کے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کا خاتمہ اور اسمبلیاں تحلیل کر دیں۔ دوسرے لفظوں میں "طاقت کی تکون" کے دو زاویے یعنی "عدلیہ" اور "پریذیڈنسی" آپس میں میاں نواز شریف اور ان کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کی سازش کر رہے تھے۔ نیز اس ضمن میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جنہوں نے دستور کے تحفظ کی قسم کھا رکھی تھی' خود ہی اس کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔

اس بحران سے نبٹنے کے لیے مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ میں میں نے برملا رائے دی کہ اگر صدر فاروق لغاری اس سازش میں ملوث ہیں تو اس مسئلہ کا آسان حل یہی ہے کہ دستور کے تحت ان کی "امپیچمنٹ" کی جائے۔ میں نے کہا نیشنل اسمبلی اور سینٹ میں مسلم لیگی اراکین کی اتنی قوت ہے کہ صدر پاکستان کی "امپیچمنٹ" ہو سکتی ہے۔ علاوہ اس کے اپوزیشن بالخصوص پیپلز پارٹی کے اراکین بھی ممکن ہے اس کارروائی میں حکومتی پارٹی کا ساتھ دیں کیونکہ صدر فاروق لغاری نے ان کی قائد محترمہ بینظیر بھٹو کو یہی پاور ۵۸ (۲) (ب) استعمال کرتے ہوئے فارغ کیا تھا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ اس رائے کے حق میں آناً فاناً دستخط لینے کی مہم شروع ہو گئی اور چند ہی منٹوں میں سینکڑوں دستخط حاصل کر لیے گئے۔ اتنی ہی جلدی صدر فاروق لغاری کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ گئی کہ حکومتی پارٹی ان کے خلاف کیا کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پس انہوں نے فوراً استعفا دے دیا اور وزیراعظم نواز شریف کے سر سے کم از کم یہ آفت تو ٹل گئی۔

باقی رہ گئے چیف جسٹس سجاد علی شاہ' وہ تو پہلے ہی ایک منقسم سپریم کورٹ کے سربراہ تھے جو وزیراعظم نواز شریف کے خلاف اس جنگ میں اکیلے ہی تیغ آزمائی کر رہے تھے' کیونکہ ان کا کوئی بھی رفیق کار ان کے ساتھ نہ تھا۔ اتنے میں مسلم لیگ کے بپھرے ہوئے کارکنان نے سپریم کورٹ پر دھاوا بول دیا۔ چیف جسٹس نے کمانڈر ان چیف کو مدد کے لیے پکارا لیکن فوج ان کی مدد کو نہ آئی۔ کہتے ہیں کہ سپریم کورٹ پر حملہ میاں نواز شریف نے کروایا تھا۔ خدا جانے اس بات میں کتنی صداقت ہے۔ مجھے یاد ہے جب مسلم لیگ اپوزیشن میں تھی اور محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت تھی تو مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے اجلاس میں بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ہم گندے ٹماٹر اور انڈے اپنی جیبوں میں بھر کر لے جاتے ہیں تاکہ جب صدر فاروق لغاری اسمبلی میں اپنی سالانہ افتتاحی تقریر کرنے کے لیے آئیں تو ان پر ٹماٹر اور انڈوں کی بارش کر دی جائے۔ مگر میاں نواز شریف نے انہیں ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ سپریم کورٹ پر حملہ میاں نواز شریف کی ایما سے نہ ہوا ہو بلکہ یہ کارستانی مسلم لیگ کے "جیالوں" کی ہو جن کے ساتھ بعض پڑھے لکھے حضرات بھی جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ بہر حال مسلم لیگی کارکنان کی طرف سے یہ کارروائی نہایت افسوس ناک تھی۔

وزیراعظم نواز شریف کی قسمت کے ستارے ان کے حق میں گردش کر رہے تھے۔ صدر پاکستان خود ہی استعفادے کر چلے گئے اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ان کے رفقائے کار نے بالآخر سپریم کورٹ سے نکال باہر کیا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ جنگ میں عدالت عظمیٰ کو بہت سے زخم آئے اور وہ اب تک اپنے انہی زخموں کو چاٹ رہی ہے، مگر کیا کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات اعلیٰ سے اعلیٰ انسانی عدالت بھی اپنی تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو جاتی ہے۔ بہرحال پاکستان سپریم کورٹ کی تاریخ میں یہ واقعہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

وزیراعظم نواز شریف اب بعض اہم فیصلے کسی سے مشورہ کیے بغیر تنہا کرنے لگے تھے۔ شاید یہ ان کے منصب کا تقاضا تھا یا انہیں کسی پر بھی اعتماد نہ رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ اونچے عہدے پر فائز شخص عموماً تنہا ہو جاتا ہے اور تنہائی میں فیصلے کرتے وقت غلطی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن بعض لوگ اصرار کرتے ہیں کہ ان کے اصل مشیران کے والد میاں محمد شریف یعنی ''اباجی'' تھے اور جو رائے وہ دیتے اسی پر عمل ہوتا تھا۔ واللہ اعلم۔ مثلاً بہتر ہوتا کہ فاروق لغاری کی جگہ پنجاب کی بجائے کسی اور صوبہ سے صدر پاکستان منتخب کرتے بلکہ میاں شہباز شریف نے تو بیان بھی دے دیا تھا کہ صدر کسی چھوٹے صوبے سے لیا جائے گا، مگر وزیراعظم نواز شریف نے جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ کو صدر پاکستان مقرر کر کے ہر ایک کو ''سرپرائز'' دی۔ یہ فیصلہ غالباً درست نہ تھا کیونکہ دستور میں ترمیم کے بعد اب تو صدر محض ایک ایسی بھڑ ہو کے رہ گیا تھا جس کی ڈنگ نکال لی گئی ہو، مگر ہو سکتا ہے وزیراعظم نواز شریف کو خدشہ لاحق ہو کہ ''پریذیڈنسی'' اس حالت میں بھی ''عدلیہ'' نہیں تو ''فوج'' کے ساتھ ساز باز کر کے ان کا بوریا بستر گول کرا سکتی ہے۔ اس لیے وہ ایسا فرمانبردار اور بے ضرر صدر چننا چاہتے تھے جو فضل الٰہی چودھری مرحوم سے بھی کمزور ہو اور اُنہیں کسی صورت میں بھی کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ پس انہیں محمد رفیق تارڑ میں وہ ''اچھا بچہ'' دکھائی دیا جس کی انہیں تلاش تھی۔

اسی طرح ایٹمی دھماکہ کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں بھی وزیراعظم نواز شریف پر مختلف اطراف سے شدید ''پریشر'' تھا۔ وزیراعظم واجپائی نے بھارت میں دھماکہ کر کے پاکستان کو شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ امریکی صدر کلنٹن (اور مغربی یورپ) یہی چاہتے تھے کہ پاکستان دھماکہ نہ کرے۔ پاکستان کے اندر بھی ایک لابی موجود تھی جس کا مؤقف تھا کہ بھارت کی نقل میں دھماکہ نہ کیا جائے بلکہ اُسے کرنے کے لیے اپنا ''زمان و مکان'' منتخب کیا جائے۔ لیکن فی الحال دھماکہ نہ کرنے کے عوض امریکہ اور اس کے حواری جو مراعات دینے کو تیار ہوں، وہ چپ کر کے لے لی جائیں۔ مگر یہاں ''شکروں'' کی تعداد بھی خاصی تھی۔ شاید انہی کے زیر اثر وزیراعظم نواز شریف نے صدر کلنٹن کو صاف کہہ دیا کہ ہم لوگ الیکشن جیت کر آئے ہیں اور عوام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس لیے وہی کریں گے جو عوام چاہیں گے۔ پس دھماکہ کر کے

وہی کر دیا گیا جو عوام چاہتے تھے۔ یہ کہہ سکنا تو مشکل ہے کہ میاں نواز شریف نے یہ فیصلہ دوسروں سے مشورہ کر کے کیا یا تن تنہا' مگر فیصلہ درست تھا کیونکہ ''جوابی'' دھماکہ کرنا ہمارے لیے ایک طرح کی مجبوری تھی۔

جب بم چلا تو میں اور ناصرہ چیئرمین سینٹ وسیم سجاد کی سربراہی میں ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ آسٹریلیا میں تھے۔ ہماری میزبان آسٹریلین سینٹ کی چیئر پرسن تھیں۔ سڈنی اور کینبرا میں کچھ دن گزارنے کے بعد ہم لوگ اپنے سفر کے آخری مرحلہ یعنی ملبورن میں تھے۔ تمام رات بین الاقوامی سطح پر ٹی وی کی خبروں پر پاکستانی بم اور وزیر اعظم نواز شریف کو بڑی ''کوریج'' ملی۔ ہمیں احساس تھا کہ اس ملک میں ٹھہرنا اب مناسب نہیں۔ اگلی صبح آسٹریلین حکومت نے پروٹوکول کی پروا کیے بغیر کہ ہم ایک سرکاری پارلیمانی ڈیلی گیشن ہیں اور ان کے مہمان ہیں' ہمیں نہایت ذلت کے ساتھ آسٹریلیا سے نکل جانے کو کہا۔ رخصت ہوتے وقت ایئرپورٹ پر ہماری تصاویر ٹیلی کاسٹ کی گئیں جیسے ہم نے کسی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ہم ملبورن سے نکل کر کوالالمپور (ملیشیا) پہنچے اور وہاں سے اسلام آباد چلے آئے۔ بعدازاں لاہور میں ایک دعوت پر میرا تعارف آسٹریلین ہائی کمشنر سے کرایا گیا۔ مگر میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ لوگوں نے اپنی بدتمیزی کے سبب آسٹریلیا کا ایک اچھا دوست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔

آسٹریلیا کے سفر کے علاوہ ۱۹۹۸ء میں دو بار میں ملک سے باہر گیا۔ جولائی میں ''ادیانِ متحدہ'' نے اپنی سالانہ کانفرنس پٹسبرگ (امریکہ) میں منعقد کر رکھی تھی۔ میں لاہور' کویت' لندن سے نیویارک پہنچا تو بے حد تھکاوٹ اور کمزوری محسوس کی۔ مجھے کینیڈی ایئرپورٹ پر عموماً آغا افضل خان صدر شمالی امریکہ مسلم لیگ لینے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ انہوں نے میری حالت دیکھی تو پریشان ہو گئے۔ کہا کہ میں تو کل ہی آپ کا جسمانی چیک اپ کرانا چاہتا ہوں۔ اگلے روز صبح وہ مجھے ہوٹل سے نیویارک ہسپتال لے گئے اور اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر مجھے وہاں داخل کرا دیا۔ کئی ٹیسٹ ہوئے۔ بالآخر ڈاکٹروں نے انجیو پلاسٹی کر کے میری آرٹری میں ''سٹینٹ'' ڈال دیا۔ سرجن کی تشخیص کے مطابق میری ایک آرٹری اسی فیصد بلاک تھی اور اگر سٹینٹ نہ ڈالا جاتا تو سال ڈیڑھ سال کے اندر مجھے ''سٹروک'' ہونے کا احتمال تھا۔ پس یہ پیش بندی فائدہ مند ثابت ہوئی۔ میرے چھوٹے فرزند ولید بھی ان دنوں نیویارک ہی میں تھے۔ ان کی اطلاع پر ناصرہ نیویارک پہنچ گئیں' بلکہ ویلانووا سے حفیظ ملک بھی آ گئے۔ میں نے دو تین روز ہسپتال میں قیام کیا۔ اگرچہ چھ ہفتوں کے لیے مجھے ہوائی سفر کی اجازت نہ تھی' میں نیویارک سے بذریعہ طیارہ پٹسبرگ چلا گیا اور تین روز کانفرنس میں شرکت کے بعد ناصرہ کے ساتھ ویلانووا میں حفیظ ملک کے عالیشان گھر میں آرام کیا جہاں ان کی بیگم لنڈا خانم نے ہمیں طرح طرح کے کھانے کھلائے۔ دو ہفتہ کے بعد ہم نیویارک سے بخیریت لاہور پہنچ گئے۔

ستمبر میں دیار بکر (ترکی) میں ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کے موضوع پر ایک کانفرنس میں شریک ہوا۔ اس سفر میں میرے بڑے فرزند منیب میری دیکھ بھال کے لیے میرے ساتھ تھے۔ کانفرنس کا اہتمام ترکی کی نئی ''اسلام پسند'' رفاہ پارٹی نے استنبول اور دیار بکر شہروں میں کر رکھا تھا۔ اس سے پیشتر ترکی کے عام انتخابات کے قریب میں نے رفاہ پارٹی کی دعوت پر ترکی کے کئی شہروں مثلاً استنبول، انقرہ، قونیہ، ادانہ اور قیصریہ (یہ شہر سیزر کے زمانہ کا ہے اور رومن آثاروں سے بھرپور ہے) میں ''اقبال اور لبرل اسلام'' کے موضوع پر لیکچر دیئے تھے۔ جلسوں کا اہتمام ان شہروں کے میئروں نے کیا تھا۔ ان دنوں منیرہ کے بیٹے اقبال صلاح الدین میرے ہمراہ تھے۔ بعدازاں رفاہ پارٹی کے قائد اربکان کی حکومت قائم ہوئی۔ مگر فوج نے انہیں ہٹا کر رفاہ پارٹی بین کر دی اور یوں ترکی میں ''سیکولرازم'' دوبارہ رائج کر دیا گیا۔

۱۹۹۸ء میں پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت اپنے پورے جوبن پر تھی۔ محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کے شوہر کے خلاف بدعنوانی کے مقدمات دائر تھے۔ اپنی حکومت کے دوران محترمہ بینظیر بھٹو نے میاں نواز شریف، ان کے والد میاں محمد شریف اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں، ان کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔ ''پریذیڈنسی'' اور ''عدلیہ'' تابع کیے جا چکے تھے۔ افغانستان کے ''وارلارڈز'' میں خانہ جنگی کو ختم کرانے کے لیے وزیر اعظم نواز شریف نے بڑی کوششیں کیں۔ انہیں سعودی عرب لے کر گئے، ایک دوسرے نسلی گروپوں کو قبول کرنے، اقتدار میں حصہ دینے اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی خاطر قرآن کی قسمیں دلوائیں۔ مگر وہ واپس آ کر ان قسموں سے پھر جاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ پھر جنگ میں مصروف ہو جاتے تھے۔ تنگ آ کر پاکستان نے اپنی افغان پالیسی کچھ اس طرح وضع کی کہ ایک فریق کی مدد کی جائے جس کی ملک کے مختلف نسلی گروہوں میں اکثریت ہو اور جس کو با آسانی فوجی امداد دی جا سکے۔ یہ صورت روسی فوجوں کے انخلا اور افغانستان کے معاملات میں امریکہ کی عدم دلچسپی کے سبب پیدا ہوئی۔ بالآخر طالبان پاکستان کی مدد کے ساتھ باقی ماندہ گروہوں کو شکست دے کر نوے فیصد افغانستان پر قابض ہو گئے اور اسلام کی ایک ایسی متشدد، رجعت پسندانہ اور سخت قسم کی تعبیر نافذ کی کہ ملک میں قبرستان جیسا امن قائم ہو گیا۔ ہماری امداد نوے فیصد افغانستان پر قبضہ اور کسی بھی قیمت پر امن —— انہی وجوہ کے پیشِ نظر پاکستان نے اپنے دیرینہ دوست ایران کو ناراض کر کے طالبان کی اسلامی ریاست کو تسلیم کر لیا۔

اس ''ایجاب و قبول'' کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ وزیر اعظم نواز شریف کچھ حد تک طالبان طرز کا اسلام خود بھی پاکستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں شاید یہی صحیح اسلام تھا اور اس طرز کے اسلام کے نفاذ کے ذریعہ پاکستان کے سارے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ نیز کشمیر میں ''جہاد'' بھی جاری رکھا جا سکتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے ہم اب تک یہ طے نہیں کر پائے کہ علامہ اقبال اور قائد اعظم کے افکار کی روشنی میں

پاکستان کے سامنے ایک جدید' اسلامی' فلاحی' جمہوری مملکت کا کیا ماڈل ہے۔ ترکی' ایران' سعودی عرب یا طالبان؟ بہرحال جنرل ضیاء الحق کے زمانہ میں جس ماڈل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا وہ قریب قریب وہی تھا جو بعدازاں ''طالبان'' کے روپ میں رونما ہوا۔ پس علامہ اقبال اور قائداعظم کے نام بظاہر لیتے ہوئے ان کے نظریات سے انحراف کا جو عمل جنرل ضیاء الحق کے عہد سے شروع ہوا تھا' وزیراعظم نواز شریف نے اسے ہی آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

عملی قدم کے طور پر میاں صاحب نے ایک ایسے شریعت بل کو پارلیمینٹ میں منظور کرانا چاہا جو دستور سے بھی ''سوپرا'' یا ماوراقوت کا حامل تھا۔ ڈرافٹ بل مسلم لیگ پارلیمانی کمیٹی کی میٹنگ میں رکھا گیا اور وزیراعظم نواز شریف نے اس کی حمایت میں تقریر بھی کی۔ مگر بعض ممبران پارلیمینٹ مثلاً خورشید محمود قصوری' بیگم عابدہ حسین' فخرامام وغیرہ نے اعتراض کیا کہ اپنی موجودہ شکل میں شریعت بل پاس نہ ہونا چاہیے۔ خورشید محمود قصوری کو میاں صاحب نے جھاڑ پلادی کہ اگر شریعت بل کی یہ شکل قبول نہیں تو آپ استعفادے دیں اور وہ استعفادینے پر تیار بھی ہوگئے۔ مجھے بھی ان لوگوں نے کہا کہ میں بھی بل پر تبصرہ کروں مگر میں نے اس وقت خاموش رہنے کو بہتر سمجھا۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ خوشامدی حضرات جو میاں صاحب کو ''میرے محترم قائد! آپ کا حکم ہمارے سرآنکھوں پر'' کہتے ہوئے ان کے حق میں اور ''اسلام زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے لگارہے تھے بلکہ بل کے خلاف بولنے والوں کو ''غدار غدار ایجنٹ ایجنٹ'' کہہ کر خطاب کررہے تھے (ان میں سے اکثریت نے میاں صاحب کے ''دیس نکالے'' پرسب سے پہلے پارٹی کو چھوڑ دیا) نے کوئی کام کی بات کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ بل واقعی اس قابل نہیں تھا کہ پارلیمینٹ کے سامنے رکھا جائے۔ اگر پاس ہوجاتا تو وزیراعظم نواز شریف کو وہ اختیارات مل جاتے جو افغانستان میں امیرالمومنین ملاعمر کو حاصل تھے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو اپنی پسند کی ڈیموکریٹک ڈکٹیٹرشپ ملک میں نافذ کرنا چاہتی تھیں۔ دوسری طرف میاں نواز شریف بھاری مینڈیٹ کی بنیاد پر اسی طرز کے اختیارات اسلام یا شریعت بل کے ذریعہ امیرالمومنین بن کر لینا چاہتے تھے۔ میں نے اخبار ''نیشن'' میں اس بل پر تبصرہ کرتے ہوئے اس میں ترمیم کی ضرورت پر زور دیا۔ اس مرحلہ پر میں نے یہ بھی سوچا کہ وزیراعظم نواز شریف کو پرائیویٹ طور پر مشورہ دینا چاہیے کہ بل کی موجودہ شکل درست نہیں۔ خداجانے یہ بل کس نے ڈرافٹ کیا تھا۔ لامنسٹری میں سے تو کوئی بھی یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا اس لیے یہ معماہی رہا کہ بل کس نے ڈرافٹ کیا ہے۔ میاں صاحب خود تو یہ کام کرنہ سکتے تھے' مگر معلوم ہوتا ہے کسی گمنام شخص کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے میاں صاحب کی منشا کے مطابق انہیں شریعت کی ''واسکٹ'' سی کر پہنادی۔

میں نے بڑی محنت سے شریعت بل کا نیا ڈرافٹ تیار کیا جو خالصتاً جمہوری نوعیت کا تھا' یعنی جس کے تحت جو اختیارات میاں صاحب بطور چیف ایگزیکٹو اتھارٹی حاصل کرنا چاہتے تھے' پارلیمنٹ کی منظوری ہی سے حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ بل میں بعض خامیاں تھیں۔ مثلاً تحریر کیا گیا تھا کہ قرآن و سنت اسلام کا قانون ہے۔ شرعاً قرآن وسنت اسلامی قانون کے اہم ماخذ ہیں' اس لیے اس فقرے کی تصحیح ضروری تھی۔ پھر ایک شق کے تحت فرقہ وارانہ اختلاف کو تسلیم کیا گیا تھا' جو بات میری نگاہ میں جدید اسلامی قانون سازی کے ساتھ مطابقت نہ رکھتی تھی' چونکہ شریعت کا اصل مقصد فرقوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ بہر حال میں نے مجید نظامی کی منت کر کے وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کا وقت لیا اور اپنے ساتھ جسٹس (ر) ڈاکٹر نسیم حسن شاہ صاحب کو بھی لے گیا۔ میں نے میاں صاحب کو بتایا کہ شریعت بل کا تعلق چونکہ پاکستان کی نظریاتی اساس سے ہے' اس لیے بل کا ڈرافٹ ایسا ہونا چاہیے جسے پارلیمنٹ اتفاق رائے سے منظور کر لے۔ میاں صاحب کوئی آدھا گھنٹہ ہماری باتیں سنتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ڈرافٹ بل مجھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ بعد ازاں میاں صاحب نے ''اِدھر اُدھر'' یا شاید ''دائیں بائیں'' دیکھنا شروع کر دیا جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اب وہ ہماری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے اور ہم اٹھ کر چلے آئے۔

نیشنل اسمبلی میں وزیر اعظم نواز شریف نے شریعت بل کو اپنی اصلی شکل ہی میں پیش کیا جو اتفاق رائے کی بجائے ووٹوں کی اکثریت سے پاس ہوا۔ ظاہر ہے میرا ڈرافٹ بل میاں صاحب کو پسند نہ آیا تھا اور وہ پھینک دیا گیا۔ مگر شریعت بل ایکٹ نہ بن سکا کیونکہ سینٹ میں اس بل کو پاس کر سکنے والی ہماری اکثریت نہ تھی۔ پس مسلم لیگ پارٹی سینٹ کے اگلے الیکشن (مارچ ۲۰۰۰ء) کا انتظار کرنے لگی' جب انہیں اتنی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو جانے کی توقع تھی جس کے بل بوتے پر شریعت بل کامل طور پر شریعت ایکٹ بن سکتا' مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ وزیر اعظم نواز شریف نے اپنی کیبنٹ یا فارن آفس کے ساتھ مشورہ کر کے بھارت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کو لاہور آنے کی دعوت دی تھی یا یہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ بہر حال اس فیصلے کے متعلق ملک میں دو آراء تھیں۔ ایک کے مطابق تو تنازع کشمیر کے پس منظر میں انہیں اٹل بہاری واجپائی کو نہ بلانا چاہیے تھا اور دوسری کے مطابق تنازع کشمیر کے باوجود بھارت کے ساتھ صلح کرنے' اچھے تعلقات قائم کرنے اور تجارت بڑھانے میں کوئی ہرج نہ تھا۔ میں اصولی طور پر بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کے حق میں ہوں۔ میری نگاہ میں تقسیم ہند کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتراکِ اقتدار کا کوئی قابلِ قبول

فارمولا طے نہ پا سکا۔ بعدازاں جب تحریک پاکستان شروع ہوئی تو اس میں ہندی مسلمانوں کا اتنا ہی حصہ تھا جتنا ان علاقوں کے مسلمانوں کا جو بالآخر پاکستان میں شامل ہوئے۔ علاوہ اس کے بھارت میں نہ صرف کثیر تعداد میں اب بھی مسلمان موجود ہیں بلکہ ہمارا تمدنی سرمایہ بھی وافر مقدار میں وہاں رہ گیا ہے۔ پس کشمیر کا مسئلہ دوستانہ ماحول میں بھارت و پاکستان کے درمیان اگر باہم گفت وشنید سے طے پا جائے تو جنوبی ایشیا میں غربت وافلاس کا خاتمہ کرنے میں ممد ثابت ہو سکتا ہے۔

بہر حال وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کا لاہور آنا اور وزیراعظم نواز شریف کے ساتھ ''اعلانِ لاہور'' میں شریک ہونا دونوں حریف ملکوں کے درمیان دوستانہ ماحول پیدا کرنے میں یقیناً ممد ثابت ہوا۔ اگرچہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے اس ملاقات اور اعلانِ لاہور کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ مگر اس کے بعد جس بات کی سمجھ نہیں آتی وہ ''کارگل آپریشن'' تھا۔ کیا افواج پاکستان نے یہ ''ایکشن'' وزیراعظم نواز شریف کی ایما پر لیا یا فوجی ''ٹاپ براس'' نے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کی حمایت کرتے ہوئے وزیراعظم نواز شریف کو اعتماد میں لیے بغیر اپنے طور پر لیا؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے' مگر دونوں صورتوں میں یہ واقعہ میاں صاحب کے فیصلوں کے بنیادی سقم اور ان کی حکومت کی (بھاری مینڈیٹ کے باوجود) بنیادی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔

مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں ''کارگل آپریشن'' سے متعلق ہمیں بریفنگ بریگیڈیئر (اب میجر جنرل) قریشی نے دی۔ انہوں نے نقشوں کی مدد سے ہمیں آگاہ کیا کہ کس طرح بھارتی فوج ''لائن آف کنٹرول'' پر اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کی خاطر وقتاً فوقتاً اہم پہاڑی چوٹیوں پر اپنا قبضہ جماتی رہی ہے اور ہم خاموش بیٹھے دیکھتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے سیاچن جیسی مثالیں بھی دیں۔ پھر ہمیں بتایا گیا کہ ''کارگل آپریشن'' سے ہم نے کون کون سے اہم مقاصد حاصل کیے: (۱) آپریشن بھارتی افواج کو شدید نقصان پہنچانے کا باعث بنا۔ (۲) آپریشن کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر بین الاقوامی سطح پر ''فلیش پوائنٹ'' بنا۔ (۳) کشمیری مجاہدین کی تحریک آزادی جو کاہلی کا شکار ہو رہی تھی' آپریشن اس کے لیے تقویت کا سبب بنا اور (۴) پہلے تو مجاہدین ''ہٹ اینڈ رن'' پالیسی پر عمل کرتے تھے' مگر آپریشن سے ان میں دشمن کی افواج کو ''کنفرنٹ'' کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

میں نے ''کارگل آپریشن'' کی حمایت میں سینٹ میں اپنی تقریر میں یہی نکات دہرا دیئے۔ مگر میری تقریر کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اپوزیشن والے' جنہوں نے اس آپریشن کو ناکام قرار دیا تھا' طنزاً ہنستے رہے اور میری اپنی پارٹی میں سے کسی نے بھی میری تقریر کے اختتام پر ڈیسک بجا کر داد نہ دی۔ اس سے مجھے گمان ہوا کہ ''کارگل آپریشن'' کے مضمرات کے بارے میں شاید میاں صاحب کو آگاہ نہ کیا گیا تھا۔ اس کا اشارہ

وزیراعظم نواز شریف کی افراتفری کے عالم میں دوڑ کر امریکہ جانے اور صدر کلنٹن سے ہنگامی ملاقات کرنے سے بھی ملتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر کلنٹن کی مداخلت سے بھارت اور پاکستان میں نیوکلیائی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

کارگل کے مسئلے پر شاید سینٹ میں میری آخری تقریر تھی۔ اس سے پیشتر میں نے وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین کے پیش کردہ اس بل کی حمایت میں تقریر کی تھی جس کے تحت عورتوں کی بے حرمتی یا گینگ ریپ کرنے کے جرم کی سزا موت تجویز کی گئی تھی۔ بعض سینیٹروں کا خیال تھا کہ چونکہ ایسا عمل عموماً ''غیرت'' کے تحفظ کے سبب کیا جاتا ہے اس لیے مزید غور وفکر کے لیے بل لیگل کمیٹی کو بھیج دیا جائے، مگر میں نے اس تجویز کی مخالفت کی کہ جتنی مدت یہ مسئلہ کمیٹی کے زیرِ غور رہے گا ہم متاثرہ خاندانوں کی معصوم عورتوں کی بے حرمتی کرنے یا گینگ ریپ کرنے والوں کی تائید کرنے والوں میں شمار کیے جائیں گے۔ اس بات پر سینیٹ نے بل کو کمیٹی میں بھیجنے کی بجائے اسے منظور کر لیا، حالانکہ اب بھی اس قانون میں کئی سقم ہیں جن کی تصحیح کی ضرورت ہے۔

انہی ایام میں ''غیرت'' کی بنیاد پر ایک معزز پٹھان گھرانے کی خاتون کے لاہور کی ایک وکیل محترمہ عاصمہ جیلانی کے دفتر میں بہیمانہ قتل پر سینیٹر سید اقبال حیدر نے مذمت کی قرارداد پاس کرنے کے لیے تحریک پیش کی۔ قرارداد پر پیپلز پارٹی کے چند سینیٹروں کے دستخطوں کے علاوہ مسلم لیگی سینیٹروں راجہ ظفر الحق، اکرم ذکی، مشاہد حسین اور میرے دستخط تھے، مگر فرنٹیئر اور خصوصی طور پر فاٹا کے سینیٹروں کے احتجاج کے سبب قرارداد پر بحث نہ ہو سکی کیونکہ ان کے مؤقف کے مطابق یہ قتل ''غیرت'' کے مسئلہ پر ہوا تھا اور ''غیرت'' کے تحفظ کی خاطر ان کے کلچر کی روشنی میں کسی بھی فعل کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ بالآخر سینیٹر اجمل خٹک کی درخواست پر اس نازک مسئلے پر بحث التوا میں ڈال دی گئی۔ میں شرمندہ ہوں کہ وقتی مصلحت کے تحت سینٹ میں خواتین کے حقوق کے تحفظ کی خاطر وہ کردار ادا نہ کر سکا جس کی انہیں مجھ جیسے سینیٹروں سے توقع تھی۔ مگر بحث ختم نہیں ہوئی، صرف ملتوی ہوئی ہے انشاءاللہ مستقبل میں ملک میں بیداری کے ساتھ ہم یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل کر لیں گے۔

ستمبر ۱۹۹۹ء میں میں اور ناصرہ صدر رحمانوف کی دعوت پر دوشانبے (تاجکستان) گئے۔ اس دورے پر سہیل عمر اور ان کی بیگم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان ایام میں دوشانبے میں سرکاری طور پر سامانی خاندان کے بانی کا مجسمہ نصب کرنے کی رسم ادا کی گئی جس میں وسطی ایشیا کی ریاستوں اور روسی فیڈریشن سے بہت سارے مہمان مدعو کیے گئے تھے۔ بعد ازاں ''سیرالیک'' حروف میں علامہ اقبال کے فارسی کلام کی اشاعت کے موقع پر یونیورسٹی میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں ہم لوگ شریک ہوئے۔

تاجکستان میں سوویٹ عہد کے تعلیمی نظام کی بدولت ساری کی ساری قوم تعلیم یافتہ ہے۔ یہ لوگ اب تک سوویٹ زمانہ کو یاد کرتے ہیں، جب کھانے پینے کی اشیاء کی فراوانی تھی اور ہر کسی کو ملازمت مل سکتی تھی، تاجکستان نے مذہبی انتہاپسندوں اور میانہ رووں کے درمیان جنگ میں خاصا نقصان اٹھایا ہے، مگر اب دونوں فریقوں کی صلح کے بعد وہاں امن ہے۔ دوشامبے کے تھیٹر اور اوپیرا ہاؤس اسی صلح سے متعلق ڈرامے اور اوپیرا پیش کر رہے تھے، جو ہم نے بھی دیکھے۔ یہ سب ایک ہی کہانی پر مبنی تھے۔ سامانی خاندان کا بانی جب فوت ہوا تو اس کی وصیت کی رو سے بادشاہت بڑے بیٹے کو ملی۔ چھوٹے بیٹے نے بغاوت کر دی۔ دونوں بھائیوں کی لڑائی میں چھوٹے بھائی کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو کر بڑے بھائی کے سامنے لایا گیا۔ مگر ماں نے مداخلت کر کے دونوں بھائیوں میں صلح کرا دی اور اس صلح کے سبب ملک متحد ہو گیا اور قوم کی غربت دور ہو گئی۔ ماں سے مراد تاجکستان تھا۔ دو بھائی میانہ رو اور انتہا پسند تھے جن کی اشتراک وطن کی بنا پر صلح قومی اتحاد اور افلاس کے خاتمہ کا سبب بنی۔

اس دورے میں ہمیں تاجکستان کے قدرتی گرم پانی کے چشموں کے علاقہ میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک بڑے ہسپتال میں انہی معدنیات سے بھرے گرم پانی کی بھاپ سے جوڑوں کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ ہسپتال ایک فائیو سٹار ہوٹل کی مانند تھا۔ سوویٹ زمانہ میں یہ مقام روسیوں میں بڑا مقبول تھا اور تاجکستان کے لیے آمدنی کا ذریعہ تھا، مگر اب ویرانی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے سوا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

ایک زیارت گاہ جسے ہم دیکھنے کے لیے بیتاب تھے، وہ شاہ ہمدان کا مزار تھا۔ شاہ ہمدان کا ذکر ''جاوید نامہ'' میں آتا ہے۔ ان کے ہاتھوں کشمیر کے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ شاہ ہمدان کا مزار تاجکستان کے جنوبی حصہ میں واقع ہے اور چند میل دور افغانستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ افغان سرحد پر ہونے کے سبب یہ مقام ''ناردرن الائنس'' کی بڑی فعال چھاؤنی تھی اور یہاں فوج کی خاصی نقل و حرکت دیکھنے میں آئی۔ سوویٹ زمانہ میں شاہ ہمدان کے مزار کی زیارت ممنوع تھی اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہم سب نے قرآن مجید کے پارے منگوا کر پڑھے اور وہاں پر موجود امام نے ہم سے دعا کروائی۔

میری عدم موجودگی میں کارکنان تحریک پاکستان ٹرسٹ (جس کا میں چیئرمین تھا) کا سالانہ اجلاس ایوانِ اقبال لاہور میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت وزیر اعظم نواز شریف نے کی اور تحریک پاکستان میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو سونے کے تمغے عطا کیے۔ تمغہ حاصل کرنے والوں میں میری خوشدامن بیگم سعیدہ وحید بھی تھیں۔

دوشامبے سے واپسی کے دوسرے روز فارن آفس اسلام آباد سے فون آیا کہ مجھے وزیر خارجہ سرتاج عزیز صاحب کے ساتھ یو این کے اجلاس میں شرکت کی خاطر نیویارک جانا ہے، لہٰذا اسلام آباد

''بریفنگ'' کے لیے پہنچ جاؤں۔ اسلام آباد پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میرے ساتھ ایس ایم ظفر' بشپ اسکندر ملک اور رحمان (مانی) بھی جا رہے ہیں۔ ہم نیویارک پہنچ گئے۔ پی آئی اے کے روز ولٹ ہوٹل میں قیام کیا۔ پاکستان مشن کے پہلے اجلاس میں میں نے سرتاج عزیز صاحب سے پوچھا کہ ہم نے یہاں کیا کرنا ہے' کیونکہ یو این کی مختلف کمیٹیوں کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے مشن کے لوگ پہلے ہی سے مختص تھے۔ انہوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے نیویارک یا واشنگٹن میں سینیٹروں سے ملاقاتیں کر کے انہیں پاکستان کی کشمیر پالیسی سے متعلق بریف کرنا ہے۔ لیکن ہمیں پاکستانی سفیروں نے بتایا کہ امریکی سینیٹروں سے ایسی ملاقاتیں تو مہینوں پہلے دن اور وقت طے کر کے کی جا سکتی ہیں' اچانک ایسا بندوبست نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تقریباً دس روز یونہی بیکار نیویارک میں بیٹھے رہے۔ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ہمیں کس مقصد کے لیے نیویارک بھیجا گیا تھا۔ سرتاج عزیز بھی ہمیں کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ شاید انہیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ اگر ہم نے سینیٹروں سے ملاقاتیں کر کے پاکستان کی کشمیر پالیسی سے انہیں آگاہ کرنا تھا تو سفیروں کے ذریعہ ان ملاقاتوں کا انتظام ہمارے پہنچنے سے پیشتر کیوں نہ کرایا گیا؟ ممکن ہے وزیراعظم نواز شریف نے خود نیویارک آ کر یو این کے اجلاسوں میں شریک ہونا تھا اور اس کے بعد ''کیپٹل ہل'' پہنچ کر امریکن حکومت کے اربابِ بست و کشاد سے ملاقاتیں کرنا تھیں۔ شاید ان کے آنے پر ہی ہمیں اپنے فرائض سے آگاہ کیا جاتا۔ مگر ''کارِ جہاں دراز'' ہونے کے سبب انہیں اسلام آباد سے نکل سکنے کی فرصت نہ ملی اور ہم نیویارک بیٹھے ان کا ''انتظار'' کرتے رہے۔

بہرحال کچھ روز نیویارک میں بیکار وقت گزارنے کے بعد میں واپس لاہور پہنچ گیا۔ مجھ سے پیشتر ناصرہ بھی تہران اور مشہد (ایران) میں خواتین کی کسی کانفرنس میں شرکت کے بعد لاہور آ چکی تھیں۔ اچانک ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام کو لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ اسلام آباد پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے اور وزیراعظم نواز شریف گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم نے ٹیلی ویژن پر بی بی سی لگایا تو پاکستانی فوج کے جوانوں کو پاکستان ٹیلی ویژن کے ہیڈکوارٹرز کے بند گیٹ پر چڑھ کر اندر کودتے ہوئے دیکھا۔ میں نے گھبراہٹ میں ایک صحافی دوست کو فون کر کے پوچھنا چاہا کہ کیا ہوا ہے؟ انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ دو تین جرنیلوں کی کارروائی ہے۔ ابھی ''کاؤنٹر کیو'' ہو جائے گا اور وہ قابو کر لیے جائیں گے۔ مگر کوئی ''کاؤنٹر کیو'' نہ ہوا۔ تقریباً تین چار بجے رات کمانڈر ان چیف جنرل پرویز مشرف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا تو پتا چلا کہ واقعی ملک پر فوج قابض ہو چکی ہے' دستور ''معلق'' کر دیا گیا ہے' وزرائے اعظم و اعلیٰ فارغ اور اسمبلیاں تحلیل ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اطلاع ملی کہ وزیراعظم نواز شریف' شہباز شریف' وفاقی کیبنٹ کے چند وزراء اور انتظامیہ کے کچھ افراد

گرفتار کر لیے گئے ہیں اور ان پر مقدمات چلائے جائیں گے۔

اس جدید فوجی ''انقلاب'' کے پس منظر سے تو غالباً ہم سب تھوڑے بہت واقف ہیں' مگر پھر بھی چند ایسے سوال ہیں جن کا تسلی بخش جواب میاں نواز شریف ہی اپنی خودنوشت سوانح حیات میں دے سکتے ہیں۔ مثلاً جنرل پرویز مشرف کو کس کے مشورے سے اور کیوں کمانڈران چیف منتخب کیا گیا؟ اگر یہ فیصلہ بغیر کسی کے مشورے کے میاں صاحب کا اپنا تھا تو پھر بعد میں ان سے کس بات پر ناراض ہو گئے اور انہیں اچانک ہٹا کر ان کی جگہ جنرل خواجہ ضیاء الدین کو کمانڈران چیف بنانا چاہا؟ اگر ان سے ناراضگی کا سبب ''کارگل آپریشن'' کی ناکامی تھا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ''ایکشن'' میاں صاحب کی اجازت کے بغیر لیا گیا یا اس کے مضمرات ان سے پوشیدہ رکھے گئے؟ میاں صاحب نے جنرل پرویز مشرف کو ہٹانے کی خاطر جو طریق کار وضع کیا یا ہوائی جہاز اُترتے ہی ان کی گرفتاری کے سلسلہ میں جو احکامات جاری کیے کیا یہ سب ان کے اپنے ذہن کی اختراع تھا یا کسی کے مشورہ پر ایسا کیا گیا؟ کیا اتنا ''بڑا'' اتنا ''انوکھا'' اور اتنا ''عجیب و غریب'' فیصلہ کرتے وقت انہوں نے اپنی ''کچن کیبنٹ'' کے بااعتماد مشیروں سے صلاح مشورہ کیا تھا؟ یہ بات کیسے باہر نکلی کہ ''وقتی ہلچل'' ہے' اس کا سبب دو ایک جرنیل ہیں۔ ابھی ''کاؤنٹر کیو'' ہو گا اور بات صاف ہو جائے گی؟ کیا یہ آئی ایس آئی (انٹر سروسز انٹیلی جنس) اور ایم آئی (ملٹری انٹیلی جنس) کی آپس میں محاذ آرائی نہ تھی جس میں میاں صاحب کے ''تھنک ٹینک'' یعنی آئی ایس آئی نے انہیں غلط مشورہ دے کر گمراہ کیا اور بالآخر ایم آئی کامیاب رہی جس کے نتیجہ میں میاں صاحب کو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ جنرل جہانگیر کرامت کے استعفا ہی سے فوج کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور وہ میاں صاحب کے احکام کو مانیٹر کر رہے تھے۔ جب تک ستارے میاں صاحب کے حق میں گردش کرتے رہے ''پریذیڈنسی'' کا مسئلہ ان کی منشا کے مطابق طے ہو گیا اور اسی طرح ''عدلیہ'' کے سرکش چیف جسٹس بھی فارغ کر دیئے گئے۔ اب صرف ''فوج'' پر حاوی ہونا باقی رہ گیا تھا اور شاید اسی ضمن میں مغل شہنشاہوں کی پیروی کرتے ہوئے وہ ''انوکھا'' اور ''نادر'' قدم اٹھایا گیا جو صحیح مقام پر پڑنے کی بجائے غلط مقام پر پڑ گیا اور اس بھڑ کے چھتے کو بلاوجہ چھیڑ کر میاں صاحب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ ایک ہردلعزیز' باہمت' شریف اور نوجوان وزیراعظم کا محض ایک غلط مشورے کی بنا پر ایسا انجام ہوا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔

میاں نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے خلاف مقدمات چلے۔ باقی لوگ تو بری ہو گئے مگر میاں صاحب کو سزا ہو گئی۔ بالآخر کسی سمجھوتے کے تحت تقریباً سارے کا سارا شریف خاندان ملک بدر کر کے سعودی عرب بھجوا دیا گیا۔ محترمہ بینظیر بھٹو تو اپنے خلاف میاں نواز شریف کے چلائے ہوئے بدعنوانی کے مقدمات سے بچنے کی غرض سے پہلے ہی پاکستان سے باہر تھیں۔ پس ماضی قریب کی دو حریف

سیاسی جماعتوں کے ''پاپولر'' لیڈر پاکستان سے باہر بٹھا دیئے گئے۔ نتیجہ میں پیپلز پارٹی تو اس نقصان کے باوجود متحد رہی، مگر مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی اور اس کی رہی سہی قیادت دو حصوں میں بٹ گئی۔ سپریم کورٹ نے چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کے ''غصب اقتدار'' کو تین برس کی مدت تک اس شرط پر جائز قرار دے دیا کہ شفاف انتخابات کروا دیئے جائیں گے اور جیسے پہلے ہوتا چلا آیا ہے، انہیں دستور کی ترمیم کا اختیار بھی دیدیا گیا۔ بعدازاں انہوں نے جسٹس (ر) رفیق تارڑ کو نکال کر خود صدر کا منصب سنبھال لیا اور اپنی ''ہینڈ پکڈ'' کیبنٹ بنا کر حکومت کرنے لگے۔

باب ۱۲۔

سفر جاری ہے

دسمبر ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر حفیظ ملک پاکستان آئے ہوئے تھے اوران کی بڑی خواہش تھی کہ طالبان کا افغانستان جا کر دیکھا جائے۔ چنانچہ میں' ڈاکٹر حفیظ ملک اور جنرل امتیاز اسلام آباد سے کابل بڑی لینڈ کروزر گاڑی میں روانہ ہوئے۔ پشاور سے جلال آباد تک کا سفر تو مشکل نہ تھا مگر جلال آباد سے کابل کا سفر واقعی مشکل تھا۔ سڑک بمبارٹمنٹ کے سبب گڑھوں سے پُرتھی بلکہ جگہ جگہ اتنی خستہ تھی کہ آگے بڑھ سکنا ممکن نہ تھا۔ البتہ سڑک کے دونوں طرف پوست کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ ہمیں کابل پہنچتے کئی گھنٹے لگے اور وہاں پہنچ کر محسوس ہوا کہ ایک ''ناکام ریاست'' کیا ہوتی ہے۔ افغانستان گزشتہ کئی برسوں سے کیفیت جنگ میں رہ چکا ہے۔ پہلے تو سوویٹ افواج کا مقابلہ یہاں کے مجاہدین نے پاکستان اور امریکہ کی مدد سے کیا اور وہ روسیوں کو خاصی تباہی کے بعد اپنے ملک سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد یہی مجاہدین اپنے اپنے علاقوں میں افغانستان کے ''وار لارڈز'' بن کر آپس میں لڑنا شروع ہو گئے اور اس خانہ جنگی سے ملک میں بالعموم اور کابل میں بالخصوص بڑی تباہی مچی۔ ایسے ایسے ظلم ہوئے کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ اس خانہ جنگی کے نتیجہ میں اور شہر تو ہم نے دیکھے نہیں' کابل کا شہر ایک بڑا کھنڈر لگتا تھا تاریخی عمارتیں' محلات' باغات اور بازار سب بری طرح تباہ و برباد کر دیئے گئے تھے۔ مثلاً مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کا مزار گولیوں سے چھلنی تھا۔ علامہ اقبال کے دوست افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کا مزار گولہ باری سے بالکل تباہ کر دیا گیا تھا۔ اسی نادر شاہ کے فرزند ظاہر شاہ نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں علامہ اقبال کی تربت کے لیے کتبہ اور تعویذ کابل سے لاہور بھیجے تھے جو اب ان کی تربت کی زینت ہیں۔

کابل میں ہم ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ اگرچہ شہر میں امن تھا مگر حالات اچھے نہ تھے۔ گرم پانی کبھی ملتا تھا کبھی نہیں۔ رات نو بجے کرفیو لگ جاتا تھا۔ رات بھر کابل سے کچھ فاصلے پر ''ناردرن الائنس'' اور طالبان کے درمیان جنگ میں گولے پھٹنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ غربت اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ سڑک پر بارود سے اڑی ہوئی ٹانگوں والے بوڑھے' جوان' بچے اور بچیاں سینکڑوں کی تعداد میں بھیک مانگتے

پھرتے تھے۔ ہمارے سوروپوں میں سینکڑوں کی تعداد میں افغانی مل جاتے تھے اور جتنے دن بھی ہم کابل میں رہے، یہی کرتے تھے کہ تین چار سو روپے کے کئی سینکڑوں افغانی خرید لیتے اور بھکاریوں میں خیرات کردیتے۔ اچھے زمانوں میں غالباً چار روپوں میں ایک افغانی ملتا تھا اور روٹی ایک افغانی سے کم قیمت میں مل جاتی تھی۔ اب روٹی کی قیمت دو سو افغانی تھی۔ زمین میں جگہ جگہ "مائنز" ابھی تک دفن تھیں۔ جو سڑکیں یا علاقے صاف نہ کیے گئے تھے وہاں چلنے پھرنے کی ممانعت تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے سب اسکول بند پڑے تھے۔ کابل یونیورسٹی بھی گولہ باری سے نہ بچی تھی اور بالکل ویران تھی۔ عورتوں پر خصوصی طور پر سختی تھی۔ بازاروں میں صرف برقع پوش خواتین پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہم غزنی اور قندھار بھی جانا چاہتے تھے۔ میں خصوصی طور پر غزنی میں سلطان محمود کے مزار کی زیارت کرنا اور حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کے والد کی تربت پر حاضری دینا چاہتا تھا کیونکہ یہ وہ مقامات تھے جہاں علامہ اقبال تشریف لے جاچکے تھے۔ مگر سفیر صاحب نے اجازت نہ دی کیونکہ غزنی کا سفر ابھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ کابل کا ریڈیو شریعت سننے کا اتفاق تو ہمیں نہ ہوا۔ البتہ ہماری گاڑی کو سڑک پر گزرتے ہوئے ایک کالی پگڑی والے "طالبان" نے روکا اور ڈرائیور سے گاڑی میں پڑے کیسٹ چیک کرانے کو کہا، مگر چونکہ گاڑی ایمبیسی کی تھی اس لیے اس نے جانے دیا۔ ہمیں ملا عمر سے ملاقات کی توقع تو نہ تھی۔ البتہ کابل میں کسی نہ کسی وزیر سے مل کر افغانستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر سفیر صاحب وزیر صاحب سے ہماری ملاقات کا وقت لیتے تھے اور وہ ٹال مٹول کر جاتے تھے۔ ایسا دو تین مرتبہ ہوا، لہٰذا ملاقات نہ ہوسکی۔

بہرحال سفیر صاحب کے کہنے پر کابل کے چیف جسٹس ہم سے ملاقات کے لیے تیار ہوگئے۔ مجھے معلوم نہیں اب کہاں اور کس حال میں ہیں۔ انہوں نے ہم سے اپنے دفتر میں ملاقات کی۔ غالباً گوجرانوالے کے کسی مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے۔ اردو جاننے کے باوجود نہ بولتے تھے۔ پشتو ہی میں گفتگو کی جو مترجم اردو میں منتقل کرتا رہا۔ زیادہ تر سوال میں نے ان سے کیے کیونکہ ان کا ہم پیشہ ہونے کی صورت میں میرا ان کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا تعلق بنتا تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ملک کے دیوانی قوانین میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی۔ البتہ فوجداری قوانین شریعت کے مطابق نافذ کردیئے گئے ہیں۔ اسلامی سزاؤں (حدود) کے بارے میں فرمایا کہ "لواطت" کے کیس میں، اگر جرم کا ارتکاب فریقین کے ایما سے ہوا ہو تو فاعل اور مفعول دونوں کو زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی ہے۔ "زنا" کے کیس میں زانی و زانیہ دونوں کو پتھر مار کر مارنے (رجم) کی سزا دی جاتی ہے یا دیوار تعمیر کرکے ان پر گرا دی جاتی ہے یا انہیں کسی پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کھڈ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ میں نے اجتہاد کی بات کرتے ہوئے انہیں حضرت معاذؓ بن جبل سے متعلق حدیث کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ قیامت تک نافذ العمل ہے یا

نہیں؟ فرمایا کہ آئمہ کرام نے قرآنی احکام کی ایسی مدلل تشریح کردی ہے کہ اب اس حدیث کی اہمیت ختم ہوچکی ہے۔ مختصراً ان کا مطلب تھا کہ اب اجتہاد کے دروازے بند ہوچکے ہیں۔ اس پر میں نے ان سے مزید سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جب ہم اٹھ کر جانے لگے تو مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ محمد علی جناح نے صرف پاکستان بنایا' مگر علامہ اقبال تو ساری دنیائے اسلام کے رہبر ہیں۔ میں نے طنزاً جواب دیا ''جی ہاں! انہوں نے معاذؓ بن جبل کے حوالے سے اجتہاد کے تاقیامت جاری رہنے کی بات کی تھی۔ شاید ان کی اس غلطی کے سبب علماء حضرات نے ان پر کفر کا فتوئٰ صادر کردیا۔''

ہم کابل سے واپسی پر اکوڑہ خٹک رکے اور مولانا سمیع الحق سے ملاقات ہوئی۔ میں انہیں سینٹ کے دنوں سے جانتا تھا۔ فرمایا کہ آپ لوگ مجھے بتا کر افغانستان جاتے تو ملا عمر بذاتِ خود آپ کا استقبال کرتے۔ بہرحال ہم نے ان کے عالیشان مدرسے کی سیر کی جہاں شاید ہزار کے قریب غریب طلباء دینی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ یہ مدرسہ زیادہ تر صاحب ثروت لوگوں کی مالی امداد سے چلتا ہے۔ تعلیم کا کورس چھ سال کا ہے۔ طلباء کے لیے رہائش اور خوراک کا انتظام مفت ہے۔ مولانا سمیع الحق نے اصرار کیا کہ میں طلباء سے خطاب کروں۔ چنانچہ مدرسے کے وسیع وعریض ہال میں سب طلباء فرش پر بیٹھ گے اور قدرے اونچی مسند پر اساتذہ کے ساتھ ہم بھی بیٹھ گئے۔ میرے لیکچر کا ماحصل یہ تھا کہ اگر میں جوان ہوتا اور اس مدرسے میں پڑھنے کے لیے آتا تو ''معاملات'' سے متعلق احکام کو وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی خاطر کوئی نئی راہ تلاش کرنے کی جستجو کرتا۔ طلباء کو چاہیے کہ اساتذہ سے سوالات پوچھنے پر ہچکچایا نہ کریں کیونکہ سوالات کرنے سے ہی قومیں علم کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں۔ کسی مسئلہ کے حل کو حتمی نہ سمجھیں بلکہ علم کے میدان میں ''شک'' سے ابتدا کریں کیونکہ بغاوت ہی سے نئی راہیں کھلتی ہیں اور انقلاب آتے ہیں۔ طلباء نے میری تقریر بڑے غور اور استعجاب سے سنی۔ لیکن کوئی تبصرہ کیا نہ کوئی سوال اٹھایا۔ مولانا سمیع الحق نے ہمیں رخصت کرتے وقت فرمایا کہ ہمارے مدرسہ کی کتاب پر کچھ لکھ دیجئے۔ میں نے علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار تحریر کردیئے ؎

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں عہد کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمت پیر کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتی نازک رواں
چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھیئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

لاہور واپس پہنچ کر میں نے چند تقریریں "طالبان" کے حق میں کیں اور حکومت پاکستان پر زور دیا کہ "طالبان" کی امداد جاری رکھنی چاہیے کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ اس پر میرے ہاں علماء حضرات کے وفد آنے شروع ہو گئے۔ ان کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ جذباتی طور پر وہ "طالبان" اور ان کی اسلامیت سے کس قدر متاثر ہیں بلکہ میری ان کے ساتھ ہمدردی کے سبب مجھے "بارن اگین مسلم" (نیا مسلمان) سمجھنے لگے ہیں۔ میں نے واضح کیا کہ میں اسی طرح کا مسلمان ہوں جیسے پہلے تھا۔ "طالبان" حکومت کی امداد سے میری مراد افغانوں کی امداد جاری رکھنا ہے کیونکہ افغانستان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھنا ہماری "جیوپولیٹیکل" (یعنی جغرافیائی سیاست کی) شدید ضرورت اور مجبوری ہے۔ جس طرز کی اسلامیت "طالبان" نے افغانستان میں رائج کر رکھی ہے، یہ ان کا اپنا معاملہ ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اسی طرز کی اسلامیت پاکستان میں رائج کرنی چاہیے۔ یہ صورت ویسے ہی ہے جیسے انقلاب ایران کے بعد ایرانیوں نے اپنی طرز کی اسلامیت وہاں نافذ کی۔ ممکن ہے افغانی اور ایرانی حکومتوں کی نظریاتی شدت پسندی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میانہ روی کے راستے پر آ جائے۔ مگر جس طرح ایران سے دوستانہ تعلقات کے باوجود اب تک ان کا حکومتی "ماڈل" ہم نے قبول نہیں کیا، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ افغانستان سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی آرزو کے ساتھ ہم ان کا حکومتی "نمونہ" بھی خرید لیں۔

بہر حال پاکستانی علماء حضرات کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مجھے فوری طور پر احساس ہوا کہ وہ "طالبان" کی طرز اسلامیت کو صحیح سنی اسلامیت سمجھتے ہوئے اسے کسی نہ کسی انقلاب کے ذریعہ پاکستان میں رائج دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے جذبات کی شدت سے گمان ہوتا تھا کہ جس طرح سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی انقلابی جہادی تحریک یا خلافت کے زمانہ کے جوش و خروش نے برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو تہہ و بالا کیا تھا اسی طرح اب "طالبان" کے اسلامی "ماڈل" کو اپنا کر وہ یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگیوں کو یکسر بدل دینے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں اور اس مقصد کی تحصیل کے لیے وہ کسی بھی بیرونی یا اندرونی قوت سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہیں۔ دراصل پاکستان میں اس پودے کی آبیاری جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو طول دینے کی خاطر کی تھی اور اب یہ پودا رفتہ رفتہ نہ صرف ایک تن آور درخت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا بلکہ متشدد جہادی تنظیموں کے سہارے پاکستان میں ٹھیٹھ سنی اسلام کے احیاء کے ساتھ "طالبان" طرز کا

انقلاب لانے کے بھی درپے تھا۔

جنرل پرویز مشرف نے ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہی بین الاقوامی کمیونٹی کے سامنے پاکستان کا ''لبرل'' یا میانہ رو امیج پیش کرنے کی کوشش کی' کبھی تو انہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا آئیڈیل قرار دیا' کبھی بغلوں میں کتے والی تصویریں کھنچوا کر میڈیا میں تقسیم کیں۔ ان کی حکومت کی طرف سے چند بیان ایسے بھی آئے جن سے یہ تاثر دیا گیا کہ ''توہین رسالت'' کے قانون کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیے اس کے ضابطہ اطلاق میں ضروری ترامیم کی جائیں گی۔ مگر علماء حضرات کے احتجاج اور شوروغل پر کہ پاکستان کو ''سیکولر'' ریاست بنایا جارہا ہے' ان کے ''تھنک ٹینک'' یا خصوصی مشیروں نے انہیں چند قدم پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ کسی مذہبی گروہ کی بلاجواز دل آزاری کا باعث نہ بنیں۔

بہرحال پاکستان میں مذہبی شدت پسندی کو روز بروز فروغ حاصل ہورہا تھا اور اس کا اظہار بھی فرقہ وارانہ دہشت گردی کی صورت میں رونما ہونے لگا تھا جسے حکومتی مشینری کنٹرول نہ کرسکتی تھی۔ مسجدوں اور امام بارگاہوں میں مسلمانوں کو مسلمان بے دریغ قتل کررہے تھے۔ پاکستان جو اسلام کے نام پر سب فرقوں کے مسلمانوں کے لیے وجود میں لایا گیا تھا اب اسلامی فرقہ پرستی کی خانہ جنگی میں مبتلا ہوکر خودکشی کرنے پر تلا ہوا لگتا تھا۔ شروع شروع میں اس قتل وغارت کو سعودی اسلام اور ایرانی اسلام کی ''پراکسی وار'' قرار دیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ پاکستان میں مذہبی دہشت گردی عام ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ عوام بھی اس سے مانوس ہوگئے۔ اب کوئی سنی یا شیعہ عالم درس دے کر گھر واپس جاتے ہوئے موٹر سائیکل سوار دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہوجائے یا کسی مسجد' امام بارگاہ یا کلیسا میں عبادت گزار بیسیوں کی تعداد میں کلاشنکوف کی گولیوں یا گرنیڈوں کا نشانہ بنیں تو ایسے واقعات کو روزمرہ کا معمول سمجھ کر نظرانداز کیا جانے لگا اور اگر حکومت دہشت گردوں کو پکڑنے میں ناکام رہے تو یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل کرلیا جاتا کہ ''کراس بارڈر'' دہشت گردی ''را'' نے کروائی ہے' بھلا مسلمان کسی مسلمان یا بے گناہ مسیحی کو کیسے مار سکتا ہے۔

۲۰۰۰ء کے ساتھ نئے ''ملینیم'' اور نئی صدی کی ابتدا ہوئی۔ حالات کے پس منظر میں میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کردیا کہ بانیانِ پاکستان نے پاکستان کے لیے کس طرز کا اسلامی ''ماڈل'' تجویز کررکھا ہے؟ کیا انہیں ترکی' ایران' طالبان یا سعودی عرب کے اسلامی ماڈلوں میں سے کوئی ایک قابلِ قبول ہوسکتا تھا؟ یا ان کی نگاہ میں ان سب سے بہتر ان کا اپنا ماڈل تھا؟ ان کے ہاں قومیت' ریاست اور اقتدار کا کیا تصور تھا؟ اسلامیت سے وہ کیا مراد لیتے تھے؟ میں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انگریزی میں ایک کتاب بعنوان ''اسلام اور پاکستان کی شناخت'' لکھنا شروع کی۔ دراصل یہ کتاب تو میں نے اسی دن سے لکھنا شروع کردی تھی جب میاں نواز شریف نے شریعت بل کا اپناڈرافٹ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی

کے اجلاس میں پیش کیا تھا اور بعدازاں میرا ڈرافٹ کردہ بل ناقابلِ قبول سمجھتے ہوئے شاید پھینک دیا گیا تھا۔ کتاب مکمل کرتے مجھے ڈیڑھ دو برس لگے۔ ویسے بھی سینٹ اور سیاست سے فراغت کے بعد اب میرے جیسا شخص تین ہی کام کرسکتا تھا: یا پڑھتا چلا جائے یا لکھتا چلا جائے یا بولتا چلا جائے۔

وقت دریا کی طرح بہتا جاتا ہے۔ اس میں پیش آنے والے حوادث نیک یا بد ہو سکتے ہیں۔ ناصرہ گزشتہ برسوں میں اپنے لیکچروں کے سلسلہ میں آسٹریلیا کے مختلف شہروں سے ہوتی ہوئیں وی آنا (آسٹریا) چھو کر واپس پہنچیں اور ماہ فروری ۱۹۹۹ء میں لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے انتخابات میں الجھ گئیں۔ مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے ۲۰۰۰ء میں زیادہ بولنا نہیں پڑا۔ صرف دو مرتبہ ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ڈیٹرائٹ (امریکہ) میں پاکستانی امریکنوں نے یوم اقبال کی تقریب پر مجھے بلالیا اور میں نے این آر بر یونیورسٹی میں چند لیکچر دیئے۔ دوسری بار دسمبر کے ابتدائی حصہ (دوران رمضان) میں مولانا رومی سے متعلق کانفرنس میں شرکت کے لیے انقرہ اور قونیہ (ترکی) جانا ہوا۔ انقرہ کے اجلاس میں میرے مقالے کا عنوان بمطابق معمول ''شیطان: رومی، گوئٹے اور اقبال کے نزغے میں'' تھا۔ ترک دانشور اور خصوصی طور پر مولانا کے پرستار رومی کی ''شیطان شناسی'' کے موضوع پر میرے تحقیقی مقالے بڑی دلچسپی سے سنتے تھے بلکہ ہر دفعہ مطالبہ کرتے کہ علامہ اقبال کا قول دہرایئے: ''بدی کی ایک اپنی تعلیمی حیثیت ہے، نیک لوگ عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔''

نیک لوگ کیوں بے وقوف ہوتے ہیں؟ اپنی سادہ لوحی کے سبب۔ جو لوگ بدی میں مستقل طور پر غرق رہنے کی بجائے اس سے سبق حاصل کرتے ہیں، وہ اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دنیا میں زیادہ چالاک، عیار اور دوسرے لفظوں میں ''باوقوف'' ہوتے ہیں۔ گوئٹے کا ڈاکٹر فاؤسٹ شیطان کے ساتھ معاہدہ کرنے کے باوجود اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر بدی سے زیر ہونے کی بجائے بالآخر اس پر حاوی ہوا اور چونکہ وہ شیطان کی معیت میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنی ارضی حیات میں خدا سے خوف کھاتا اور خدا سے معافی کی امید پر زندہ رہا، خدا نے اسے معاف کردیا۔

ترکی سے واپسی کے چند روز بعد یعنی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء کی شام کو غسل خانہ میں نہاتے ہوئے میرا پاؤں فرش پر لگی نئی ٹائلوں پر پھسلا۔ میں بری طرح گرا اور میرے کولہے کی ''فیمر بون'' فریکچر ہوگئی۔ خدا جانے یہ سزا کس کی طرف سے ملی۔ شیطان سے؟ خدا سے؟ یا شاید نیک لوگوں کی بددعا سے؟ سرجری کرانی پڑی۔ کولہے میں دو کیل ٹھونکے گئے۔ ہفتہ بھر شیخ زید ہسپتال میں داخل رہا۔ جسٹس ارشاد حسن خان چیف جسٹس سپریم کورٹ مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ فرمایا: ''یہ آپ نے کیا کرلیا، میں تو آپ کا نام ہیگ ٹرائیبونل کے ممبر کے طور پر بھیجنے کا سوچ رہا تھا۔'' میں گھر آیا اور مہینہ بھر کہیں آنے جانے کے لیے ''ویل

چیئر'' استعمال کرنی پڑی۔ پھر ''ویل چیئر'' سے ''واکر'' کے سہارے چلا۔ پھر ''سٹیل سٹک'' اور بالآخر عام چھڑی سہارا بنی۔ تقریباً سارا سال ۲۰۰۱ء اسی کیفیت میں گزارا۔

اس حادثے نے زندگی میں پہلی بار مجھے احساس دلایا کہ میں اب جوان نہیں رہا۔ میں ویسے تو بہت کم بیمار رہا ہوں۔ مگر ستر برس کی عمر میں داخل ہونے پر ابتدا ''بلڈ پریشر'' کے عارضہ سے ہوئی۔ ایک شام سیر کرتے ہوئے میری بائیں آنکھ کے سامنے سیاہ دھبا سا آ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی پتنگا میری آنکھ میں گھس گیا ہے' مگر آنکھ ملنے سے دھبا غائب نہ ہوا۔ ٹیسٹ وغیرہ کرائے۔ معلوم ہوا کہ آنکھ کی پتلی کو خون پہنچانے والی رگ ''بلڈ پریشر'' کے سبب پھٹ گئی ہے اور سیاہ دھبا دراصل ''ہیمر یج'' کے باعث نظر آتا ہے۔ علاج سے آنکھ تو ضائع نہ ہوئی۔ دھبا چلا گیا مگر بینائی میں خاصا فرق پڑ گیا۔ ''بلڈ پریشر'' کو قابو میں رکھنے کے لیے دوائیاں کھانی شروع کیں۔ پھر نیویارک میں انجیو پلاسٹی بھی ہوئی۔ مگر غسل خانے میں گرنے اور کولھے کی ہڈی کے فریکچر کے سبب مجھ پر ''ڈیپریشن'' طاری ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو اپاہج اور معذور محسوس کرنے لگا۔ میں ہر روز ایک گھنٹہ تیز چلنے کا عادی تھا۔ میں مغربی رقص کا دلدادہ تھا۔ مگر اب گھنٹوں بیٹھا بغیر کسی سوچ کے موضوع کے سوچتا رہتا اور اگر سوچ کا کوئی موضوع سوچنے میں کامیاب ہو جاتا تو کبھی تخیل میں سیڑھی لگا کر اپنے آپ کو آسمان پر چڑھتے دیکھتا' کبھی نیوکلیئر بم کے پھٹنے سے اسرائیل اور امریکہ کی تباہی کے مناظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے۔ نہ پڑھنے کو جی چاہتا' نہ لکھنے کو' نہ بولنے کو۔ ''افسردگی'' یا ''ڈیپریشن'' بجائے خود ایک عارضہ ہے۔ اس کا علاج بلکہ فوری علاج نہایت ضروری ہے ورنہ بگڑ جائے تو تخیل اور حقیقت میں امتیاز نہیں رہتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا پرابلم اس کا جسم ہے جس میں دماغ بھی شامل ہے۔ بڑھاپے کے سبب پہلے تو جسم میں دردیں نکلنی شروع ہوتی ہیں۔ گردن' کندھے' پیٹھ' کمر' گھٹنے ان دردوں کا نشانہ بنتے ہیں۔ پھر کان اونچا سننے لگتے ہیں۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ نقطے سے تیرنے لگتے ہیں۔ شروع شروع میں یوں لگتا ہے جیسے مچھر ہوں اور ہاتھ بے اختیار اٹھ کر آنکھوں کے قریب تالی بجا کر انہیں مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یادداشت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی چہرہ یاد رہتا ہے مگر نام بھول جاتا ہے اور کبھی نام یاد رہتا ہے مگر چہرہ بھول جاتا ہے۔ بعض اوقات اچھے بھلے جانے پہچانے' پہچانے نہیں جاتے۔ بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اسی طرح بڑھتی عمر کے ساتھ جب قوتِ مردمی روبہ تنزل ہونے لگتی ہے تو ابتداً یہ بات بڑی تشویش کا باعث بنتی ہے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دراصل شہوت کے ساتھ ہر مرد کی انا کی وابستگی ہے۔ اس لیے اس کمزوری کو صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کی جاتی۔ بعض اصحاب میں وقت گزرنے کے ساتھ جنسی خواہش ہی مر جاتی ہے۔ یوں وہ اسٹیج آ جاتی ہے جب انسان مصلے پر بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگتا ہے۔ لیکن بعض اوقات

ایسی کمزوریوں کے باوجود انسان کے اندر کا حیوان باہر جھانکنے سے باز نہیں رہتا۔

رومی، گوئٹے اور اقبال ان فلسفی شعراء میں سے ہیں جو انسانی ارتقاء کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق محض کھیل تماشے کے طور پر نہیں کی بلکہ حیات کے کئی ارتقائی مراحل سے گزر کر انسان انسان کے مرحلہ تک پہنچا ہے اور ابھی اس نے مزید کئی ارتقائی منازل طے کر کے اس مقام پر پہنچنا ہے جسے الجیلی ''انسانِ کامل''، ابنِ باجہ ''متوحد''، رومی ''انسانِ برتر''، نطشے ''مافوق الانسان'' اور اقبال ''ہمکارِ خدا'' کا نام دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ میری نگاہ میں تو انسان کے اندر رینگنے والے کیڑے مکوڑے، کانٹے دار پودے اور جھاڑیاں، پرندے، خونخوار حیوان وغیرہ یعنی اس کے آباؤاجداد ابھی تک زندہ موجود ہیں۔ خدا کے نازل کردہ مذاہب یا ادیان بھی اس کے اندر کے حیوان کو مستقلاً زیر نہیں کر سکے۔ مذہبی جبر یا ثقافتی رواداری سب اسے قابو کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس اندر کے حیوان کو بعض لوگ شیطان سمجھتے ہیں۔ مگر شیطان تو اپنے تکبر کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا۔ انسان کے معتوب ہونے کا باعث تکبر نہیں بلکہ اس کی بھوک اور شہوت تھے۔ بھوک اور شہوت حیوانی خصوصیات ہیں، شیطانی نہیں۔ میرے خیال میں خداوند تعالیٰ کا یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا ــ

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

اسی سال ایک روز اچانک چیف ایگزیکٹو کے دفتر سے مجھے فون آیا کہ اسلام آباد پہنچوں۔ جنرل پرویز مشرف نے بھارت جا کر واجپائی سے کشمیر پر بات چیت کرنے سے پیشتر ریٹائرڈ جرنیلوں، سابق وزرائے خارجہ یا بیوروکریٹوں اور دانشوروں کا ایک اجلاس انہیں بریف کرنے کی خاطر بلایا ہے۔ میں حیران تھا کہ میں کس کھاتے میں بلوایا گیا ہوں۔ میری جنرل پرویز مشرف سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ بہرحال اسلام آباد پہنچا اور وزیراعظم ہاؤس میں دیگر اصحاب کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوا۔ اس اجلاس میں پرانے جرنیلوں مثلاً جنرل لودھی، جنرل حمید گل، جنرل مرزا اسلم بیگ وغیرہ نے کشمیر کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لمبی لمبی تقاریر کیں۔ اسی طرح سابق وزرائے خارجہ مثلاً صاحبزادہ یعقوب علی خان، گوہر ایوب، سرتاج عزیز وغیرہ نے اپنا اپنا نقطہ نگاہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مبشر حسن، نیاز نائیک اور چند دیگر لوگوں نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا۔

میں نے بھی اپنی باری پر اس مسئلہ پر مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ ہمیں واجپائی صاحب سے بات چیت کرتے وقت ان چار نکات کا خیال رکھنا ہوگا: (۱) کشمیر پر پاکستان کا ''کلیم'' ''ڈی جیوزے'' (قانونی) ہے اور بھارت کا ''کلیم'' ''ڈی فیکٹو'' یعنی علاقہ پر قابض ہونے کے ناتے سے

اپنے آپ کو اس کا حقیقی مالک سمجھتا ہے۔ ان حالات میں اس مسئلہ پر ہم ''ایکٹ'' (عمل) کی بجائے صرف ''ری ایکٹ'' (ردعمل) کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔ پس مسئلہ سلجھانے کی خاطر ''پہل'' بھارت کو کرنی پڑے گی۔ بھارت ہی کو ''آفر'' دینی ہوگی کہ وہ کیا حل پیش کرتے ہیں اور کس حد تک آگے بڑھنے کو تیار ہیں۔ (۲) اگر بھارت نے گفت و شنید کا دروازہ کھولا ہے تو پاکستان کی طرف سے اسے کبھی بند نہیں ہونا چاہیے بلکہ صلح کی خاطر نیک نیتی کا اظہار کرتے ہوئے اگر بھارت کے ساتھ ''نارمل'' طور پر تجارتی یا دیگر روابط پیدا کیے جا سکیں تو اس میں کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ (۳) پاکستان کی کوشش ہونی چاہیے کہ گفت و شنید میں کشمیری قائدین کو بہر صورت شریک کیا جائے کیونکہ جو بھی مسئلہ کا مستقل حل ہوگا ان کی منشا کے مطابق ہونا چاہیے اور (۴) جب تک مسئلہ کا کوئی مثبت اور قابل قبول حل نہیں نکلتا' کشمیر کی تحریکِ آزادی کو زندہ اور جاری رکھنا چاہیے اور کشمیریوں کی جو مدد پاکستان کر رہا ہے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔

جنرل پرویز مشرف ہم سب کی باتیں بڑے غور سے سنتے اور اپنے نوٹس لیتے رہے۔ میری تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا کلیم بھی ''ڈیفیکٹو'' ہے۔ لیکن میں نے ضروری نہ سمجھا کہ ان کے ساتھ بحث کروں' کیسے ''ڈیفیکٹو'' ہے؟ اجلاس صبح دس بجے شروع ہوا اور تین بجے دوپہر تک جاری رہا۔ جنرل صاحب نے معذرت کی کہ لنچ کا انتظام اس لیے نہ کیا جا سکا کہ ان کے خیال کے مطابق اجلاس ایک بجے تک ختم ہو جانے کا امکان تھا' مگر انہیں اس اجلاس کے ذریعہ بعض ایسی معلومات حاصل ہوئیں کہ اجلاس کی طوالت کا خیال تک نہ آیا۔

جنرل پرویز مشرف جناب واجپائی کے ساتھ کشمیر اور ہندو پاکستان کے مابین دیگر اختلافی مسائل پر بات چیت کرنے کی خاطر آگرہ تشریف لے گئے۔ مگر یہ کوشش بھی ایسی پچھلی کوششوں کی طرح ناکام رہی۔

یکم مئی ۲۰۰۱ء سے ناصرہ دوبارہ لاہور ہائی کورٹ کی جج بنا دی گئیں۔ تقرر کوئی خاص مسرت کا باعث نہ تھا کیونکہ اگلے سال کے آخر میں باسٹھ برس کی عمر میں انہوں نے ریٹائر ہو جانا تھا۔ پھر بھی ایک خوشی تھی کہ ان کے ''میرٹ'' کی بالآخر شناخت ہوئی اور اب کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ کسی حقیقی نااہلی کی بنا پر انہیں نکالا گیا۔ (خدا بہتر جانتا ہے کہ ججز کیس میں قائم کردہ اصول حکومت برقرار بھی رہنے دے گی یا سپریم کورٹ خود ہی اپنے پچھلے فیصلہ کو ''اوور رول'' کر دے گا) اگر چند برس پیشتر ناصرہ کو ٹیکنیکل گراؤنڈ پر فارغ نہ کیا جاتا تو عین ممکن ہے کہ وہ میرٹ اور سنیارٹی کے اعتبار سے پاکستان سپریم کورٹ میں پہلی خاتون جج ہونے کا اعزاز حاصل کرتیں۔ مگر یہ خدا کے منظور یا نامنظور کرنے کی بات نہیں' یہ پاکستان ہے۔ یہاں سپریم کورٹ آج ایک فیصلہ کرتا ہے اور کل خود ہی اس کی بساط الٹ دیتا ہے۔ آج فوجی آمر غاصب قرار پاتا ہے تو کل

فوجی آمر کا غصب اقتدار ''ریاستی ضرورت'' کے تحت جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ میری چیف ججی کے دور میں جب کسی جج کی ریٹائرمنٹ میں پانچ چھ ماہ کی مدت رہ جاتی تھی اور اس کے چیف جج بن سکنے یا سپریم کورٹ میں ''اٹھائے'' جانے کا امکان نہ ہوتا تھا تو وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے لگتا۔ مثلاً ایک آدھ گھنٹہ غیر اہم کام نمٹانے کے بعد اپنے چیمبر میں جا بیٹھتا اور اخباریں پڑھ کر وقت گزار دیتا۔ ایسی کیفیت میں کام چوری اس لیے ہمارا قومی کیریکٹر بن گیا ہوا ہے کیونکہ ذہنیت کے اعتبار سے ہم ابھی تک غلام ہیں۔ نہ ملک کو اپنا سمجھتے ہیں نہ قوم کو۔ صرف اپنے آپ کو اپنا سمجھتے ہیں۔ میں نے ناصرہ سے پوچھا: ''کیا اس قلیل مدت کی ججی کے منصب کو اب آپ بھی ''اینجوائے'' کریں گی؟'' کہنے لگیں: ''نہیں! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے زیادہ تر ''فیملی لاز'' کے کیس بھیجے جاتے ہیں جن میں خصوصی طور پر بچوں کی حضانت کے جھگڑے یا عورتوں کے مسائل سلجھانا ہوتے ہیں۔ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ میں ایسے کیسوں کو التوا کی زنجیر سے لٹکتے چھوڑ کر ججی کے منصب کو ''اینجوائے'' کروں۔'' مجھے ان سے یہی توقع تھی' چنانچہ جب سے جج بنی ہیں' صبح آٹھ بجے گھر سے نکل کر شام کو پانچ بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتیں۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ زندگی بھر میں تم کس انسان سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تو میں بلادریغ کہہ دوں گا کہ ناصرہ' اپنی رفیقہ حیات سے۔ ایک جدید پاکستانی مسلم خاتون کی حیثیت سے وہ میری نگاہ میں ''ماڈل'' ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اوّل' بچپن سے صوم وصلوٰۃ کی پابند (بلکہ مجھ جیسے ''آزاد خیال'' اور گنہگار شخص کو بھی اپنے سانچے میں ڈھال لیا) ماں باپ کی فرمانبردار' شوہر کی خدمت گزار۔ اپنی کفایت شعاری اور سمجھ بوجھ کے ساتھ مالی ''انویسمنٹ'' کے ذریعے خاندان بھر کا معیار زندگی بلند سے بلند تر کرنے میں کامیاب۔ بچوں کی نگہداشت کرنے' انہیں خود اسکول چھوڑنے اور لینے جانے' تکلیف یا بیماری کی کیفیت میں ان کا علاج کروانے' ان کی خاطر راتیں جاگ کر کاٹنے' اعلیٰ تعلیم کے لیے انہیں ملک سے باہر بھجوانے' انہیں اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی ترغیب دینے' ساتھ اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھنے اور باہر کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ سے اعلیٰ اعزازات حاصل کرنے' انسان دوستی اور حقوقِ بشر کے میدانوں میں بین الاقوامی طور پر اپنا سکہ منوانے' نیز اپنے ملک کے غریب وبیکس عوام کی ''عدل واحسان'' کے ذریعہ دادرسی کرنے' خلوص نیت سے زکوٰۃ وخیرات دینے ___ سچی بات ہے' میں نے اپنی زندگی میں ناصرہ جیسی کوئی شخصیت نہیں دیکھی۔ زمین کے ساتھ منسلک ''پریگمیٹک'' خالصتاً عملی اور اس کے ساتھ الٰہیاتی یا آسمانی فرائض کی ادائیگی میں پیش پیش۔ گھر میں مبہم امور یا غیر اہم موضوعات پر غور وفکر کرتے رہنا اور کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکنا میرا پرانا مشغلہ ہے۔ میں ہی اندھیرے میں کسی ایسی شے کو ڈھونڈتا رہتا ہوں جو شاید موجود نہیں۔ مگر ناصرہ کو تو قدرت نے روزِ روشن میں کارِ مسلسل میں مشغول رہنے کی توفیق عطا کر رکھی ہے اور بسا اوقات تو وہ دو دو یا

تین تین کام بیک وقت انجام دے سکنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔

شاید یہ خصوصیات ناصرہ کو اپنی والدہ بیگم سعیدہ وحید سے ورثہ میں ملی ہوں۔ ناصرہ کا خاندان صرف کاروباری ہی نہیں بلکہ علمی اور سیاسی بھی ہے۔ ان کے دادا مولوی فیروزالدین فیروزسنز پرنٹرز اور پبلشرز کے بانی تھے۔ مسلمانوں کا پہلا انگریزی اخبار ''ایسٹرن ٹائمز'' انہوں نے لاہور میں غالباً ۱۹۳۵ء میں شائع کیا تھا۔ والد ڈاکٹر عبدالوحید نے پروفیسری بھی کی اور جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں حقوق انسانی کی کمیشن سے منسلک بھی رہے۔ بھائی خالد وحید معروف فیروزسنز لیبارٹریز کے بانی تھے جسے ان کی وفات کے بعد اب ان کے بیٹے عثمان اور عمر چلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اور بیگم سعیدہ دونوں نے تحریک پاکستان کے دوران نمایاں خدمات انجام دیں جس کی بنا پر تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ کی طرف سے انہیں گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر وحید اور بیگم سعیدہ نے اپنے تمام اثاثے فاطمہ میموریل ہسپتال کی نذر کر دیئے۔ یہ چار سو سے زائد بستروں کا خیراتی ہسپتال دراصل عورتوں اور بچوں کے علاج معالجے کی غرض سے بنا تھا لیکن اب تو وہ جنرل ہسپتال ہے اور اس میں میڈیکل کالج بھی کھول دیا گیا ہے۔ ہسپتال ناصرہ کی دادی کی یاد میں تعمیر کیا گیا جو بچے کی پیدائش کے دوران وفات پا گئی تھیں۔ مگر ہسپتال کی تعمیر بیگم سعیدہ کی نگرانی ہی میں ہوئی۔ انہوں نے ہر مرحلہ پر اس پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی محنت سے کام کیا۔ یہ لاہور میں پہلا خیراتی ہسپتال ہے جو مسلمانوں کے سرمائے سے بنا۔ ۸۳/۸۴ برس کی عمر میں انہوں نے دن رات کام کر کے اسے اس منزل پر پہنچا دیا۔ اب ہسپتال کی دیکھ بھال ناصرہ کی چھوٹی بہن محترمہ شہمہ رحمان کر رہی ہیں۔ بیگم سعیدہ پاکستان میں خاندانی منصوبہ بندی کے ادارے کی بھی خالق ہیں اور اس خدمت کے لیے صدارتی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے شدید بیمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحتِ کلی عطا کرے۔

ناصرہ کے خاندان کی اکثر خواتین انہی کی طرح محنتی اور خدمتِ خلق میں پیش پیش ہیں۔ ان کی خالہ زاد بہن عطیہ مختلف بین الاقوامی اداروں سے منسلک اور وفاقی وزیر رہ چکی ہیں۔ دوسری بہن ثریا انور لاکھوں بے یارومددگار بچوں کے لیے پاکستان ایس او ایس ولیج تنظیم کی بانی ہیں اور صوبائی وزیر بھی رہ چکی ہیں۔ جہاں تک آزاد کشمیر اور راولپنڈی کا تعلق ہے ان علاقوں میں ایس او ایس ولیج تنظیم کی روح رواں میرے دوست آفتاب چودھری کی بیٹی صفیہ اعوان ہیں جنہوں نے اپنے شوہر توقیر سمیت سینیٹ کے لیے اسلام آباد میں میرے قیام کے دوران میری دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اسی طرح ناصرہ کی بھانجی محترمہ سیما عابد عزیز نے نادار بچوں کی تعلیم کی خاطر سکولوں کا ایک سلسلہ کھول رکھا ہے۔ انہیں حال ہی میں لاہور چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز نے پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کے ممبر کے طور پر اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کی شام کو کسی دوست نے فون کر کے کہا کہ ٹی وی لگا کر دیکھئے کیا ہو رہا ہے۔ ہم نے

ٹی وی ''اون'' کیا تو دو ہوائی جہاز نیویارک کے ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کے ٹاوروں سے یکے بعد دیگرے ٹکراتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے سمجھا شاید کوئی فلم چل رہی ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ دہشت گردوں نے امریکہ میں چار ہوائی جہاز ہائی جیک کیے۔ دو نے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاوروں سے ٹکرا کر انہیں تباہ کر دیا۔ تیسرا واشنگٹن میں ''پینٹا گون'' کے دفاتر کی تباہی کا باعث بنا اور چوتھے کو مار گرایا گیا۔ بڑا جانی نقصان ہوا۔ دہشت گردی کی تاریخ میں ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا۔ پیغام یہ دیا گیا تھا کہ امریکہ کی دولت کا ''سنبل'' عالمی تجارتی مرکز اور امریکہ کی عسکری قوت کا ''سنبل'' ''پینٹا گون'' دہشت گردوں کے ٹارگٹ ہیں۔ ردعمل کے طور پر امریکہ کے صدر بش نے یورپی حکومتوں اور برطانیہ کو ساتھ ملا کر دہشت گردی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا بلکہ افغانستان کی طالبان حکومت، جس نے اسامہ بن لادن کو پناہ دے رکھی تھی، کو عالمی دہشت گردی کا حامی وناصر قرار دے کر امریکی افواج نے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ پاکستان پر ''فرنٹ لائن سٹیٹ'' ہونے کی حیثیت سے پریشر ڈالا گیا کہ طالبان کے دہشت گردی میں ملوث ہونے کے مسئلہ پر اپنی پوزیشن واضح کرے۔ یہ مرحلہ جنرل پرویز مشرف کے لیے یقیناً ایک مشکل مرحلہ تھا۔

متمول اور طاقتور امریکی اور یورپی اقوام کے سامنے پاکستان کی پوزیشن کس قدر نازک ہے، ہم سب جانتے ہیں۔ پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیائے اسلام ان کے رحم وکرم پر ہے اور عجیب بات تو یہ ہے کہ سوویٹ یونین کے انہدام کے بعد ناتواں اور کمزور مسلم اقوام کے بارے میں یورپی اور امریکی ''پالیسی میکر'' اپنی تحریروں میں کب سے یہی نقطہ نظر پیش کرتے چلے آرہے تھے کہ مغربی تہذیب کے مستقبل کا عالمگیر دشمن اسلام ہے۔ اسی بنا پر وہ دہشت گردی کو اسلام کے ساتھ منسلک کرتے اور مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ دنیا میں مسلمان ہی ہیں جو ہر طرف مار کھا رہے ہیں اور جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ کشمیر ہو، فلسطین ہو، چیچنیا ہو یا طالبان کا افغانستان۔ سو جب امریکی افواج نے افغانستان پر چڑھائی کی اور پاکستان پر ''پریشر'' ڈالا تو پاکستان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اپنے مسلم افغان بھائیوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر امریکی افواج کا مقابلہ کرتے یا دہشت گردی کے خلاف قائم کردہ امریکنوں کے محاذ میں شریک ہو جاتے۔ حکومت پاکستان نے جنرل پرویز مشرف کی قیادت میں وہی راستہ منتخب کیا جو پاکستان کے ''مفاد'' میں تھا۔ پس طالبان سے متعلق گزشتہ دوستانہ پالیسی کے اصول سے انحراف کرتے ہوئے پاکستان نے اچانک ''اباؤٹ ٹرن'' لی۔ اسی دوران امریکی ہوابازوں نے ''کارپٹ'' بمباری کر کے افغانستان میں بڑی تباہی مچائی اور مذہبی جماعتوں یا علماء حضرات کے شور وغوغے اور احتجاج کے باوجود پاکستانی قوم ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ بلند کر کے خاموشی سے افغانستان میں مسلمانوں پر قیامت گزرتے دیکھتی رہی، حتیٰ کہ طالبان کا خاتمہ ہو گیا۔ پاکستان کو اس

سودے میں کیا ملا؟ اگر جنرل پرویز مشرف کی بجائے یہاں میاں نواز شریف یا بینظیر بھٹو کی حکومت ہوتی تو کیا رویہ اختیار کرتی؟ یہ سب بیکار سوال ہیں۔ بات ختم ہو چکی' سانپ گزر چکا' اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کو پیٹنے سے کیا فائدہ۔

تاریخ مسلماناں جس طرح غصب اقتدار سے مانوس ہے اسی طرح دہشت گردی سے بھی غیر مانوس نہیں۔ ہر قوم کی تاریخ میں اچھے ادوار بھی آتے ہیں اور برے بھی۔ مگر ہم نے کبھی مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے نہیں کیا بلکہ اسے بھی دین اسلام کا حصہ بنا کر مقدس سمجھتے ہیں۔ خلفائے راشدین میں سے تین دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت خصوصی طور پر باقاعدہ منصوبے کے تحت ایک ''خارجی'' دہشت گرد کے ہاتھوں ہوئی۔ تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے دہشت گردوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی بنا پر یہ لوگ ''خوارج'' کہلائے تھے۔ اموی خلفاء کے عہد میں ان کا قلع قمع جاری رہا اور انہیں ختم کرنے میں سو برس سے زیادہ عرصہ لگا۔ بعدازاں دہشت گردوں کا ایک اور ٹولہ ''حشیشین'' نامی وجود میں آیا جنہوں نے عباسیوں کے دور میں دنیائے اسلام کی اہم شخصیات کے قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔ برصغیر کے ابتدائی سلطانی عہد میں قرامطہ اور ملاحدہ دہشت گردوں کو ''ریاستی دہشت گردی'' کی شدت سے ختم کیا گیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ دہشت گردی کسی نہ کسی طرح اسلام ہی کے نام پر ہوتی رہی۔ مثلاً خارجی ''اہل بیت'' اور اہل سنت والجماعت'' کے مقابلے میں اپنے آپ کو ''اہل سنت والعدل'' کہتے تھے اور اپنے نقطہ نگاہ کے مطابق اسلامی عدل کی تحصیل کی خاطر ہر اس مسلمان کو واجب القتل سمجھتے جو ان کا مسلک قبول نہ کرتا تھا۔ بہرحال خارجی دہشت گردی کا دائرہ صرف دنیائے اسلام تک ہی محدود رہا۔ اسی طرح ''حشیشین'' نے کچھ حد تک یورپی ''صلیبی جنگجوؤں'' کو فلسطین میں تنگ کیا' مگر ان کی تلواروں کا ہدف بھی زیادہ تر مسلم زعماء ہی بنے۔

پاکستان بھی جب سے وجود میں آیا ہے' دہشت گردی سے محفوظ نہیں رہا۔ پہلا وزیراعظم قتل ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ ''کراس بارڈر'' دہشت گردی کا سلسلہ شروع ہوا۔ دہشت گردوں نے طیارے اغوا کیے۔ ایرانی اور افغانی انقلابات کے بعد پاکستان میں مذہبی بنیادوں پر عسکری ٹولے ''سپاہ صحابہ'' اور ''جیش محمد'' وغیرہ وجود میں آئے اور فرقہ وارانہ دہشت گردی کا بازار گرم ہوا۔ اقوام متحدہ میں عالمگیر دہشت گردی کے خاتمہ کے بارے میں جو بھی قراردادیں منظور کی گئیں' پاکستان ان میں شریک تھا۔ البتہ اقوام متحدہ آج تک ''دہشت گردی'' کی کسی ایسی تعریف کا تعین نہیں کر سکی جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔ امریکہ اور یورپی اقوام کے نزدیک ہر قسم کی دہشت گردی کا قلع قمع ہونا چاہیے۔ مگر پاکستان سمیت مسلم ممالک کا اصرار ہے کہ ''قومی آزادی کے لیے جدوجہد'' کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہ ہے بلکہ ایسی جدوجہد کو ''ریاستی

دہشت گردی'' سے دبانا قابل مذمت قرار دیا جانا چاہیے۔ بہر حال جب امریکہ اور اس کے یورپی حلیفوں کی طرف سے پاکستان پر ''القاعدہ'' اور ''طالبان'' کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو پاکستان اپنی طرف سے اقوام متحدہ کے مینڈیٹ کے تحت اس جنگ میں شریک ہوا۔ مگر ساتھ ہی جنرل پرویز مشرف نے چپ چاپ دہشت گردی کی مغربی تعریف (یعنی دہشت گردی اور قومی آزادی کے لیے جدوجہد میں امتیاز برقرار نہ رکھنا) قبول کر لی جس کے سبب تحریک آزادیٔ کشمیر متاثر ہوئی اور بھارت کی فوجیں ہماری سرحدوں پر آ کھڑی ہوئیں۔

یہ کہہ سکنا مشکل ہے کہ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ کب تک جاری رہے گی۔ اس کا خاتمہ تو تبھی ممکن ہے جب دہشت گردی کے اسباب ختم کیے جائیں۔ اگرچہ امریکہ اور اس کے یورپی حامی کہتے یہی ہیں کہ ان کا نشانہ اسلام نہیں بلکہ دہشت گرد ہیں' مگر درحقیقت ان کے اور ان کے یہودی یا ہندو حواریوں کے ہاتھوں ہر طرف مسلمان ہی مر رہے ہیں۔ پس دہشت گردی کے خلاف عالمگیر جنگ دراصل مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے۔ اس جنگ میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت امریکہ کے ساتھ ہے' مگر پاکستان کے عوام میں امریکہ کے خلاف نفرت کا جذبہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔

مشکل تو یہ ہے کہ سوویٹ روس کی تحلیل کے بعد دنیا میں صرف امریکہ ہی ایک ''سوپر پاور'' رہ گئی ہے جو ''عالمگیریت'' (یا گلوبلائزیشن) کے سائے میں یورپی یونین اور برطانیہ کو ساتھ ملا کر چین' روس یا کسی بھی ملک کو اتنا طاقتور بن سکنے کا موقع نہ دے گی کہ دنیا میں قوت کا توازن از سر نو برقرار ہو سکے۔ اس اعتبار سے ''عالمگیریت'' ''تیسری دنیا'' بالخصوص مسلم ممالک یا منقسم اور رو بہ تنزل مسلم امہ کے لیے ایک نئے قسم کے امپریلزم یا استحصال کے دور کے آغاز کی راہ ہموار کرے گی۔ اس نئے ''عالمی نظام'' (ورلڈ آرڈر) میں واحد مسلم ملک پاکستان کی ''نیوکلیئر'' اہلیت پر کڑی نظر رکھی جائے گی' بلکہ ممکن ہو سکا تو اس کی ایٹمی تنصیبات کو بھارت جیسے کسی دشمن کے ذریعہ تباہ بھی کرایا جا سکتا ہے یا کسی نہ کسی بہانے اسے اپنی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔ نیز ایران' عراق یا کسی بھی مسلم ملک کو ''نیوکلیئر'' اہلیت حاصل کر سکنے سے باز رکھا جائے گا۔

امریکہ نے اپنی ترقی کے تسلسل اور عسکری قوت کی برتری کو برقرار رکھنے کی خاطر ہمیشہ کسی نہ کسی خوفناک غنیم یا کسی عظیم خطرہ کا تعین کیا ہے۔ موجودہ ''سیناریو'' میں اس کے نزدیک وہ دشمن عالمگیر ''مسلم'' دہشت گردی ہے جو ''نیوکلیئر'' یا ''کیمیکل'' ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک بے چہرہ خودکش مدمقابل کی صورت میں اس کے نافذ کردہ نئے عالمی نظام کو تہہ و بالا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ لہٰذا بقول امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اسلام کے خلاف جنگ نہیں' مگر ہر مسلمان کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنا کہ کہیں دہشت گرد تو نہیں' اس کا معمول بن چکا ہے بلکہ پاکستان جیسی ''لبرل'' مسلم حکومتیں جو امریکہ کے ساتھ اس

جنگ میں شریک ہیں' ان کے بارے میں بھی مغربی میڈیا اسی نقطہ نظر کی تشہیر کرتا رہتا ہے کہ کمزور ہیں' انہیں عوامی تائید حاصل نہیں اور ''مسلم انتہا پسند'' جب چاہیں ان پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

اس قسم کا ایک تجربہ مجھے بھی ہوا۔ علامہ اقبال کے یوم ولادت کے ضمن میں ۹ نومبر ۲۰۰۱ء کو مجھے علامہ اقبال کے فلسفہ پر لیکچر دینے کے لیے اور ناصرہ کو پاکستان میں مسلم خواتین کے بارے میں بات چیت کرنے کی خاطر بارسیلونا یونیورسٹی (سپین) میں مدعو کیا گیا۔ اس غرض کے لیے میرا یورپ جانے کا ارادہ تو نہ تھا مگر ہمارے چھوٹے بیٹے ولید کی فرمائش اور وہاں کی پاکستانی نژاد آبادی کے اصرار پر ہم دونوں بارسیلونا جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ولید ہمیں سیدہ نوریہ سے ملوانا چاہتے تھے جن سے وہ شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ ہم لندن سے ہوتے ہوئے بارسیلونا پہنچے۔ ایئرپورٹ پر یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ کی پاکستانی خاتون پروفیسر ڈاکٹر فرزانہ قنبر اور دیگر پاکستانی احباب نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم دونوں بارسیلونا کی میونسپل حکومت کے مہمان تھے۔ ہمیں بارسیلونا کے مضافات میں ایک خوبصورت ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ دو ایک روز بعد ولید اور نوریہ بھی پہنچ گئے۔ ہم نے ان کی خاطر اسی ہوٹل میں دو کمرے پہنچتے ہی بک کروا رکھے تھے۔

یونیورسٹی ہال میں علامہ اقبال کے فلسفہ پر میرا لیکچر بارسیلونا کی خاتون ڈپٹی میئر کی صدارت میں ہوا۔ شعبہ فلسفہ کے سربراہ اور پروفیسر فرزانہ قنبر بھی وہاں موجود تھے۔ اسی طرح ناصرہ کا پاکستانی خواتین کے موضوع پر خطاب بھی بارسیلونا کی خاتون وزیر کی زیر صدارت ہوا۔ خاتون وزیر نے اپنی اختتامی تقریر میں اعتراف کیا کہ ابھی تک سپین میں جج کے عہدہ پر کسی خاتون کا تقرر نہیں ہوا' اگرچہ زندگی کے دیگر شعبہ جات میں خواتین کی خاطر خواہ نمائندگی ہے۔

بارسیلونا کے لوگ اپنے آپ کو ہسپانوی نہیں سمجھتے بلکہ نسلی اور لسانی اعتبار سے ''کیٹالان'' ہیں اور ہسپانویوں سے اپنے اس امتیاز پر فخر کرتے ہیں۔ یہاں پر خصوصی طور پر دیکھنے کی اشیاء چند عمارتیں ہیں جو معروف کیٹالانی ماہر تعمیرات گاؤدی نے ڈیزائن کیں۔ ان میں کلیسا' بچوں کا پارک اور چند فلیٹ ہیں جن کے ذریعہ گاؤدی نے یہ پیغام دیا ہے کہ بے ترتیبی یا بدصورتی میں بھی آہنگ یا حسن موجود ہے۔ بارسیلونا کا کلیسا تو ایک مہیب اور بلند و بالا جھاڑی کی شکل میں ہے جسے دیکھ کر استعجاب اور دہشت کے جذبات طاری ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کی زیادہ تر آبادی اپنے سوشلسٹ خیالات کی بنا پر ٹریڈ یونینوں سے منسلک ہے اور لوگ متکبر امریکنوں سے نفرت کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود ہسپانوی میڈیا بحیثیت مجموعی اسلام یا مسلمانوں سے متعلق جو ابلاغ کی غذا پیش کرتا ہے وہ ناموافق اور حقیقت سے دوران فریضوں پر مبنی ہے جو میڈیا عوام کو فراہم کرنا چاہتا ہے۔ بارسیلونا کے اہم روزناموں اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں نے مجھ سے طویل انٹرویو کیے۔ ان سب کا یہی زاویہ تھا کہ پاکستان ایک غیر مستحکم مسلم ملک ہے۔ عسکری آمر جنرل

پرویز مشرف یا فوج کے سوا باقی ساری کی ساری آبادی انتہا پسند متشدد قسم کے مسلمانوں یا ''طالبان'' کے حامیوں پر مشتمل ہے اور وہ بالآخر جنرل پرویز مشرف کی حکومت کا خاتمہ کر کے پاکستان کی نیوکلیئر تنصیبات پر قبضہ جما لیں گے۔ یوں مستقبل میں پاکستان ہی دہشت گردوں کو نیوکلیئر ہتھیاروں سے لیس کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ مگر میرے اصرار کے باوجود کہ ایسی صورت نہیں ہے بلکہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت میانہ روی کی قائل ہے اور انہوں نے کبھی بھی انتہا پسندی قبول نہیں کی' نہ کریں گے اور یہ کہ اگر پاکستان غیر مستحکم ملک ہوتا تو جنرل پرویز مشرف یورپ اور امریکہ کے دورے پر نہ نکلتے۔ (ان ایام میں جنرل پرویز مشرف یورپ اور امریکہ کا دورہ کر رہے تھے اور پاکستان میں ۹ نومبر ۲۰۰۱ء یعنی علامہ اقبال کے یوم ولادت کے دن مذہبی جماعتوں نے ''طالبان'' کے حق میں حکومت کی امریکہ نواز پالیسی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالے جو ناکام رہے) مگر ہسپانوی میڈیا نے میرے بیانات کو خاص اہمیت نہ دی بلکہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کے خدشات درست ہیں اور میرا انداز تکلم محض مدافعانہ ہے۔ پس ظاہر ہے ہماری بات کوئی نہیں مانتا۔ اسلام یا مسلمانوں کے خلاف جو مفروضے یورپی اور امریکی میڈیا قائم کر بیٹھا ہے اسی پر مبنی ''غذا'' وہ اپنے خواص و عوام کو فراہم کرتا ہے ؎

ہوائیں ان کی' فضائیں ان کی' سمندر ان کے' جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ!

مگر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان میں لاء اینڈ آرڈر کی ابتر حالت کے سبب ہم خود بھی مغربی میڈیا کو ایسا سوچنے کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں۔

دسمبر ۲۰۰۱ء میں ولید اور نوریہ چند یوم کے لیے لندن سے لاہور آئے اور انہوں نے اپنی منگنی کا اعلان کیا۔ ۱۶ فروری ۲۰۰۲ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں ان دونوں کا نکاح پڑھوایا گیا' نیز ۲۰ اپریل کو کراچی میں رخصتی اور ۲۴ اپریل کو لاہور میں ولیمہ کی رسوم کے بعد وہ جزائر مالدیپ میں ہنی مون منانے چلے گئے۔ ایک بیٹے کی شادی خانہ آبادی کی ذمہ داری سے فراغت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے بھرپور رکھے۔ سارا انتظام تو ناصرہ ہی نے کیا اور میں نے انگلی تک نہیں ہلائی۔ پھر بھی جو کچھ مجھے کرنا پڑا بڑی بدحواسی کے عالم میں کیا۔ مثلاً میں نے اپنے پرانے دوست منور حسین بخاری مرحوم کی بیگم صاحبہ اور بیٹے ڈاکٹر شمشاد کو دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے کارڈ دینے جانا تھا۔ ملازم نے بتایا کہ فون آیا ہے' بیگم بخاری فوت ہوگئی ہیں اور دس بجے صبح جنازہ ہے۔ میں سمجھا کہ میرے دوست کی اہلیہ وفات پاگئیں۔ بھاگم بھاگ ڈاکٹر شمشاد کے کلینک پہنچا۔ وہ وہاں موجود نہ تھے۔ ان کے سیکرٹری اور ملازموں سے پوچھ گچھ کرتا رہا کہ بیگم بخاری کا جنازہ کہاں سے اٹھنا ہے؟ جواب ملا کہ گھنٹہ بھر پہلے تک تو وہ بفضل خدا بخیر و عافیت تھیں۔

فوت کب ہوئیں؟ عجیب وغریب صورت پیدا ہوئی۔ مجھے دعوت ولیمہ پر ڈاکٹر شمشاد کے روبرو شرمندہ ہونا پڑا۔ یہ مسز بخاری تو کوئی اور ہی خاتون تھیں جنہیں میں اپنے دوست کی اہلیہ سمجھ بیٹھا۔ اور ٹیلی فون بھی میرے لیے نہ تھا بلکہ ناصرہ کے لیے تھا۔ یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث ہے کہ ڈاکٹر شمشاد ایک ہونہار نوجوان ہے اور اپنے مرحوم والد کا نام روشن کر رہا ہے۔ بہرحال اس تجربے کی ''ٹینشن'' نے ایسا نڈھال کیا گویا مجھے لمبے ہوائی سفر کی بنا پر ''جٹ لیگ'' لاحق ہو گیا ہے۔ کئی دنوں کے بعد ہوش و حواس اپنے معمول کے مطابق بحال ہوئے۔

۲۰۰۲ء کے ابتدائی حصے میں مجھے نیشنل کشمیر کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ اس کمیٹی کے سربراہ سردار عبدالقیوم خان تھے۔ میں اس کمیٹی کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک نہیں ہوتا رہا کیونکہ مجھ پر یہ واضح نہیں تھا کہ ہم نے کرنا کیا ہے۔ اسی طرح حکومتی الیکٹرانک میڈیا کے مشاورتی بورڈ کا ممبر بھی بنا دیا گیا۔ میں اپنی گزشتہ زندگی میں ایسی کئی کمیٹیوں اور بورڈوں کا رکن رہ چکا ہوں۔ بین الاقوامی اقبال کانگرس کمیٹی کا رکن، محکمہ آثار قدیمہ کے مشاورتی بورڈ کا رکن، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے سنڈیکیٹ کا رکن، صدارتی اقبال ایوارڈ کمیٹی کا رکن، ایوان اقبال کی تعمیر کے لیے مشاورتی کمیٹی کا رکن، اقوام متحدہ کے تحت انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے ججوں کی نامزدگی کے لیے نیشنل گروپ کا رکن، کارڈف جنوبی ویلز یو کے کے وکلاء کنونشن کا رکن، گورنمنٹ کالج لاہور کے بورڈ آف گورنرز کا رکن وغیرہ۔ مگر میرا تجربہ یہی رہا ہے کہ ایسی کمیٹیوں اور بورڈوں کے اخراجات حکومت کو اٹھانا پڑتے ہیں مگر اس کے مقابلے میں کارگزاری صفر ہوتی ہے۔

اپریل ۲۰۰۲ء میں مجید نظامی کا یوم ولادت منانے کا اہتمام کیا گیا۔ میں مجید نظامی کو ۱۹۵۵ء سے جانتا ہوں جب وہ لندن میں ''نوائے وقت'' کے نمائندے کی حیثیت سے مقیم تھے۔ میں ۱۹۵۶ء کے اواخر میں لاہور واپس آ گیا۔ مگر مجید ۱۹۶۲ء میں لاہور پہنچے جب ان کے عظیم بھائی حمید نظامی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ حمید نظامی کی وفات کے بعد مجید نے ''نوائے وقت'' کے ادارتی اور انتظامی امور کو سنبھالا۔ اور ایوب خان کے مارشل لاء کی نہ صرف کٹھن برداشت کی بلکہ ''نوائے وقت'' اخبار کو بھی حکومتی ''ٹیک اوور'' کیے جانے سے محفوظ رکھا۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخابات میں اپوزیشن کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیتے وقت میری طرح مجید نظامی اور ''نوائے وقت'' کی ہمدردیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ بعد کی بدلتی ہوئی سیاسی صورت حالات میں بھی وہ، میں اور آغا شورش کاشمیری مرحوم ساتھ ساتھ رہے۔ علاوہ اس کے مرکزی مجلس اقبال کی اکثر میٹنگیں انہی کے گھر ہوا کرتیں۔ ایوان اقبال کی گورننگ باڈی ہو، کارکنان تحریک پاکستان ٹرسٹ کی نشستیں ہوں یا ادارہ نظریۂ پاکستان، ہم کبھی ایک

دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ میں نے ان کے اکھڑپن کے باوجود انہیں نہایت مخلص مسلمان، محب وطن پاکستانی، قائد اور اقبال کا شیدائی اور پاکستان کی نظریاتی اساس کا ثابت قدمی سے تحفظ کرنے والی ہستی پایا ہے۔ ان کے اسی مزاج کی جھلک ''نوائے وقت'' میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے مداح اور پرستار جمخانہ کلب میں چائے پارٹی پر اکٹھے ہوئے۔ انہیں بے شمار گلدستے پیش کیے گئے اور چند تقاریر بھی ہوئیں۔ میں نے اپنی تقریر کے دوران کہہ دیا کہ مجید نظامی ''کنزروٹو'' (رجعت پسندانہ) قسم کے خیالات رکھتے ہیں اور میں مزاجاً ''لبرل ازم'' (وسیع النظری) کا حامی ہوں۔ مگر درحقیقت ہم دونوں اندر سے ایک ہی ہیں۔ آخر میں جب مجید نظامی کی باری آئی تو اپنے خطاب میں فرمایا ''نہ میں ''کنزروٹو'' ہوں نہ جاوید اقبال ''لبرل'' ہیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ جاوید اقبال کو علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر بڑا غصہ ہے۔ نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی خاطر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔''

میں جانتا ہوں مجید نظامی جن کو اپنے بہت قریب سمجھتے ہیں ان سے ان کے گلے شکوے جاری رہتے ہیں۔ میں نے ان کی باتوں کا کبھی برا نہیں منایا۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ کیا میرے سب احباب واقعی میرے متعلق ایسے ہی خیالات رکھتے ہیں؟ مجھے علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے یا ان کا فرزند ہونے پر غصہ نہیں، البتہ علامہ اقبال کے ان پرستاروں پر غصہ ضرور آتا ہے جو ان کے افکار کی نفی کرتے ہوئے مجھے صرف ''فرزند اقبال'' کی حیثیت سے جاننا چاہتے ہیں اور اس ''فریم'' سے میرا باہر نکلنا انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ میں جب کبھی ملک سے باہر لیکچروں کے لیے بلوایا جاتا ہوں تو میری شناخت ''جاوید اقبال'' کے طور پر ہوتی ہے، مگر میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک کے اندر میری حیثیت ''فرزند اقبال'' کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے، جب ۱۹۷۷ء میں وفاقی حکومت نے ہمارے گھر ''جاوید منزل'' کو ''اقبال میوزیم'' بنانے کی خاطر خرید لیا تو میرے دو معصوم بچوں نے مجھ سے سوال کیا کہ ابو اب ہمارا کیا بنے گا؟ میں نے انہیں کہا کہ تم دونوں کو علیحدہ علیحدہ بوتلوں میں بند کر کے یہاں سجا دیا جائے گا۔ کہنے لگے ''اور آپ کہاں جائیں گے؟'' میں نے جواب دیا ''بیٹا میں تو پہلے ہی بوتل میں بند ہوں۔''

شاید مجید نظامی کو اس بات کا گلہ ہو کہ میں مخصوص قومی تقاریب کے سلسلہ میں مزار اقبال پر جانے سے گریز کرتا ہوں۔ یہ بات درست ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں ''سجادہ'' اور ''عمامہ'' کو ''رہزن'' قرار دیا ہے۔ میں مزار اقبال سے اپنی وابستگی ظاہر کر کے کسی کو بھی یہ تاثر دینا نہیں چاہتا کہ میں اپنے آپ کو ''سجادہ نشین'' سمجھتا ہوں۔ میری قوم پہلے ہی بڑی توہم پرست ہے۔ ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ علامہ اقبال کے کسی ''مرید'' کا بیٹا بیمار ہوا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ وہ مزار اقبال پر آئے۔ تربت پر جھاڑو پھیرا اور خاک لے جا کر فرزند کو چٹاتے رہے، حتیٰ کہ وہ روبصحت ہو گیا۔ مولانا

جلال الدین رومی کے فرزند سلطان ولد جلبی نے ان کی وفات کے بعد انہی کے نام پر تصوف کے ''مولوی'' سلسلہ کی بنیاد رکھی جو بعدازاں ترکی کے رقاص درویشوں کے سلسلہ کے طور پر مشہور ہوا۔ میں بھی اگر سلطان ولد کی طرح ہوتا تو علامہ اقبال کے مزار پر جا بیٹھتا اور انہیں اپنے وقت کا ایک عظیم متصوف ظاہر کر کے ان کے نام پر ''اقبالی'' سلسلہ فقر کی بنیاد رکھ دیتا۔ مگر ایسی بات نہیں ہے۔ علامہ اقبال ایک جدید مسلم شاعر و مفکر تھے جو پیری مریدی کی روایت کو مسلمانوں کے تمدنی زوال کا سبب گردانتے ہوئے اس سے متنفر تھے۔ پس علامہ اقبال کے گھر ایک فرزند کے طور پر پیدا ہونا میرے غصہ کا باعث نہیں بلکہ یہ تو محض ایک ''بائیولاجیکل'' حقیقت یا اتفاق ہے۔ میری اپنی نگاہ میں یہ پوزیشن میرے لیے قابل فخر بھی ہو سکتی ہے جب مجھ میں بجائے خود اپنا کوئی مقام پیدا کر سکنے کی صلاحیت ہو ورنہ پدرم سلطان بود کہہ کر اترانا تو اپنے آپ کو اپنی نظروں میں بے آبرو کرنا ہے۔ بقول غالب ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اب رہ گئی بات علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کی' یہ تو کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہونی چاہیے۔ یہی ترغیب تو ہمیں علامہ اقبال دیتے ہیں۔ کسی صاحب فکر سے آگے بڑھ جانے سے مراد اس کی تحقیر کرنا نہیں بلکہ اس کی توقیر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے رستہ سے نئی راہیں تلاش کرنا دراصل فکری تسلسل کو آگے بڑھانا ہے۔ مثلاً سرسید نے فرمایا تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں' ہندو اور مسلمان' وہ فکر مند تھے کہ ان دونوں کے درمیان اقتدار کا مسئلہ کیسے سلجھایا جا سکے گا۔ علامہ اقبال نے ان سے آگے قدم بڑھاتے ہوئے مطالبہ کیا اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ جن خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں انہیں خود ارادیت کا حق دیا جائے۔ اسی طرح سید جمال الدین افغانی نے فرمایا کہ مسلم امہ کا اتحاد برقرار رکھنے کی خاطر عثمانی خلیفہ اپنے اختیارات کو دستور کی حدود کے اندر رہ کر استعمال کریں۔ مگر جب خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور دنیائے اسلام قومی ریاستوں میں بٹ گئی تو علامہ اقبال نے سید جمال الدین افغانی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا کہ خلیفہ کے تمام اختیارات اب ہر مسلم قومی ریاست کی منتخب اسمبلیوں کو سونپ دیئے جانے چاہئیں۔ جب تک کہ ہر مسلم قومی ریاست اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑی نہیں ہو جاتی۔ جب ایسا ہو جائے گا تو یہ مسلم قومی ریاستیں ثقافتی اور مذہبی ہم آہنگی کی بنیادوں پر جمہوریتوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح متحد ہو سکتی ہیں۔ علامہ اقبال سرسید اور سید جمال الدین افغانی کا بڑا احترام کرتے تھے' مگر وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ان کے بتائے ہوئے رستوں سے نئی راہیں نکالیں اور یوں مسلمانوں کی ملی زندگی کی نشاۃِ ثانیہ سے متعلق فکری تسلسل کو جاری رکھا۔ علامہ اقبال سے آگے بڑھنے کی سعی

کو روکنے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم فکر اقبال کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور ان کے بعد کسی بھی صورت میں فکری تسلسل کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سوچ علامہ اقبال کی تعلیمات کے برعکس ہے اور اس پر صرف ان کے نادان مریدوں کا ہی اتفاق ہوسکتا ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں نے اپنی ذاتی کاوش کے ذریعے افکار اقبال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میری اقبال شناسی دیگر اقبال شناسوں کی طرح کسبی ہے۔ مجھے علامہ اقبال نے اپنی تعلیمات کے متعلق کبھی کچھ ارشاد نہیں فرمایا' کیونکہ تب میں بہت چھوٹی عمر کا تھا۔ اس کے باوجود گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں مرکزیہ مجلس اقبال کے رکن کی حیثیت سے میں ہر سال یوم اقبال کے موقع پر تقریریں کرتا رہا ہوں۔ کئی برس تک یہ خطبات تحریر کرکے مجمع کے سامنے پڑھے گئے۔ یہ مقالات پاکستان کی سیاسی' ثقافتی اور معاشی تاریخ پر ایک طرح کا اقبالی تبصرہ ہوا کرتے تھے۔ چونکہ میں انہیں اپنے سیاسی اور ثقافتی ماحول کے ردعمل کے طور پر تحریر کرتا تھا' اس لیے وہ میرے فکری کرب کی عکاسی کرتے تھے۔ شاید اسی سبب ان کی زبان میرے دل کی زبان ہوتی تھی۔ ان زمانوں میں یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کے اجلاس ہوتے تھے۔ بڑی بڑی اہم ہستیاں اس تقریب میں سامعین کے طور پر شریک ہوتیں' صدارت کا اعزاز حاصل کرتیں یا تقاریر کے لیے مدعو کی جاتیں۔ راجہ حسن اختر' خواجہ عبدالرحیم اور میاں امیر الدین جیسی ہستیوں نے مرکزیہ مجلس اقبال کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ آغا شورش کاشمیری اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دیا کرتے۔ میں اور مجید نظامی ان زمانوں سے دو قالب ایک جان ہیں۔ ہر سال یوم اقبال منانے کے علاوہ مرکزیہ مجلس اقبال نے علامہ اقبال کی شخصیت اور افکار کی تشہیر کے سلسلہ مین مزید کئی اہم خدمات انجام دیں۔ اسی مجلس کی کوششوں سے مزار اقبال کی تکمیل ہوئی۔ وفاقی حکومت نے اقبال اکادمی قائم کرکے قوم کو پاکستان کی تمدنی بقا کے لیے فکر اقبال کی اہمیت کا احساس دلایا۔ علامہ اقبال کی یاد میں لاہور میں ایوان اقبال کی عالیشان عمارت تعمیر کی گئی۔ مگر افسوس ہے کہ یوم اقبال جیسی قومی' فکری اور علمی تقریب کا ماحول رفتہ رفتہ خراب سے خراب تر ہوتا چلا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ صدارت کے لیے کوئی موزوں اور غیر متنازعہ ہستی نہ ملتی تھی' تقاریر کی خاطر مناسب مقرر دستیاب نہ ہوتے تھے اور سامعین کا یہ حال کہ یہ قومی تقریب سیاسی رقابت اور ہلڑبازی کی نذر ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ مذہبی اسکالر یا سیاستدان حضرات مقررین کی حیثیت سے آئے اور اپنے حامیوں کی بڑی تعداد ساتھ لائے۔ سب سے پہلے تقریر کرنے پر اصرار کیا اور تقریر ختم ہو چکنے کے بعد جب تشریف لے جانے لگے تو ساتھ ہی ان کے حامی بھی رخصت ہو گئے اور یوں سامعین سے بھرا ہال آدھا رہ گیا۔ سو میری دانست میں اب وقت آ گیا ہے کہ مرکزیہ مجلس اقبال کی تشکیل نو کی جائے' جواں قیادت اسے سنبھالے اور نئے ایجنڈے کے تحت یوم اقبال کی تقریب منانے کا بندوبست کیا کرے۔

اپریل ۲۰۰۲ء ہی میں جنرل پرویز مشرف نے اپنی صدارت کو پانچ سال کی مدت تک بڑھانے کی خاطر ملک بھر میں ریفرنڈم کا اہتمام کیا۔ ایسے ریفرنڈم پہلے بھی پاکستان کے عسکری حاکم کراتے رہے ہیں اور ان کا جواب ہمیشہ "ہاں" ہی میں آتا رہا ہے۔ موجودہ ریفرنڈم بمطابق معمول "معلق" دستور سے باہر "پی سی او" (وقتی دستوری حکم) کے تحت کرایا گیا اور جواب "ہاں" میں آنے پر جنرل پرویز مشرف نے پانچ برس کی مدت تک پاکستان کی صدارت سنبھال لی۔

چند ماہ بعد جنرل مشرف کی طرف سے جو سب سے اہم دستاویز قوم کے سامنے رکھی گئی وہ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ہونے والے عام انتخابات سے پیشتر آئین میں ترامیم کا پیکیج تھا۔ اہم ترامیم تو چند تھیں، مثلاً: وزیراعظم کے مقابلے میں صدر کے اختیارات میں اضافہ۔ آرٹیکل (58) 2 (بی) کی آئین میں بحالی۔ اور آئین کے تحت ایک نئے ادارے نیشنل سکیورٹی کونسل کا قیام۔ اس پیکیج پر بحث مباحثہ کرنے کی خاطر جنرل مشرف نے کئی قسم کے لوگوں کو مدعو کیا۔ اسی طرح کی ایک مجلس میں میں بھی شریک ہوا اور مجھ جیسی اور شخصیتوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا، میں نے بھی اپنا تبصرہ اپنے ضمیر کے مطابق پیش کر دیا۔

(۱) وزیراعظم کے مقابلے میں صدر کے اختیارات میں اضافے پر میرا موقف یہ تھا کہ جنرل مشرف کو آئین میں ترمیم کا جو اختیار سپریم کورٹ نے دے رکھا ہے وہ مشروط ہے۔ یعنی وہ ایسی کوئی ترمیم نہیں کر سکتے جس سے آئین کے بنیادی "سٹرکچر" کو زک پہنچے۔ مثلاً پارلیمانی وفاقی جمہوری نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے وزیراعظم کے اختیارات میں کمی کر کے انہیں صدر کے ہاتھ میں دینے سے ایسی "سٹرکچرل" تبدیلی آئین میں کر دی گئی ہے جو سپریم کورٹ کے "مینڈیٹ" سے تجاوز ہے۔ پارلیمانی وفاقی جمہوری نظام میں جو اصول کارفرما ہے یہی ہے کہ اس میں تمام اختیارات منتخب وزیراعظم یا "لیڈر آف دی ہاؤس" کے پاس ہوتے ہیں اور صدر صرف وفاق کی ہم آہنگی اور یک جہتی کی علامت ہوتا ہے۔ اس لیے آئین میں وہی نظام برقرار رکھا جائے جو قائداعظم نے ہمارے لیے چن رکھا تھا۔ میں نے جنرل صاحب سے یہ بھی کہا کہ آئین کی بحالی کے تحت جب سپریم کورٹ کے جج صاحبان حلف لیں گے تو ان کا زاویۂ نگاہ بدل جائے گا۔

(۲) آرٹیکل (58) 2 (بی) کے بارے میں میں نے کہا کہ گزشتہ منتخب اسمبلی نے متفقہ طور پر اس آرٹیکل کو آئین سے خارج کیا اور صحیح معنوں میں پارلیمانی وفاقی جمہوری نظام بحال کر دیا۔ چونکہ قوم کے منتخب نمائندوں نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا ہے اس لیے یہ فیصلہ ایک طرح کا "اجماعِ امت" ہے۔ اور ایک "اجماعی فیصلہ" کو دوسرا "اجماع" ہی تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک آمر ایسا کر سکنے کا مجاز نہیں۔

(۳) میری متبادل تجویز یہ تھی کہ اگر آرٹیکل (58) 2 (بی) کو آئین میں رکھنا ضروری ہے تو پھر

اس میں اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ اگر سپریم کورٹ اس نتیجہ پر پہنچے کہ صدر نے یہ اختیار غیر قانونی طور پر استعمال کیا ہے تو وہ پندرہ یوم کے اندر اپنا استعفیٰ وزیر اعظم کو پیش کر دے تا کہ آئین کے تحت نیا صدر منتخب کیا جا سکے۔

(۴) اگر یہ صورت بھی نا قابل قبول ہے تو آرٹیکل (58)2(بی) کو آئین میں رکھنے کی مدت کا تعین (مثلاً تین سال یا پانچ سال) کر دیا جائے جس کے بعد وہ آئین سے خارج تصور ہو۔

(۵) نیشنل سکیورٹی کونسل کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ اسے کوئی سیاسی کردار نہ دیا جائے۔ وہ وزیر اعظم کی صدارت میں ایک مشاورتی ادارے کے طور پر قائم کی جائے اور ان چار اہم امور پر وزیر اعظم کو مشورہ دے: جنگ و امن' لاء اینڈ آرڈر' اقتصادی پالیسی اور فارن پالیسی۔ جنرل مشرف کا خیال تھا کہ عسکری سربراہوں کو اس کونسل میں ممبران کے طور پر رکھنے سے فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے یا "کو" کرنے سے روکا جا سکے گا اور کوئی بھی کمانڈر ان چیف مارشل لاء نہ لگا سکے گا۔ یعنی ان کے نزدیک فوج کو اقتدار سے باہر رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ انہیں اقتدار کے اندر جگہ دے دی جائے۔ بہر حال میری کوئی بھی تجویز قبول نہ کی گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان ترامیم کا مستقبل کی پارلیمنٹوں میں کیا حشر ہو گا۔

اگست ۲۰۰۲ء میں میں اور ناصرہ عمان (اردن) گئے۔ دراصل شاہ حسین کے بعد شاہ عبداللہ دوم نے آل البیت اکاڈمی کا اجلاس طلب کیا تھا۔ اس کانفرنس میں بحث کے موضوعات تھے: دنیائے اسلام پر سیکولرازم کے فروغ کا اثر۔ تہذیبوں کا ٹکراؤ۔ مسلم ممالک کا مستقبل اور ذرائع ابلاغ کی نئی ٹیکنالوجی اور دنیائے اسلام۔ میرا مقالہ تہذیبوں کے ٹکراؤ کے بارے میں تھا۔ اس کانفرنس میں مجھے خصوصی طور پر عرب اسکالروں میں ایک نیا رجحان نظر آیا۔ مثلاً ان موضوعات پر جو بھی مقالات انہوں نے پڑھے ان میں زیادہ تذکرہ خدا اور آخرت کا تھا۔ مگر اس دنیا کو بہتر بنانے کے لیے کوئی منصوبہ پیش نہ کیا گیا۔ میری نگاہ میں عرب دنیا کو آج ایک عجیب وغریب قسم کے مایوسی کے عالم نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ افسوس کا مقام تھا کہ کانفرنس کے ہال سے چند میل دور' دریائے اردن کے اس پار فلسطینیوں پر ہر روز اسرائیل قیامت ڈھا رہا تھا مگر کانفرنس میں کسی نے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔

شاہ عبداللہ دوم نے مندوبین کو اپنے محل میں پر تکلف کھانے پر مدعو کیا۔ اسی طرح پرنس الحسن بن طلال نے بھی ہماری دعوت کی۔ پرنس حسن نے اس موقع پر اپنی تقریر عربی میں شروع کی مگر میری عزت افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ چونکہ یہاں میرے عزیز دوست جاوید موجود ہیں' اس لیے انگریزی میں بات کروں گا۔ آپ کی تقریر کا موضوع "دہشت گردی' مغرب اور عالم اسلام" تھا۔ اور ماحصل یہ تھا کہ اسلام دراصل ایک "پلورل اسٹک معاشرہ" (مختلف مذاہب پر مشتمل رواداری کی بنیاد پر استوار انسانی معاشرہ)

وجود میں لانے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنے نظریات کی بنا پر وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ بعد میں مجھے خصوصی طور پر کہا کہ حال ہی میں لاہور کی ایک ویکلی ''فرائی ڈے ٹائمز'' نے اسلامی ریاست پر ان کا مقالہ شائع کیا ہے اور میں پڑھ کر انہیں اپنی رائے تحریر کروں۔ پھر مجھے اپنے قائم کردہ بین الاقوامی ادارے ''تہذیبوں کی پارلیمنٹ'' کی اسمبلی کا رکن بننے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ یہ اسمبلی ہر سال دو مرتبہ انقرہ اور لکسمبرگ میں بلائی جاتی ہے۔

اردن میں قیام کے دوران ہم چند زیارتوں پر گئے۔ حضرت علی ابن ابوطالب کے برادر زید ابن ابوطالب کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ عمان میں روز خبر اڑتی تھی کہ عراق پر امریکی حملہ ہوا چاہتا ہے۔ یہ افواہ بھی عام تھی کہ اگر امریکہ صدام حسین کو عراق کے صدر کے منصب سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تو وہاں کردوں، شیعوں اور سنیوں میں عراق کی علاقائی تقسیم روکنے کی خاطر دوبارہ بادشاہت قائم کر دی جائے گی اور سابق شاہ فیصل مقتول کی جگہ ان کے کزن پرنس الحسن بن طلال کو عراق کا بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ مگر میں نے پرنس حسن سے اس خبر کی صداقت کے بارے میں نہ پوچھا۔

عمان سے ہم ماسکو (روس) پہنچے۔ یہ ایک ذاتی سفر تھا کیونکہ ان دنوں ہمارے بیٹے ولید اپنی بیگم نوریہ کے ساتھ وہاں مقیم تھے۔ میں اور ناصرہ چند برس پیشتر بھی ماسکو گئے تھے جب روس میں سوویٹ نظام کا نیا نیا خاتمہ ہوا تھا۔ ہوائی جہاز میں ایک پاکستانی سے ملاقات ہوئی جو یو این کے نمائندے کی حیثیت سے شاید بیلا روس جا رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے: ''آپ کی صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔ کیا آپ شریف الدین پیرزادہ ہیں؟'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ''کوئی اور گیس لگائیے۔'' پھر معاً مجھے پہچان گئے اور میرے ہاتھ چوم کر عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ مگر مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ انہیں میری اور شریف الدین پیرزادہ کی صورت میں کیا مشابہت نظر آئی؟

ماسکو میں ابھی تک بعض حکومتی طور طریقے سوویٹ نظام ہی کی یادگار ہیں۔ مثلاً باوجود اس کے کہ روس اور پاکستان کے درمیان معاہدے کے تحت ''بلیو'' یا ''آفیشل'' پاسپورٹ رکھنے والوں کو ویزے کی ضرورت نہیں، ہمیں عمان سے روسی ہوائی جہاز میں سفر کرتے وقت پاکستان کی روسی ایمبیسی کی طرف سے جاری کردہ سرٹیفکیٹ دکھانے پڑے کہ ہمیں ویزا درکار نہیں۔ اگر یہ سرٹیفکیٹ ہمارے پاس نہ ہوتے تو ہم ماسکو نہ جا سکتے تھے۔ پھر ماسکو ایئر پورٹ پر فارم پر کرنے پڑتے ہیں کہ آپ کے پاس کتنے ڈالر ہیں اور واپسی پر وہ فارم واپس دیتے وقت بھی لکھنا پڑتا ہے کہ کتنے خرچ کیے اور کہاں۔ لیکن اگر آپ ایگزیکٹو لاؤنج سے ۶۰/۵۰ ڈالر فی کس ادا کر کے آ میں یا جائیں تو یہ کارروائی محض تکلفاً کی جاتی ہے۔

پاسپورٹ پر ایئر پورٹ میں امیگریشن والے ٹھپہ نہیں لگاتے کہ آپ کتنے دن ٹھہریں گے۔ بلکہ

پاسپورٹ اپنی ایمبیسی کی وساطت سے پولیس کو بھیجے جاتے ہیں اور وہ آپ کا نام رجسٹر کر کے طے کرتے ہیں کہ آپ کو کتنی مدت تک قیام کی اجازت دی گئی ہے۔ علاوہ اس کے پاسپورٹ ہر وقت اپنی جیب میں رکھ کر باہر نکلنا پڑتا ہے کیونکہ کسی وقت بھی پولیس سڑک پر آپ کو روک کر کاغذات دکھانے کو کہہ سکتی ہے۔

ماسکو میں جو بھی اہم تجارتی عمارتیں یا نئے پلازا بن رہے ہیں سب انہی روسی لیڈروں کی ملکیت ہیں جنہوں نے سوویٹ نظام میں پارٹی کے اعلیٰ عہدے سنبھال رکھے تھے۔ نئے امیروں اور سرمایہ داروں کا یہ طبقہ اب ماسکو سے باہر ''ڈاچوں'' کا بھی مالک ہے۔ دوسرے درجہ پر چھوٹے دکانداروں یا تجارتی حلقوں کو اکثر و بیشتر مافیا کنٹرول کرتا ہے۔ ماسکو میں روسیوں کی نئی نسل تو نئے مغربی طرز کے سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کی حامی نظر آتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں آزادی مل گئی ہے۔ مگر ضعیف طبقہ اور ماسکو اکاڈمی آف سائنسز کے پروفیسر بڑے مفلوک الحال ہیں۔ نظام کی تبدیلی سے غربت بڑھی ہے اور ماسکو میں فقیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ بیوپاری طبقہ میں ہندو بھی نظر آتے ہیں۔ پاکستانیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے کے لیے ابھی بڑی محنت کرنی پڑے گی۔

میرے پرانے دوست سب کے سب فوت ہو چکے ہیں۔ ان میں وہ ہستیاں بھی اب موجود نہیں جنہیں میں اپنا ہمدرد یا درد آشنا سمجھتا تھا اور اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرتا۔ ان میں ایک تو شیخ بشیر احمد تھے' دوسرے میرے بہنوئی میاں صلاح الدین اور تیسرے میرے سالے خالد وحید' مگر خدا کا شکر ہے' ان کی اولاد میں گو کسی کا تعلق بھی ملک کی سیاست سے نہیں' مگر محب وطن ہیں اور ملک کی بہتری کا سوچتے ہیں۔ بشیر کے بیٹے ڈاکٹر شہریار احمد پاکستان کے مایۂ ناز ماہر امراض قلب میرے بھی معالج ہیں۔ دراصل میاں جی (حکیم طاہر الدین) کی اولاد کی علامہ اقبال اور ان کے خاندان' خاص طور پر میری ذات کے ساتھ ہمیشہ ایک خاص قسم کی روحانی وابستگی رہی ہے۔ اب ان میں بھائی رفیق کے بیٹے فاروق اور بھائی قیس کے بیٹے ادریس' بابر' اویس اور تحسین ہی رہ گئے ہیں جو میری بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ میاں صلی کے بیٹوں یوسف کی سیاست میں دلچسپی ختم ہو چکی۔ اسد اپنے آرٹ میں گم رہتا ہے۔ البتہ اقبال اپنے نانا کے کلام کا شیدائی اور اپنی ماں کی دیکھ بھال میں سب سے پیش پیش ہے۔

میرے رشتہ داروں میں ماں کی طرف سے تو کوئی زندہ نہیں۔ سیالکوٹ کا گھر بھی میوزیم بن چکا۔ بھائی امتیاز کے بیٹے افتخار اور آپا وسیمہ کے بیٹے خالد البتہ سیالکوٹ میں مقیم ہیں۔ بھائی مختار کے بیٹے زوار اور ابرار تو لاہور میں رہتے ہیں اور بھائی اعجاز کی اولاد کراچی میں۔ کراچی جانے کا اتفاق ہو تو ان کے بیٹے نعیم میں ان کی شبیہہ دیکھ لیتا ہوں۔ ان کی بیٹیوں عاصمہ' نادرہ اور آنسہ سے ضرور ملتا ہوں۔ میری پھپھیاں سب فوت ہو گئیں۔ میری ایک تایا زاد بہن آپا عنایت زندہ ہیں' مگر ان کی عمر پچانوے برس ہے۔ سو اب

میرا اور میری بہن منیرہ کا خاندانِ اقبال کے بزرگوں میں شمار ہوتا ہے۔

عام انتخابات میں صرف چند ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ دو بڑی پارٹیوں کے سربراہ ملک سے باہر ہیں اور انہیں انتخابات میں شرکت کی اجازت نہیں۔ ملک میں انتخابات کی کوئی گہما گہمی دیکھنے میں نہیں آ رہی۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے میرے بیٹے منیب کے کاغذات منظور ہو گئے تھے مگر مسلم لیگ (ن) نے اسے ٹکٹ نہیں دیا۔ لہٰذا اس نے کاغذات واپس لے لیے۔

گزشتہ پچپن برس سے یہاں ایک ڈرامہ سیریل چل رہا ہے۔ سیاست دان آتے ہیں۔ اسمبلیوں میں آپس میں دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ جو زیادہ مار کھاتا ہے وہ فوج کی طرف دیکھ کر چلاتا ہے: ''اوئے! آپ دیکھ نہیں رہے کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ کتنی کرپشن ہے؟'' حتیٰ کہ فوج آ جاتی ہے۔ سیاستدان ایک دوسرے کے گریبان چھوڑ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے احتجاج کرنے لگتے ہیں: ''جمہوریت' جمہوریت۔'' فوج انہیں اقتدار سونپ دیتی ہے۔ وہ پھر ایک دوسرے کو گریبان سے پکڑ لیتے ہیں فوج پھر آ جاتی ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان جو آئندہ آنے والی نسل کی قیادت کر سکتے تھے یا قوم کی تقدیر بدل سکتے تھے' ملک سے جوق در جوق باہر جا کر آباد ہو رہے ہیں۔ دراصل پاکستان ایک ناکام ریاست نہیں بلکہ اس کی موجودہ قیادت ایک ناکام نسل کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم افغانوں پر قیامت گزرتے دیکھ چکے ہیں۔ جو کچھ فلسطینیوں اور کشمیریوں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ جو کچھ عراق' ایران یا سوڈان کے ساتھ ہونے والا ہے' اسے بھی شاید ہمیں دیکھنا پڑے گا۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۲ء سے نئے قانون کے مطابق امریکہ میں داخل ہوتے وقت ہر پاکستانی کو عام مجرموں کی طرح اپنی دسوں انگلیوں کے نشان اور اپنا نام و پتہ امیگریشن والوں کے پاس رجسٹر کرانے پڑیں گے۔ اس سے پیشتر اترتے وقت ہمارا سامان کتوں کو سنگھایا جاتا تھا۔ میرا دل وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ میں کون ہوں؟ میری پہچان کیا ہے؟ میرا قومی تشخص کیا ہے؟ میں جس ملک میں رہتا ہوں وہ اسلامی ریاست نہیں تو ''اسلامی'' ریاست کیا ہے؟

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تُو باقی فسانہ!
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ!

باب ۱۳

دوسرا خط

میں نے تقریباً سات برس کی عمر میں اپنے والد کو پہلا خط لکھا تھا جب اُنہیں انگلستان سے گراموفون باجالانے کی فرمائش کی تھی۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد اب اُنہیں دوسرا خط تحریر کر رہا ہوں۔ اس مرتبہ وہ اگلے جہان میں ہیں اور مجھے اپنے قومی تشخص اور ''اسلامی'' ریاست کے بارے میں ان سے رہبری لینا مقصود ہے۔

والد مکرم۔ السلام علیکم!

نئی نسل کے نمائندے کی حیثیت سے میں آپ کی اجازت کے ساتھ چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔

ہم مسلمانوں کے قومی تشخص کے بارے میں آپ کی جو بحث مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ ہوئی تھی اس میں مولانا مدنی کا موقف تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں' لہٰذا برصغیر کے مسلمانوں کی قومیت تو ہندی ہے البتہ ملت کے اعتبار سے وہ مسلم ہیں۔ آپ نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''قوم'' اور ''ملت'' کے ایک ہی معانی ہیں۔ مسلم قوم وطن سے نہیں بلکہ اشتراک ایمان سے بنی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام ہی مسلمانوں کی ''قومیت'' ہے اور ''وطنیت'' بھی۔ اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے چند اہم مثالیں بھی دی تھیں۔ یہ کہ رسولِ اکرم ﷺ اگر اپنے وطن سے ہجرت نہ کرتے اور کفار مکہ کے ساتھ تصفیہ کر لیتے کہ نسل' زبان اور علاقے کے اشتراک کی بنا پر ایک ہوتے ہوئے وہ اپنے خداؤں کی پرستش جاری رکھیں اور مسلمان اپنے خدا کی پرستش کرتے رہیں گے' تو آنحضورؐ سب سے پہلے عرب نیشنلسٹ قرار پاتے' پیغمبرِ اسلامؐ نہ ہوتے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مدینہ ہجرت کرنے کے بعد آنحضورؐ نے ''مہاجرین'' اور ''انصار'' کو اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر ایک ''امت''، ''ملت'' یا ''قوم'' بنا دیا۔ پس ملت اسلامیہ وطن سے نہیں بلکہ اشتراکِ ایمان سے وجود میں آئی ہے۔ آپ نے مولانا مدنی سے اختلاف کے دوران' بالخصوص اپنے اشعار میں' نہایت تلخ لہجہ اختیار کیا ۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقامِ محمدؐ عربی است

آپ کی تحریروں سے واضح ہے کہ آپ علاقائی ''قومیت'' اور ''وطنیت'' کے مخالف تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے فرمار کھا ہے کہ مسلم اکثریتی ملکوں میں اسلام اور نیشنلزم ایک ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور نیشنلزم کا تقاضا ہے کہ وہ اکثریتی جماعت میں مکمل طور پر مدغم ہو جائیں۔

پھر آپ نے دنیائے اسلام میں متفرق قومی ریاستوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی فرما رکھا ہے کہ اُن قومی ریاستوں کو چاہیے کہ پہلے اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑی ہوں اور بعد ازاں اشتراکِ ایمان اور تمدنی ہم آہنگی کی بنیاد پر جمہوریتوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح اکٹھی ہو جائیں۔

آپ کے مغربی نقادوں میں سے معروف مستشرق ایچ اے آر گب آپ کے سیاسی فکر پر تبصرہ کے دوران تعجب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حیرت کی بات ہے کہ اقبال علاقائی قومیت کے شدید مخالف ہوتے ہوئے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ بلکہ ان کے حامی تو برملا کہتے ہیں کہ قومیت یا وطنیت کے بارے میں جو کچھ اقبال کہتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسے تسلیم بھی کرتے ہوں۔

آپ نے اپنے سیاسی فلسفہ کے ذریعے اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر مسلم قومیت کا تصور پیش کر کے برصغیر میں ''دو قومی نظریہ'' کی حقیقت کو تقویت بخشی۔ چنانچہ پہلے مسلم قوم وجود میں آئی اور پھر اس قوم کے لیے وطن بصورت پاکستان حاصل کر لیا گیا۔ ظاہر ہے اگر اشتراکِ ایمان کی بنیاد پر مسلم قوم وجود میں نہ لائی جاتی یا اسلام سے ایک قومیت ساز قوت کے طور پر کام نہ لیا جاتا تو ''دو قومی نظریہ'' کی حقیقت کو کوئی تسلیم نہ کرتا اور اس کی بنیاد پر پاکستان نہ بن سکتا۔ بلکہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھنے میں بھی یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔

پاکستان نے ایک ''مقتدر''، ''قومی'' اور ''علاقائی'' ریاست کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی رکنیت حاصل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی نظریاتی اساس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پاکستان نے اقوام متحدہ میں مسلم امہ کی کوکھ سے نکلی ہوئی کئی قومی ریاستوں کی نو آبادیاتی طاقتوں سے آزادی کی خاطر تگ و دو میں حصہ لیا۔ فلسطین کی آزادی اور کشمیر کے مسئلہ کے حل کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ نیز او آئی سی میں ہمیشہ بڑا فعال کردار ادا کیا۔ جب کبھی دو مسلم قومی ریاستوں میں لڑائی ہوئی تو پاکستان نے ہمیشہ ''نیوٹرل'' پوزیشن اختیار کی۔ افغانستان سے غیر مسلم حملہ آوروں کی فوجوں کو نکالنے کی خاطر پاکستان نے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا۔ بعد ازاں پاکستان ہی کی مدد سے وہاں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور اسے تسلیم کیا گیا۔ پھر وہ مرحلہ آیا جب افغانستان پر ایک بار پھر غیر مسلم حملہ آور ہوئے۔ مگر اس مرتبہ پاکستان نے نہ صرف غیر مسلم حملہ آوروں کے ساتھ اتحاد کیا بلکہ مسلم افغانستان کے خلاف غیر مسلموں کی امداد کی اور افغان

مسلمانوں کی تباہی کو ہم ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ بلند کرتے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

اے پدر محترم! اگر اب ہماری اجتماعی شناخت کے لیے وہ علاقہ مختص ہو گیا جسے ''پاکستان'' کہتے ہیں اور جس کا مفاد ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے تو پھر مولانا حسین احمد مدنی کا قول کس اعتبار سے غلط ہوا؟ کیا ہمارے عمل سے یہ ثابت نہیں ہو گیا کہ قومی یا وطنی اعتبار سے تو ہم پاکستانی ہیں اور ''ملّی'' اعتبار سے مسلم؟ گویا ہمارے نزدیک اگر قومی مفاد یا مصلحت عامہ کے تحت ضروری ہو تو ہم کسی مسلم قومی ریاست کے خلاف غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد بھی کر سکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر ذہن میں الجھاؤ ہے۔ کیسے دور کیا جائے؟

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان ''دوقومی نظریہ'' کی بنیاد پر وجود میں آیا اور جب تک بھارت اور پاکستان جغرافیائی طور پر علیحدہ مملکتوں کی صورت میں قائم رہتی ہیں، ''دوقومی نظریہ'' ان کے درمیان حد فاصل رہے گا۔ مگر کیا پاکستان کے اندر بھی ''دوقومی نظریہ'' کو ایک حقیقت کے طور پر زندہ رکھنا ضروری ہے؟ کیا پاکستان میں ایک قوم آباد ہے یا دو قومیں؟ کیا پاکستان میں مسلم اکثریت کو اپنے تحفظ کی خاطر غیر مسلم اقلیت سے امتیاز روا رکھنا چاہیے؟

اے پدر محترم! آپ نے فرما رکھا ہے کہ ''علیحدہ نیابت'' کا اصول برصغیر میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر نافذ کیا گیا۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم جماعتوں کے مذہبی اور تمدنی رجحانات کو مدنظر رکھ کر کی جائے تو مسلمانوں کو خالصتاً ''مخلوط'' انتخابات پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

پس اگر وقت کے بدلتے تقاضوں کے تحت قومی ہم آہنگی برقرار رکھنے کی خاطر مخلوط انتخابات کا نظام رائج کر دیا جائے یا پاکستانی قومیت اور وطنیت کے جذبات کو فروغ دینے کی خاطر مثبت اقدام اٹھائے جائیں تو کیا پاکستان ''اسلامی'' مملکت سے ''سیکولر'' ریاست میں منتقل ہو جائے گا؟

اے میرے والد مکرم! آپ کے بارے میں قائداعظم محمد علی جناح نے ارشاد فرمایا تھا کہ علامہ اقبال ان چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو مسلمانان برصغیر کے قدیم اوطان میں ''اسلامی ریاست'' قائم کرنا چاہتے تھے۔

''اسلامی'' یا ''مسلم'' ریاست کے کئی نمونے (ماڈل) آج کے زمانہ میں موجود ہیں۔ مثلاً ترکی ماڈل، سعودی ماڈل، ایرانی ماڈل یا سابقہ طالبان ماڈل۔ اسی طرح تاریخ اسلام میں خلفاء راشدین کے عہد سے لے کر ترکی میں خلافت کے خاتمہ تک (۶۳۲ء تا ۱۹۲۴ء) کئی ماڈل نظر آتے ہیں۔ ان مختلف نمونوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ دراصل اسلامی ریاست کی کوئی حتمی شکل نہیں ہے بلکہ مختلف شکلوں میں مسلسل وجود میں آتے رہنے کے عمل کا نام ہے۔ اس اعتبار سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی ریاست کبھی مکمل صورت میں وجود میں آئی تھی۔ البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست ایک ''آئیڈیل'' ہے جس کے حصول کے لیے ہر مسلم ریاست کو اپنی کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ کیا یہ سوچ درست ہے؟

ایک اور قابلِ ذکر بات جو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا ''سیاسی ڈھانچہ'' خواہ کسی نوعیت کا ہو' وہ وجود میں تبھی آتی ہے جب اس میں قوانینِ اسلام (شریعت) کا نفاذ ہو۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس مسئلہ کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے اسلامی ریاست کے ''سیاسی ڈھانچے'' اور اس کے ''قانونی ڈھانچے'' کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے؟

رسول اللہ ﷺ کے عہد امامت میں اسلامی ریاست کے سیاسی ڈھانچہ یا دستور کی ایک تحریری مثال جو ہمیں ملتی ہے وہ ''میثاق مدینہ'' ہے اور کیا ''میثاق مدینہ'' بنیادی طور پر ایک ''معاشرتی معاہدہ'' نہ تھا؟ بعد ازاں خلفاء راشدین کے عہد میں ہمیں کم از کم چار سیاسی ڈھانچوں کی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی انتخاب (الیکشن)' نامزدگی (نامینیشن)' انتخاب بذریعہ انتخابی ادارہ (ایلیکٹورل کالج) اور بذریعہ استصواب رائے (ریفرنڈم)۔ بعد کے سیاسی ڈھانچوں کی شکل یا تو مختلف نوع کی مطلق العنان موروثی حکمرانی ہے یا غصبِ اقتدار کے ذریعہ وجود میں آنے والے امراء یا سلاطین۔

اے والد محترم! اس پس منظر میں آپ کی تحریروں سے میں نے اسلامی ریاست سے متعلق آپ کا ''ماڈل'' اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ بعض مسلم ممالک میں منتخب قانون ساز اسمبلیوں کا قیام اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہے۔ آپ نے اپنے اشعار میں جمہوریت یا خصوصی طور پر مغربی جمہوریت (جو عوام کی حاکمیت' حقوق انسانی کے تحفظ اور قانون کی بالادستی پر قائم ہونے کی دعویدار ہے) پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ مگر اس کے باوجود جب علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے آپ سے سوال کیا کہ آپ جمہوریت کی موجودہ شکل کو اس کی خامیوں پر اعتراضات کرنے کے باوجود' کیوں قبول کرتے ہیں؟ تو آپ کا جواب تھا کہ اس کا متبادل آمریت یا مطلق العنانیت ہے جو اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

اگر اسلامی جمہوریت کا تصور ہم ''شوریٰ'' والی آیت (سورۃ ۴۲ آیت ۳۸) سے اخذ کرتے ہیں تو اسلامی تاریخ میں شوریٰ کا رول ہمیشہ امام (خواہ وہ کسی قسم کے انتخابی طریقہ یا غیر انتخابی طریقہ سے سربراہ بنا ہو) کو صرف مشورہ ''دینا'' ہے اور امام اس مشورے کا پابند نہیں۔ اس کی مرضی ہے مشورہ قبول کرے یا رد کردے۔

اس آیت کی صحیح معنوں میں ''جمہوری'' تفسیر ہمیں صرف خوارج کے ہاں ملتی ہے جن کا نظریہ تھا کہ شوریٰ کا اصل کام ''آپس میں'' مشورہ کرکے اُمہ کے مسائل حل کرنا ہے اور شاید یہی اس آیت کا صحیح مفہوم بھی ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک خلیفہ کا تقرر بطور سربراہ صرف فرض کفایہ ہے۔ ضرورت پڑے تو شوریٰ اسے منتخب کرسکتی ہے اور مزید یہ کہ ضروری نہیں کہ خلیفہ یا امام اہل بیت یا قریش میں سے ہی ہو' بلکہ اس منصب کے لیے ایک سیاہ حبشی غلام یا عورت بھی موزوں ہیں بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتے ہوں۔ سو اس اعتبار سے تاریخ اسلام میں اصل ''سوشل ڈیموکریٹس'' تو خوارج ہی تھے جنہیں ابتدائی دور ہی سے اسلام سے

خارج کر دیا گیا اور اس لیے ''خارجی'' کہلائے۔

مسلمانوں کی جدید تاریخ میں سید جمال الدین افغانی پہلی شخصیت تھے جنہوں نے ترکی میں سلطان (خلیفہ) عبدالحمید کو شوریٰ یا اسمبلی کے مشورے کا پابند کرنے کی کوشش کی۔ یعنی ''آئینی یا دستوری خلافت'' کا تصور پیش کیا جو وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق نیا اجتہاد تھا۔ مگر سلطان عبدالحمید نے اُن کے خلاف شیخ الاسلام سے کفر کا فتویٰ جاری کروا دیا۔ شیخ الاسلام کا استدلال مختصراً یہ تھا کہ اسلام کی صدیوں پرانی سیاسی روایت کے مطابق' سورۃ ۴ آیت ۵۹ کے تحت مسلمانوں پر بلا شرط اطاعت ''اولی الامر'' فرض ہے۔ نیز اسی روایت کے مطابق شوریٰ امام کو صرف مشورہ ''دے'' سکتی ہے۔ لیکن شوریٰ کے ''آپس میں'' مشورے کا امام کو پابند کرنے والے سب کے سب سرکش اور کافر ہیں۔

اے والد محترم! آپ سید جمال الدین کو موجودہ عہد کا مجدد سمجھتے تھے اس لیے جب ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت منسوخ کر دی گئی تو آپ نے ترکوں کے اجتہاد' کہ خلیفہ کے تمام اختیارات منتخب مسلم اسمبلی کو منتقل ہو گئے ہیں' کی تائید کی۔ پس کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ آپ کی جدید اسلامی ریاست عوام کے ووٹوں کے ذریعے منتخب نمائندوں کی مجلسِ قانون ساز کے قیام' حقوق انسانی کے تحفظ اور قانون کی بالادستی کے اصولوں پر ہی قائم ہو سکتی ہے؟

آپ کے نزدیک ''توحید'' کا مطلب انسانی اتحاد' مساوات اور آزادی کی بنیادوں پر زمان و مکان کے اندر ایک مثالی معاشرہ وجود میں لانا ہے۔ اسی بنا پر خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) میں آپ نے سورۃ ۲۰ آیت ۴۰ کے حوالے سے اعلان کیا تھا کہ مجھ پر اقلیتوں کی عبادت گاہوں' قوانین اور تمدن کے تحفظ کا فرض عائد کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے مزید فرما رکھا ہے کہ اسلام کا اصل مقصد ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے۔

اے پدر محترم! آپ نے وضاحت نہیں کی کہ ''روحانی جمہوریت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس تصور کی بنیاد آپ ''میثاقِ مدینہ'' پر رکھتے ہیں یا سورۃ ۵ آیت ۵۸ پر جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو تلقین کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے نیک کام انجام دینے میں سبقت حاصل کرو اور یہ کہ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے روبرو لائے جاؤ گے تو وہ بتائیں گے کہ تمہارے آپس میں اختلافات کیا تھے؟

آپ کی طرف سے وضاحت کی عدمِ موجودگی کے سبب بعض اقبال شناس آپ کے تصورِ ''روحانی جمہوریت'' کو صرف مختلف مسلم فرقوں میں رواداری تک محدود رکھتے ہیں اور اس میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کرتے۔ حالانکہ جب یہ اصطلاح استعمال کی گئی' آپ مقتدر مسلم ریاست' جس کے اندر ''روحانی جمہوریت'' قائم ہونی تھی' کا ذکر اپنے خطبہ میں فرما چکے تھے۔ بلکہ سید نذیر نیازی کو اپنے خط میں تحریر بھی کر دیا تھا کہ میری مجوزہ مسلم ریاست میں' جو برصغیر کے شمال مغرب میں قائم ہوگی' آبادیوں کے تبادلے کی

ضرورت نہیں۔ یعنی اس ریاست میں غیر مسلم بھی موجود ہوں گے۔ اس لیے کیا آپ کی ''روحانی جمہوریت'' کا یہ مطلب نہیں کہ مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں بلاتفریق مذہب' ذات پات' رنگ' نسل' زبان سب برابر کے شہری تصور کئے جائیں گے؟ غالباً اسی پس منظر میں آپ نے پنجاب کونسل کی ممبری کے زمانے میں ''توہین بانیانِ ادیان'' کا قانون پاس کرانے کی کوشش کی تھی؟

آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں اسلام کیسے نافذ کیا جائے گا؟ آپ کا ایک شعر ہے

''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

کسی اور مقام پر فرمایا ہے۔

''دینِ ملائی سبیل اللہ فساد''

اے میرے پدر محترم! دین کی وہ کونسی تعبیر ہے جو ریاست کو معاشی ناانصافی اور ظلم سے محفوظ رکھتی ہے؟ اور وہ کونسی تعبیر ہے جو شر اور فساد کا سبب بنتی ہے؟ نیز جو تعبیر شر اور فساد کا باعث بنتی ہے اس کے تدارک کے لیے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہیے؟

اس ضمن میں آپ اس تجویز کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ریاست کے مختلف شعبوں سے دینیات کا شعبہ الگ کر دیا جائے۔ اس شعبہ کا کام مساجد اور مدرسوں کو کنٹرول کرنا ہو' مدرسوں کے لیے جدید نصاب کا تعین کرنا اور انہیں یونیورسٹیوں سے منسلک کرنا ہو۔ اسی طرح صرف حکومت کے سند یافتہ آئمہ مساجد کا تقرر اس شعبہ کی ذمہ داری ہو۔ جب ترکی میں اس طرز کی اصلاحات نافذ کی گئیں تو آپ نے بڑے جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا تھا کہ اگر مجھے ایسا اختیار حاصل ہو تو میں فوراً یہ اصلاح مسلم انڈیا میں نافذ کر دوں۔ کیا آپ کی نگاہ میں دینیات کے شعبہ کی ریاست کے دوسرے شعبوں سے علیحدگی محض ''فنکشنل'' ہے' اس کا مطلب ''چرچ'' اور ''سٹیٹ'' کی علیحدگی نہیں ہے؟

اسی طرح دین کو کیسے ملکی سیاست کے ساتھ پیوست کیا جائے کہ ریاست ظلم اور معاشرتی ناانصافی کرنے سے باز رہے؟ اس بارے میں آپ منتخب مسلم قانون ساز اداروں یا اسمبلیوں کو ''اجتہاد'' کا اختیار دیتے ہیں۔ چونکہ آج کی مسلم اسمبلیوں کے ارکان میں سے بیشتر علمی یا تعلیمی اعتبار سے نااہل ہیں' اس لیے آپ کی رائے میں فی الحال حکومت وقت علما کے ایسے بورڈ نامزد کرے جو اسلامی قانون سازی کے معاملوں میں پارلیمینٹ کے ارکان کے ساتھ بحث میں حصہ لیں اور ان کی رہبری کریں' لیکن کسی ایسے اسلامی بل پر انہیں ووٹ ڈالنے کا حق نہ ہو۔ آپ کے خیال میں یہ طریق کار صرف عارضی طور پر اپنایا جانا چاہیے۔ صحیح طریقہ یہی ہوگا کہ قانون کی تعلیم دینے والے اداروں' لاء کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قانونی نصاب میں اصلاح کی جائے اور اس میں اسلامی فقہ کے ساتھ جدید جورس پروڈنس کا تقابلی مطالعے کا موضوع شامل ہو۔ اس موضوع میں مہارت حاصل کرنے والے وکلاء ٹیکنو کریٹس کی حیثیت سے مختلف جدید علوم

(مثلاً اقتصادیات، بینکنگ وغیرہ) کے غیر علماء ماہرین کے ساتھ سیاسی جماعتوں کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر پارلیمینٹ میں لائے جائیں۔ تبھی مسلم اسمبلی صحیح معنوں میں ''اجماع'' کی صورت میں اسلامی قانون سازی کے معاملے میں ''اِجتہاد'' کے قابل ہو سکے گی۔

اے میرے پدر محترم! اس مرحلے پر دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں برصغیر کے صرف چند علماء کے علاوہ باقیوں کے علم کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اگر چہ ہماری اسمبلیوں کے منتخب رکن نااہل ہیں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خطہ پاکستان میں ایسے جیّد علماء موجود ہیں جو اسلامی قانون سازی کے موقعوں پر ارکان اسمبلی کی مثبت رہبری کر سکیں؟

میری اپنی چیف ججی کے زمانے میں بادشاہی مسجد میں ایک مناظرہ غالباً دیوبندی اور بریلوی فرقوں کے علماء کے درمیان ہوا تھا۔ اس موقع پر کسی نامعلوم شخص نے کوئی نامناسب نعرہ لگا دیا جس پر دونوں گروہوں میں مسجد کے اندر اور باہر خاصی مارکٹائی ہوئی اور بعض علماء زخمی بھی ہوئے۔ نتیجہ میں صوبائی حکومت نے اس واقعہ کی انکوائری کرنے کی خاطر مجھے ہائیکورٹ کے جج کا تقرر کرنے کی سفارش کی۔ میں نے جسٹس شیخ ریاض احمد (موجودہ چیف جسٹس پاکستان) کو یہ ذمہ داری سونپی۔ انہوں نے اس معاملے کے بارے میں اپنی رپورٹ حکومتِ پنجاب کو دی جو آج تک شائع نہیں ہوئی۔ لیکن ایک بات جو ان کی وساطت سے میرے علم میں آئی وہ یہی تھی کہ واقعہ کے متعلق علماء حضرات کے بیانات میں اتنا تضاد تھا کہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکنا ممکن نہ تھا۔ چیف جسٹس محمد منیر بھی اپنی معروف ''منیر کمیٹی رپورٹ'' میں کچھ ایسے ہی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ان حالات میں نئی اسلامی قانون سازی کے لیے ''اجتہاد'' کے بارے میں ان کی رہبری پر کس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان ایک ''قومی ریاست'' ہے۔ اگر اس کی منتخب اسمبلیاں اسلامی قانون سازی کے لیے اجتہاد کا طریقہ اختیار کرتی ہیں تو کیا ایسے نئے اسلامی قوانین کا اطلاق صرف پاکستان کی سرحدوں تک محدود نہ ہو گا؟ اور کیا یوں فقہ کا ایک نیا ''نیشنل'' مدرسہ وجود میں نہ آ جائے گا؟

پاکستان کی منتخب اسمبلیوں میں مسلم اراکین کے ساتھ غیر مسلم ممبران بھی موجود ہوں گے۔ کیا آپ کے نزدیک وہ ''اجماع'' یا پارلیمنٹ میں اسلامی قانون سازی کے معاملے میں مسلم اراکین کے ساتھ مل کر اجتہاد کے اہل ہوں گے؟ وہ اپنی سیاسی پارٹی کے ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے ووٹ کا حق استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ امام ابو اسحاق شاطبی (جن کا حوالہ آپ اپنی انگریزی تصنیف میں دیتے ہیں) کے مطابق قدیم فقہا نے غیر مسلموں کو ''اجماع'' میں شریک ہو کر اسلامی قانون سازی کے معاملہ میں اجتہاد میں حصہ لے سکنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ البتہ انفرادی طور پر کوئی غیر مسلم اسلامی قوانین کے بارے میں اجتہاد کا اہل نہیں۔ مگر برطانوی ہند میں ''اینگلو محمڈن لاء'' کے ارتقا کے دوران غیر مسلم جج صاحبان عدالتوں میں مسلمانوں کے ''پرسنل لاء'' کے تحت قضیوں کے فیصلے

کرتے چلے آئے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ علماء حضرات نے کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ ایک اور اہم فقہی مسئلہ قرآنی احکام کے ''ناسخ و منسوخ'' کا مسئلہ ہے۔ کیا ''اجماع'' حالات کے کلی طور پر بدل جانے کے سبب کسی مخصوص قرآنی حکم کو ''منسوخ'' قرار دے سکتا ہے؟ بعض معتزلہ اور ایک اہم حنفی امام عیسیٰ بن عیان کے نزدیک ''اجماع'' کو ایسا اختیار حاصل ہے مگر آپ نے اس نازک فقہی مسئلہ پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ ایسے مسائل آج کی مسلم اسمبلی میں اٹھ سکتے ہیں۔

آپ کے ہاں اسلام کے نفاذ کے لیے سب سے زیادہ زور تعلیمی اداروں میں اسلامی اخلاقیات کی تربیت دینے پر ہے۔ اس کے لیے صرف صوم وصلوٰۃ کی مکینیکل پابندی ہی کافی نہیں۔ بلکہ انسان دوستی، رواداری، حلم، عجز، سادگی ایسی خصوصیات کی ترغیب کے ساتھ طلباء اور طالبات میں تجسس کا جذبہ پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے علوم کے ذریعے اختراع اور ایجاد کا منقطع سلسلہ از سر نو جاری رکھ سکیں۔ آپ کی نگاہ میں طبیعیات، ریاضیات یا سائنس کے دیگر موضوعات میں دلچسپی لینا بھی ایک طرح کی عبادت ہے کیونکہ مشاہداتی علوم کا مطالعہ دراصل فطرت یا قدرت کا مطالعہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے قربت کا سبب بنتا ہے۔

آپ نے تفصیل سے نہیں بتایا کہ کن اسلامی قوانین کے بارے میں اجتہاد کی ضرورت ہے بلکہ آپ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کرلی کہ ہماری قوم بڑی قدامت پسند اور حساس ہے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوجاتے ہیں اور یہ کہ ''اس وقت'' متنازع امور پر بحث کرنے کی بجائے مسلمانوں کو آزادی حاصل کرنے کی خاطر ''اتحاد'' کی ضرورت ہے نہ کہ ''اجتہاد'' کی۔ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ محکومی کے دور میں اجتہاد کی بجائے ''تقلید'' کا راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ مگر اے پدر محترم! کیا ہم اب بھی صحیح معنوں میں آزاد ہیں یا ابھی تک محکومی کے دور ہی سے گزر رہے ہیں؟

ان حقائق کے باوجود آپ کی تحریروں میں بعض اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے اجتہاد کے بارے میں بحیثیت مجموعی آپ کے رجحانات کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ کی رائے خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی کے حق میں ہے۔ آپ ایک سے زائد ازدواج کے امتناع کو شرعاً جائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معاشرتی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کا سربراہ کسی بھی قرآنی حکم یا اجازت کی تعویق، تحدید یا توسیع کرسکتا ہے۔

مولانا شبلی کی طرح آپ مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی کے فروغ کی خاطر بینکوں کے منافع کو ربوا کے زمرے میں نہیں لاتے۔ آپ چونکہ جاگیرداری کو مناسب حدود میں رکھنے کے قائل ہیں، اس لیے پنجاب کونسل کی رکنیت کے زمانے میں آپ نے سرکاری اراضی بے زمین مزارعین یا کسانوں کو آسان اقساط میں بیچنے کے ساتھ، جاگیرداروں پر اگریکلچرل انکم ٹیکس لگانے کی تجاویز پیش کیں۔ آپ کے خیال میں زمیندار صرف اتنی زمین کی ملکیت کا حقدار ہے جتنی وہ بذاتِ خود کاشت کرسکے۔ اسی طرح قرآنی حکم

''قل العفو'' (سورۃ ۲ آیت ۲۱۹) کے تحت آپ حکومت کو ٹیکس لگانے کے ایسے اختیارات دینا چاہتے ہیں جو صاحب ثروت ہر سرمایہ دار یا کارخانہ دار سے اس کی انفرادی ضرورت سے زائد دولت حاصل کر کے مزدوروں اور ان کے بچوں کی فلاح و بہبود پر صرف کی جا سکے۔ چونکہ آپ ''کیپٹلزم'' اور ''کمیونزم'' دونوں معاشی نظاموں کے خلاف ہیں اس لیے آپ ''کیپٹلزم'' اور ''فیوڈلزم'' کو مناسب حدود میں رکھتے ہوئے اپنی مجوزہ اسلامی ریاست میں زکوٰۃ' صدقات اور عشر کی تنظیم نیز اسلامی قانونِ وراثت کے سختی سے اطلاق کے علاوہ ایسی تمام سوشل اصلاحات نافذ کرنے کے حق میں ہیں جن کے ذریعے متوسط طبقے کی فلاحی ریاست وجود میں لائی جا سکے۔

جہاں تک اسلامی کریمینل لاء (حدود) کا تعلق ہے آپ مولانا شبلی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ چونکہ حدود کا تعین اُس قوم کی روایات' عادات اور خصائل کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا ہے جس پر نبی مبعوث کیا گیا اور ان ''سزاؤں'' کا اصل مقصد محض سزائیں دینا نہیں' بلکہ معاشرے میں جہاں تک ممکن ہو سکے جرائم کی بیخ کنی کرنا ہے۔ اس لیے آئندہ آنے والی نسلوں پر ضروری نہیں کہ ایسے قوانین کا سختی سے اطلاق کیا جائے۔ اس مرحلے پر کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اپنی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست میں آپ اسلامی معاشی ''برکات'' سے متعلق قانون سازی کو اسلامی ''تعزیرات'' سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟

اے پدرِ محترم! اگرچہ آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست کا خاکہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں' مگر اس حقیقت سے انکار کر سکنا مشکل ہے کہ اس کا نمونہ ماضی یا حال کے تمام ایسے نمونوں سے مختلف ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ماڈل قابلِ عمل ہے تو اسے کون وجود میں لائے گا؟

آپ ہمیشہ جوانوں سے مخاطب ہوتے تھے۔ انہیں پیروں کا استاد دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ خداوند تعالیٰ آپ کا عشق اور آپ کی نظر انہیں عطا کر دے۔ اسی سبب آپ اپنے آپ کو آنے والے کل کا شاعر و مفکر سمجھتے تھے۔

اے کاش! میں اُن جوانوں میں سے ہوتا جو آپ کی مجوزہ ''اسلامی'' ریاست کو عملی طور پر وجود میں لا سکنے کے قابل تھے۔ مگر میری نسل' جس نے پاکستان بنتے' ٹوٹتے اور پے در پے مشکل ادوار میں سے گزرتے دیکھا' ایک مایوس نسل ہے۔ میں اپنی کوتاہیوں سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میں نہ اچھا مصور بن سکا' نہ اچھا ادیب' نہ اچھا سیاستدان' نہ اچھا وکیل' نہ اچھا جج' نہ اچھا شوہر' نہ اچھا باپ۔ میری زندگی میں آسودگی میری اپنی محنت کا ثمر نہیں بلکہ میری رفیقۂ حیات کی مشقت کا نتیجہ ہے۔ میں تو اپنے بچوں کو بھی وہ شفقت و محبت نہ دے سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

آپ کو یاد ہوگا جب اس دنیا میں آپ کی آخری شب تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو آپ مجھے پہچان نہ سکے۔ پوچھا: ''کون ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''جاوید۔'' فرمایا: ''جاوید (ہمیشہ رہنے والا) بن کر دکھاؤ تو جانیں!'' افسوس ہے' میں آپ کی خواہش کے مطابق ''جاوید'' نہ بن سکا۔

اور بنتا بھی کیسے؟ آپ نے خود ہی ''جاوید نامہ'' (خطاب بہ جاوید) میں میرے ذریعے میری نسل کے مایوس جوانوں کو ارشاد فرمایا تھا:

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں — دربدن غرق است و کم داند زجاں
چوبدن از قحطِ جاں ارزاں شود — مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را — گرچہ بیند روبرو آں مرد را
تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ — گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ

''میں اُس زمانے سے ڈرتا ہوں جس میں تم پیدا ہوئے۔ کیونکہ یہ زمانہ جسم میں غرق ہے اور روح کو نہیں پہچانتا۔ جب روح کے قحط کے سبب جسم ارزاں ہو جائیں تو مردِ حق اپنے اندر چھپ جایا کرتا ہے۔ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو تو دکھائی نہیں دیتا حالانکہ تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ مگر تم اس کی تلاش کے لیے اپنی تگ و دو جاری رکھو خواہ تمہیں کتنی ہی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔''

اے پدرِ محترم! ایک ''مردِ حق'' جسے آپ ہی نے ہمارے لیے منتخب کیا تھا' کی قیادت میں ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔ بعد ازاں جو بھی ''مردان و زنانِ حق'' ہمیں میسر آئے' آپ خود ہی بتائیے' کیا وہ آپ کے قائم کردہ معیار پر پورے اترتے تھے؟ پھر بھی آپ کے فرمان کے مطابق' ہم شجر سے پیوستہ ہیں' امیدِ بہار رکھتے ہیں۔

اے پدرِ محترم! منیب' ولید اور اُن کی نسل کے آزردہ نوجوان مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تلاش کے باوجود کوئی ''مردِ حق'' نہ ملے۔ اگر کسی باخبر مرد کی صحبت ہمیں میسر نہ آئے۔ اگر صحیح قیادت ہمارے نصیب میں نہ ہو' تو ہم کیا کریں؟ میں انہیں وہی پیغام دے سکتا ہوں جو آپ نے مجھے ''جاوید نامہ'' کے آخری حصہ ''خطاب بہ جاوید'' میں دے رکھا ہے:

غم اور دلگیری ایمان کی کمزوری ہے۔
غم نصف پیری ہے۔
نوجوانو! جب تک تم غیر اللہ سے لالچ رکھتے ہو
اور جب تک اس سے کچھ نہ ملنے کے غم سے تم آزاد نہیں ہو جاتے
تمہارے مسائل حل نہ ہوں گے۔ تم جاوید نہ بن سکو گے۔
یاد رکھو! حرص ہمیشہ کی محتاجی ہے
پس اپنے اوپر ضبط رکھو۔

خیر اندیش
یکے از فرزندانِ اقبال

خودکلامی

میری عمر اب اٹھتر برس ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ لیکن بسا اوقات مجھے احساس ہوتا ہے کہ وقت کا کوئی وجود نہیں۔ میں تیزی سے گزر رہا ہوں۔ ''میں'' سے میری مراد میری ''انا'' ہے جو میری زندگی میں حرکت کا باعث ہے۔ یہ حرکت ہی میرا سفرِ حیات ہے جس کی پیمائش کے لیے وقت ایک آلے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

میں افسردہ ہوں۔ غیر یقینی حالات میں انسان اعصاب کے تناؤ یا مختلف قسموں کے معاشرتی دباؤ کے سبب نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر میں بظاہر کسی اعصابی تناؤ یا معاشرتی دباؤ کا شکار نہیں ہوں۔ ذہنی طور پر محسوس کرتا ہوں کہ میں وہ کچھ کر سکتا ہوں جو تیس برس کی عمر میں کرتا تھا۔ لیکن اب جسم ذہن کے تابع نہیں رہا۔ اس کا حکم نہیں مانتا۔ میں اُس کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور شاید یہ میری نفسیاتی افسردگی کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے۔ نفسیاتی افسردگی تو ایک بیماری ہے۔ آج کل بہت عام ہے۔ اس کے علاج کے لیے طویل مدت درکار ہے اور دوائیں خاصی مہنگی ہیں۔ اب ذہن کی بیماریوں کا علاج بھی گولیوں سے ہونے لگا ہے۔ ظاہر ہے روح بدن کا عضو بن کر رہ گئی ہے اور بدن کے ساتھ ہی مر جایا کرے گی۔

میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس لیے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہوں۔ مذہبی فرائض ادا کرتا ہوں لیکن اُسی حد تک جو میری فطرت قبول کرے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کے انسان پر مذہب کی وہ گرفت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ شخصی آزادی کے احساس نے مذہبی پابندیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ میں گرفتارِ مذہب نہیں۔ سمجھتا ہوں کہ میرے اصل آباؤ اجداد حیوان تھے۔ میں اس مخلوق سے کب اور کیوں بچھڑ گیا؟ ''حیوانِ گنگ'' سے ''حیوانِ ناطق'' اور چوپائے سے دوپایہ کیسے بن گیا؟ اس علیحدگی کو امر ربی ہی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ قانونِ فطرت کے تحت حیوان حیوان ہی کو جنم دے سکتا ہے۔ بعض انسانوں کے اندر کا حیوانِ مذہبی چابک ہی سے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ مگر دیگر منہ زوروں کو شرارت سے دور رکھنے کے لیے شاید ثقافتی بوس و کنار موزوں ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ میرا حیوانوں کی مخلوق سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں نہ روح ہوں نہ بدن۔ بلکہ خدا کے ان گنت افعال میں سے ایک ایسا فعل ہوں جس نے اربوں صدیوں میں مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے اتفاقاً یا حادثاتی طور پر شعور حاصل کر لیا۔ بہر حال میرا اس متکبر شیطان سے

کوئی واسطہ نہیں جس کا ذکر آسمانی صحیفوں میں آتا ہے۔ اگرچہ ایک اعتبار سے ہم دونوں ایک جیسے ہیں۔ وہ بھی معتوب ٹھہرا اور میں بھی راندۂ درگاہ قرار پایا۔ اگر میں ''باشعور فعلِ خدا'' نہیں اور حیوانی مخلوق ہی سے اخذ کردہ ہوں تو ظاہر ہے' میرا شیطان میری بھوک اور شہوت ہیں۔ شہوت تو زندگی کی دوڑ میں بالآخر معدوم ہو جاتی ہے مگر بھوک مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اسے کیسے ماروں؟ کیا روزے رکھنے سے بھوک مر جاتی ہے؟

ویسے میں تو ۱۹۶۴ء سے شادی کے بعد بیوی کی دیکھا دیکھی باقاعدگی سے روزے رکھتا ہوں۔ ۱۹۸۹ء میں ہم دونوں نے اکٹھے حج کا فریضہ ادا کیا۔ ۲۰۰۰ء کی ابتدا سے چار نمازوں کے فرائض پڑھ لیتا تھا۔ فجر کی نماز کے لیے آنکھ نہ کھلتی تھی۔ لیکن اسی سال کے رمضان میں فجر کی نماز پڑھنا شروع کی۔ اصول بنایا کہ نماز پڑھ لی جائے خواہ قضا ہی کیوں نہ پڑھی جائے۔ نہ پڑھنے سے پڑھ لینا بہتر ہے۔ لیکن ایسی عبادات میرے اندر کے حیوان پر قابو نہیں پا سکیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں انسان انسان کے مابین فاصلوں کو دور کرنا اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لانا شاید مذہب کے لیے ممکن نہ رہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ مذہب کی جگہ تصوف لے لے اور اخلاقیات کا معیار ثقافت یعنی ادب اور فنونِ لطیفہ متعین کریں۔ اپنے آپ کو تہذیب یافتہ سمجھنے والے بعض افراد تو آج بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

میں نماز کے بعد دعا رسماً اس لیے مانگتا ہوں کہ میری دانست میں کائنات کا نظام ایک ایسے قانون کے تحت چل رہا ہے جسے نافذ کرنے والی ہستی خود بھی اس کی پابند ہوگی۔ بھلا اپنا بنایا ہوا قانون کوئی کیوں توڑے گا۔ ان حالات میں آئینِ قدرت سے ہٹ کر دعا کی قبولیت کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ مگر آئینِ قدرت کی حدود سے باہر بھی تو کچھ ہوتا رہتا ہے جسے امرِ ربی یا رضائے الٰہی کہتے ہیں۔ یہ عمل عموماً حوادث یا اتفاقات کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر حادثے یا اتفاق کا سبب خدا ہی ہو۔ بعض اوقات انسان بھی اس کا باعث بنتا ہے اور یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ذمہ دار کون ہے۔ سو میری زندگی میں خدا کی مداخلت اتفاق یا حادثہ ہی کے ذریعہ ہوتی ہے اور اسی مداخلت کو کبھی معجزہ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ میرے مرنے کے بعد دنیا یونہی قائم رہے گی' میں قیامت پر یقین رکھتا ہوں۔ سبب یہ ہے کہ خالق اپنی تخلیقات میں کسی نہ کسی ذریعہ سے مداخلت کرتا رہتا ہے۔ کائنات میں قیامتیں آتی رہتی ہیں۔ ہر لحظہ کوئی نہ کوئی کہکشاں مٹ جاتی ہے' ستاروں کے جھرمٹ فنا ہو جاتے ہیں' سورج بجھ جاتے ہیں یا نظام ہائے شمسی معدوم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کن فیکون کا عمل بھی جاری ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کن فیکون کے نتیجے میں عظیم دھماکے کے بعد اچانک کائنات عدم سے وجود میں آئی' تب سے خلا کے غبارے میں کوئی مسلسل ہوا بھر رہا ہے جس کے باعث کہکشائیں ایک دوسری سے دور سے دور تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ایک ایسی حادثاتی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے جب غبارے سے ہوا سرکنے لگے' اس کے پھیلاؤ کی بجائے سکڑنے کا عمل شروع ہو اور آناً فاناً ساری کی ساری کائنات لپیٹ دی جائے۔ کائنات نہ سہی' ہمارا نظامِ شمسی فنا کی زد میں ہے۔ ایک معمولی سا آسمانی حادثہ اسے تہہ و بالا کرسکتا ہے۔ آخر خلا میں بے اختیار

چکر لگاتے ہوئے کرۂ ارض سے اگر کسی آوارہ سیارے کا ریزہ ٹکرا جائے تو ہمارا والی وارث کون ہے۔

موت کے بعد زندگی کی توقع رکھنا' میرا حق نہیں۔ میں صرف اُس کا امیدوار ہوں۔ یہ نعمت خدا کی طرف سے انعام ہے جسے چاہے دے' جسے چاہے نہ دے۔ اگر یہ نعمت میرے نصیب میں نہیں تو میری روح میرے جسم کے ساتھ ضائع کر دی جائے گی۔

اخلاقی طور پر والد کی طرف سے ورثہ میں مجھے جو سب سے قیمتی شے ملی ہے وہ یہی ہے کہ خدا کی رضا کے سامنے دم نہ مارو۔ یعنی حادثے یا اتفاق کے نتائج کو بسر و چشم قبول کر لو۔ مگر اپنی نگاہوں میں اپنی عزت برقرار رکھنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے مت جانے دو۔ وہ ارشاد کرتے ہیں۔ ''میرے دل میں تو شیطان کی بھی کچھ نہ کچھ قدر و منزلت ہے۔ آدمؑ جسے وہ دیانتداری سے اپنے آپ سے کمتر سمجھتا تھا' کو سجدہ کرنے سے انکار کے ذریعے شیطان نے اپنی نگاہوں میں اپنی عزت کے ایک انتہائی بلند جذبہ کا مظاہرہ کیا۔ میری رائے میں اس کے کردار کی صرف یہ خوبی ہی اسے اس کے روحانی قبح سے نجات دلا سکتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو اس لیے سزا نہ دی کہ اس نے کمزور انسانیت کے جدِ اعلیٰ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا تھا' بلکہ محض اس لیے کہ اس نے حیات و کائنات کے عظیم خالق و مالک کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے احتراز کیا۔''

جب سے پاکستان کو لسانی' نسلی' علاقائی اور فرقہ وارانہ نوعیت کی بیماریاں لاحق ہوئی ہیں' کئی سوالات بھنبھناتی مکھیوں کی طرح مجھے بڑا تنگ کرتے ہیں۔ یورپی مذہبی ادب میں بھنبھناتی مکھیوں کے ڈھیر کی موجودگی عموماً شیطان کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔ یونانی دیومالا میں یہ تخیلی مخلوق ''فیوریز'' کی شکل اختیار کرتی ہے جنہوں نے اپنی ماں کے قاتل اورسطی کا دماغ مختل کر دیا تھا۔ قرآنی زبان میں اُنہیں ''وسوسے'' کہا جاتا ہے جو خناس ہمارے دلوں میں انڈیلتا رہتا ہے۔ میرے کانوں میں آوازیں گونجتی ہیں...... کوئی کہتا ہے: ''نظریاتی ریاستیں دیر تک قائم نہیں رہ سکتیں۔ نازی جرمنی' فاشی اٹلی اور سوویٹ روس نظریاتی ریاستیں تھیں' اِن کا جو حشر ہوا سب کے علم میں ہے۔'' میں کہتا ہوں: ''مانتا ہوں' مانتا ہوں۔ مگر ایک اعتبار سے ہر قومی ریاست کسی نہ کسی نظریہ پر قائم ہے اور قائم رہ سکتی ہے' بشرطیکہ اُس کے اساسی نظریہ میں رواداری کی لچک ہو اور اس کی تعبیر اصولی بنا پر کرنے کی بجائے عملی طور پر کی جائے۔'' سوال گونجتا ہے: ''پاکستان میں قومیت کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی' اس لیے یہ ایک نظریاتی ریاست ہونے کا دعویٰ کرتی ہے حالانکہ اسلام پاکستان کی قومی ہم آہنگی کا باعث نہیں بن سکا۔ ایسی صورت میں پاکستان کو ایک نظریاتی ریاست کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟'' میں کہتا ہوں: ''پاکستان دو قومی نظریہ کی بنیاد پر نظریاتی ریاست ہے۔ برصغیر میں دو تہذیبیں متصادم تھیں۔ ہندو اور مسلمان باہم مل کر اقتدار میں شرکت کا کوئی فارمولا طے نہ کر سکے۔ اس لیے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ مسلم قوم کے باہمی اشتراک کو وجود میں لانے کی خاطر اسلام سے ثقافت یا کلچر کی صورت میں ملت سازی کا کام لیا گیا۔ ہر وہ شخص مسلم قوم کا فرد قرار پایا جس کی' توحید و رسالت پر ایمان کے ساتھ' مسلم تمدن سے وابستگی تھی۔ تمدن کی بجائے اگر خالصتاً مذہب مسلم قومیت کی بنیاد ہوتی تو ابتدا ہی سے واضح کر دیا جاتا کہ

ہماری قومی شناخت کی اساس سنی، شیعہ، دیوبندی یا بریلوی اسلام ہے اور ہم اُسی مخصوص اسلام کے نفاذ کے لیے علیحدہ ریاست کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ سو پاکستان کی نظریاتی اساس دراصل مسلم ثقافت کا ہندو ثقافت سے امتیاز ہے۔ اسی سبب برصغیر کے بیشتر علماء تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس تحریک کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں"۔ پوچھا جاتا ہے: "آپ اپنے سے زیادہ تعداد میں مسلمان بھارت میں چھوڑ آئے۔ یہ کس قسم کے حقِ خودارادیت کی تحصیل ہے؟" میرا جواب ہے: "حقِ خودارادیت کے مطالبہ کا انحصار عددی اکثریت پر ہوتا ہے۔ اقلیتوں کی صورت میں تو مسلمان بھارت کے علاوہ کئی اور ملکوں میں بھی موجود ہیں۔" سوال ہوتا ہے: "کیا پاکستان کے مسائل کا حل سیکولرزم ہے؟"۔ "سیکولرزم تو بھارت میں بھی ناکام ہے۔ وہ پاکستان کے مسائل کیسے حل کر سکتا ہے۔" آواز آتی ہے: "کیا پاکستان نہیں بننا چاہیے تھا؟" "نہ بنتا تو اس خطے کی مسلم اکثریت کو ہندوؤں سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر طویل جدوجہد کرنی پڑتی۔" "کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟" "قوموں کی تقدیر میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ کسی ریاست کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اُس کے وسائل پر ہے یا قوم پر کہ وہ کس قسم کی قیادت سامنے لاتی ہے۔ ہر قوم کو ویسے ہی لیڈر ملتے ہیں جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ عظیم لیڈر آرڈر دے کر نہیں بنوائے جا سکتے۔ وہ خدا کی طرف سے عطیہ ہوتے ہیں اور اتفاقاً یا حادثاتی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔" پوچھا جاتا ہے: "پاکستان میں اب تک اسلام صحیح معنوں میں قومی اتحاد کا باعث نہیں بن سکا۔ سیکولرزم بھارت میں ناکام ہے۔ اس پس منظر میں جنوبی ایشیا کا جغرافیائی نقشہ کیا ہونے کی توقع ہے؟" "جنوبی ایشیا کے نئے نقشے کی لکیریں ابھی کھنچی نہیں بلکہ ۱۹۴۷ء سے کھنچ رہی ہیں۔ خدا کے علم میں وہ تمام تقدیرات تو ہیں جن کا یہ خطہ متحمل ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی خاص مرحلہ پر اُن میں سے کونسی تقدیر اس خطہ کے لیے منتخب کی جائے گی، اس کا حتمی فیصلہ کرنا خدا کی مشیت میں نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی اقوام اور اُن کے قائدین کی ذمہ داری ہے کیونکہ اُنہیں انفرادی اور اجتماعی طور پر آزادیٔ انتخاب کے اختیار کے ساتھ عزم یا قوتِ ارادہ سے بھی نوازا گیا ہے۔"

"میں عوام کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں
عوام کے حقیقی سربراہ کی
عوام کے اصلی معبود کی
اُس وسوسہ انداز کے شر سے
اُس خناس سے (جو خدا کا نام سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)
جو عوام کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے
خواہ وہ جنات سے ہو یا انسانوں میں سے"

(سورۃ الناس)